کلیات رشید احمد صدیقی

(جلد ششم)

انشائیے (دوم)

ترتیب وتدوین

ابوالکلام قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

کلیات رشید احمد صدیقی

(جلد پنجم)

انشائیے (اول)

ترتیب و تدوین

ابوالکلام قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

کلیات رشید احمد صدیقی

(جلد پنجم)

انشائیے (اول)

ترتیب و تدوین

ابوالکلام قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

پہلی اشاعت	:	2012
تعداد	:	550
قیمت	:	-/105 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1591

Kulliyat-e-Rasheed Ahmed Siddiqui (Inshaiye-1) Vol.-V
Edited & Compiled by:
Abul Kalam Qasmi

ISBN :978-81-7587-774-0

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی110025، فون نمبر: 49539000، فیکس:49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر:26109746
فیکس:26108159 ای۔میل:ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، C-7/5 لارنس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی-110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

کلاسیکی ادب کی بازیافت کا سلسلہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں جاری ہے۔ مگر بیشتر زبانوں میں اس وقت بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب متعدد ادب پارے دست برد زمانہ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس دشواری کا ایک حل یہ ہے کہ ان اہل قلم کے شہ پاروں کو محفوظ کر لیا جائے جو زیادہ عرصہ نہ گزرنے کے باوجود نئے کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور جن کے بارے میں اندازہ ہے کہ امتداد وقت کے ساتھ ان کے فن پاروں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس ضمن میں ایک بڑے منصوبے کی صورت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے سب سے پہلے پریم چند کے کلیات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ تقریباً ایک دہائی قبل اس کلیات کی تمام جلدیں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہو کر قبولیت عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔

کلیات پریم چند کے بعد یہ سلسلہ جاری ہے اور متعدد نئے کلاسیک سے متعلق جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اس ضمن میں ایک بڑا منصوبہ ''کلیات رشید احمد صدیقی'' کی اشاعت کا بھی ہے جس کی تدوین کی ذمہ داری پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے قبول کی ہے اور توقع ہے کہ بہت جلد اس کی تمام جلدیں شائع ہو کر منظر عام پر آ جائیں گی۔

رشید احمد صدیقی، بیسویں صدی کے نصف اول میں غیر معمولی طور پر فعال اور زرخیز ذہن کے مالک ادیب کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ ان کی تصنیف و تالیف کا عرصہ تقریباً ساٹھ برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے خاکے بھی لکھے، طنزیہ مضامین میں بھی لکھے اور انشائیے بھی لکھے۔ وہ تنقید نگاری میں بھی مصروف رہے اور تقریباً سو سے زیادہ اہم کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔ مگر صنفی اعتبار سے اس تنوع کے باوجود رشید احمد صدیقی کو نمایاں طور پر طنز و مزاح

اور انشائیہ کی اصناف کے بنیاد گذار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر اردو طنز و مزاح اور انشائیہ کی اصناف کو رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری نے ایسا استحکام نہ بخشا ہوتا تو بعد کے زمانے میں مشتاق احمد یوسفی، مختار مسعود، کرنل محمد خاں اور مجتبیٰ حسین جیسے طنز و مزاح کے نمائندہ ادیبوں کی تحریروں میں ایسی رنگا رنگی نہ پیدا ہوئی ہوتی۔ رشید احمد صدیقی کا ایک بڑا کارنامہ علی گڑھ اور دبستانِ علی گڑھ کو ایک روایت میں تبدیل کرنا بھی ہے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو جس طرح ایک تہذیب، ایک کلچر اور ایک شائستہ طرز زندگی کی علامت کی شکل میں پیش کیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علی گڑھ، عرصۂ دراز تک اپنے علمی اور تہذیبی کارناموں کے ساتھ رشید احمد صدیقی کی تحریروں کے حوالے سے بھی زندہ رہے گا۔

مجھے خوشی ہے کہ کلیات رشید احمد صدیقی کے پروجیکٹ میں ان کی کتابی شکل میں مطبوعہ تحریروں کے ساتھ رسائل کے صفحات میں منتشر تحریروں، ان کے خطوط اور غیر مطبوعہ تحریروں کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ کلیات محض رشید احمد صدیقی کی تحریروں کی دوبارہ اور یکجا اشاعت ہی نہیں، تحقیق و تلاش اور تدوین کا بھی عمدہ نمونہ بن کر قارئین کے سامنے آرہا ہے۔ قومی اردو کونسل کی کوشش رہتی ہے کہ اس طرح کے اپنے تمام منصوبوں میں اعلیٰ معیار برقرار رکھا جائے۔

قارئین سے گزارش ہے کہ اس کتاب میں اگر انھیں کوئی کوتاہی نظر آئے تو قومی اردو کونسل کو باخبر کریں تاکہ اس کوتاہی کا ازالہ اگلی اشاعت میں کرلیا جائے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
ڈائرکٹر

فہرست مضامین

●●●

دیباچہ

رشید احمد صدیقی کا شمار اردو کے صف اوّل کے انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔ چونکہ ان کے انشائیے کا بڑا حصہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور خاکوں تک بھی پھیلا ہوا ہے اس لیے ان کی تحریروں میں طنز کا عنصر بھی پوشیدہ ہوتا ہے، اس لیے ان کی حیثیت اردو کے لیے ایک مثالی طنز نگار کی بھی ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رشید صاحب کی انشائیہ نما تحریریں اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ لیکن اس سے اس پہلو کی نفی بالکل نہیں ہوتی کہ ان کی غیر مزاحیہ یا سنجیدہ تحریریں بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ تاہم کسی ادیب کے بنیادی اسلوب اور نمایاں رویے کی شہرت کو ادبی استناد سازی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اکثر ہم کسی ادیب کے ایک پہلو کو اتنا نمایاں کر دیتے ہیں کہ اس کے دوسرے امتیازات ثانوی سمجھے جانے لگتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رشید صاحب کی غیر مزاحیہ تحریریں چونکہ ابتدا میں کم شائع ہوئیں اس لیے اس نوع کی سنجیدہ اور بردبار تحریروں کی جانب اہل ادب کی بہت کم توجہ مرکوز رہی ہے۔

رشید احمد صدیقی کی سنجیدہ تحریروں میں یوں تو ان کے خطبات کو مرکزیت حاصل ہے، اس لیے کہ ان خطبات کے موضوعات متنوع ہیں اور ہمیں غور و فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔

خطبات کے علاوہ رشید احمد صدیقی نے تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں، اپنی آپ بیتی بھی لکھی ہے اور بعض اہم شخصیات اور معاصرین پر اعلیٰ درجے کے خاکے بھی لکھے ہیں۔ لیکن

ادبی اور تنقیدی اعتبار سے یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ تحقیق وتنقید کے علاوہ ان کے اظہار کے تمام اسالیب کو انشائیہ نگاری کے بڑے عنوان سے معنون کیا جاسکتا ہے۔ غیر افسانوی ادب میں یوں بھی انشائیہ نگار کو سب سے زیادہ ادبی وسائل کے استعمال کرنے کا موقع ملتا ہے۔ خطوط نگاری، سوانح نگاری، سفر نامہ اور ان نوع کی اصناف میں ادیب کو تخلیقی اور تخیلی آزادی نصیب تو ہوتی ہے مگر برائے نام ہی ہوتی ہے۔ جب کہ انشائیہ کے دائرے میں آنے والے طنزیہ مضامین ہوں، ظریفانہ تحریر ہوں یا مزاحیہ مضامین یا پھر خاکے اور شخصیتوں کی نئی تشکیل، ہر صنف اور ہر اسلوب میں رشید احمد صدیقی جیسا ادیب اپنی ادبیت اور شعریت کے عناصر کو کسی نہ کسی روپ میں ضرور استعمال کرتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے بہ ظاہر غیر معمولی اصناف نہ ہوتے ہوئے بھی ان اصناف میں دنیا کے بارے میں سنجیدہ ردعمل، روایت کی تشریح نو، شعری نمونوں کی تخلیقی، پیروڈی اور دانش وری کی روایت میں شامل تلمیحات اور لوک کہاوتوں کو رشید احمد صدیقی نے نہایت فن کارانہ اور دانش ورانہ سطح پر استعمال کیا ہے اور اس طرح انشائیہ کی صنف کو مختلف اصناف کا جوہر بنادیا ہے اور اس صنف میں اپنے اظہار کو دوام عطا کردیا ہے۔

اسی لیے عرض کیا جاسکتا ہے کہ رشید احمد صدیقی کو پڑھ کر ہمیں اس بات کا قائل ہو جانا پڑتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پائے کے مزاح نگار ہونے کے علاوہ ایک دیدہ ور مفکر، سنجیدہ و بے باک تجزیہ نگار نیز اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنے ادارے (علی گڑھ) کے سچے بہی خواہ اور قوم وملت کے حقیقی غم خوار بھی ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی ہر تحریر میں ان کے برسوں کا تجربہ اور ان کی گہری فکر جھلکتی ہے۔ ان کو قومی، لسانی اور ملی مسائل سے کتنی گہری وابستگی تھی اور انھوں نے عرصے تک ان کے مسائل پر کس بصیرت افروز انداز میں غور وفکر کیا تھا۔ ان تمام باتوں کی جھلک ان کے انشائیوں تک میں بھی خطبات کی طرح ہی صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان کا عمیق مطالعہ رشید صاحب کے ادبی قدر کے ساتھ دانش ورانہ قدر ومنزلت میں بھی مزید اضافہ کردیتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے انشائیوں کا یہ تنوع اور رنگارنگی بلاشبہ اردو کے غیر افسانوی ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے جس کو مربوط انداز اور جدید طریق کار کے ساتھ پہلی بار پیش کیا جارہا ہے۔ رشید صاحب کی ذہنی افتاد، علمی تبحر اور دانش ورانہ فہم وفراست کو سمجھنے کے لیے ان انشائیوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مرتب

وبا میں تفنن

آپ کی اسی دلّی کا قصہ ہے ایک جنازہ جارہا تھا۔ مسجد کے ایک بے چارے طالب علم نے پوچھا کہ:

''یہ شخص کس مرض میں فوت ہوا؟''

کسی نے جواب دیا ''تخمہ میں''

طالب علم نے دریافت کیا ''تخمہ کسے کہتے ہیں؟''

بتایا گیا:

''جب اتنا زیادہ کھا جائیں کہ ہاضمہ جواب دے دے اس وقت تخمہ ہو جاتا ہے۔''

طالب علم نے ایک آہ سرد کھینچی اور کہا ''ہائے! یہ مرضِ مبارک ہمیں نہیں ہوتا۔''

یہ کچھ تخمہ ہی پر منحصر نہیں ہے، طب میں اکثر امراض ایسے ملتے ہیں جن کا علاج یا جن کے لوازم کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ ہمارا آپ کا جی بھی مریض بننے کو چاہنے لگے۔ میں ان امراض کا نام نہ لوں گا اس لیے کہ باوجود اس کے کہ یہ متعدی نہیں ہوتے، جائزے میں اکثر مجہول کو متحرک یا متعدی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے جن سے اطبا اور لیڈر واقف ہیں اور میں اطبا اور لیڈروں کے راز ریڈیو پر فاش کرنا نہیں چاہتا۔ پھر کچھ یہ بھی ہے کہ یہ امراض ایسے نہیں جو احمق کی شخصیت کی مانند افواہ سے زیادہ پھیلتے، پنپتے ہیں اس لیے احتیاط لازم آتی ہے۔

وبا کیا ہے؟ اس کا جواب کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے یعنی ایسے امراض جو اُڑ کر لگتے ہیں اور بیک وقت بہت سے لوگ ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیڈری بھی کچھ اسی قسم کی چیز ہے فرق صرف یہ ہے کہ لیڈر خارج میں بھی پایا جاتا ہے اور وبا آنکھ سے اوجھل ہوتی ہے۔ وبا کے ٹیکے نکل آئے ہیں لیڈری اکثر داغنے اور عضو بریدگی سے قابو میں آتی ہے۔ میرے نزدیک جنگ بھی ایک قسم کی وبا ہی ہوتی ہے۔ اُڑ کر لگنے میں تو اس کے شک ہی نہیں اور جتنے لوگ اس کا شکار ہوتے ہیں وہ بھی ظاہر ہے۔ اردو زبان میں اُڑ کر لگنے کے معنی ہیں غیر متوقع خوش نصیبی کے، لیکن یہ محاورہ اُس وقت کا ہے جب غالباً نہ امراض کا متعدی ہونا دریافت ہوا تھا اور نہ ہوائی جہاز کا انکشاف۔ اب اُڑ کے لگنے کے معنی جو کچھ ہوتے ہیں وہ ہمارے آپ کے سامنے ہے جنگ کے بعد اکثر دنیا کے کسی نہ کسی حصہ پر وبا بھی نازل ہوتی ہے۔ چنانچہ جنگ پر تقریر کرنے کے بعد وبا مجھ پر مسلّط کی گئی ہے اور میں آپ پر۔ جنگ والی تقریر میں بہت سی باتیں کہنے سے رہ گئیں اب جب کہ وبا سے سابقہ ہے وہ ایک ایک کر کے یاد آتی ہیں، مصیبت میں یہی ہوتا ہے۔ کیا معلوم وبا کے کون کون سے پہلو آئندہ تقریر میں اُجاگر ہوں۔ وبا یا کسی بڑے آدمی کی آمد ہوتی ہے تو اس کے سائے پہلے نمودار ہوتے ہیں۔ میں جہاں کہیں بڑے پیانے پر صفائی ہوتے دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں دو خیال فوراً پیدا ہوتے ہیں یعنی وبا پھیلنے والی شے یا کوئی بڑا آدمی آنے والا ہوتا ہے۔ ان دو اندیشوں میں سے ایک ضرور صحیح ثابت ہوتا ہے۔ میں نے نہیں تو آپ نے یقیناً ایسے آدمی بھی ضرور دیکھے ہوں گے جو وبا بھی ہوتے ہیں اور بڑے بھی، ظاہر ہے یہ بزرگ کہیں نازل ہوتے ہوں گے تو لوگوں پر کیا کچھ نہ گزرتی ہوگی البتہ یہ یقینی ہے کہ ایسے آدمی وبا میں نہیں مرتے اس لیے کہ وبا خود وبا کا توڑ ہے۔

میں کسی وبائی مرض میں مبتلا نہیں ہوا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ آپ کبھی مبتلا ہوں البتہ وبائیں ہر طرح کی دیکھی ہیں۔ طالب علمی کا زمانہ 19-1918 کا انفلوائنزا پھیلا۔ اس زمانے میں وبا پھیلنے کی بھی کیسی خوشی ہوتی تھی۔ کالج بند ہو جاتا تھا کلاس جانے اور ڈائننگ ہال کے کھانے سے نجات ملتی تھی گھر والے روپے زیادہ بھیجنے لگتے تھے۔ تھرڈ کلاس میں سفر کرنا اور فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں قیام کا موقع ملتا تھا۔

اُس زمانے میں ہمارے پرنسپل انگریز تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ وبا کسی طرح رفع دفع ہو جائے اور کالج بند نہ کرنا پڑے۔ ہمارے ساتھیوں میں ایک طالب علم بڑے ہی بے فکرے اور حرکات وسکنات کے اعتبار سے بڑے غیر ذمہ دار واقع ہوئے تھے۔ ایک دن کلاس میں بیٹھے بیٹھے معلوم نہیں کیا سوجھی، لگے زور زور سے کھانسنے چھینکنے اور دوسروں نے بھی اُن کو دیکھا دیکھی کھانسنا، چھینکنا شروع کر دیا۔ پرنسپل صاحب لیکچر دے رہے تھے۔ لیکچر ختم ہوا تو انھوں نے ہمارے دوست کو بلا کر بڑی ہمدردی ظاہر کی اور حکم دیا کہ فوراً داخلِ ہسپتال ہو جاؤ ورنہ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ دوسروں کو سخت تاکید کی کہ انھیں دیکھنے ہسپتال نہ جائیں۔ ہسپتال والوں کو ہدایت کر دی گئی کہ ان کو الگ کمرے میں رکھا جائے اور ہر طرح پرہیز کرایا جائے۔ بے چارے ہسپتال میں قید کر دیے گئے کئی دن تک وہاں کے آداب اور پرنسپل صاحب کی ہدایات جھیلتے رہے۔ بالآخر پرنسپل صاحب کو عرضی لکھی کہ اب چوں کہ میرا انتقال ہو چکا ہے اور حاضریاں روز بروز کم ہو رہی ہیں اس لیے مجھے اجازت دی جائے کہ میں اپنی تجہیز و تکفین میں شریک ہوؤں اور امتحانات کے لیے وصیت نامہ مرتب کراؤں۔ چنانچہ ان کی گلو خلاصی ہوئی۔

کالج ہی کے زمانے میں ایک بار ہیضہ پھیلا۔ حسبِ معمول اس کا انتظار تھا کہ کالج کب بند ہو اور ہم سب اپنے گھروں کا راستہ لیں۔ دوشنبہ کو عام کھانے کے ساتھ ایک پلیٹ بریانی کی ملا کرتی تھی۔ بہت سے لوگوں نے ہیضے کے اندیشے سے اُس زمانہ میں چاول کھانا بند کر دیا تھا ہمارے لیے یہ بڑا اچھا موقع تھا۔ ہم نے روٹی کھانی ترک کر دی۔ اپنے حصے کی روٹیاں دوسروں کی بریانی سے بدل لیا کرتے تھے اور اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ کون کون لوگ بریانی سے تائب ہو رہے ہیں۔ اسی اعتبار سے ہم روٹیوں کی شرح تبادلہ بھی گھٹایا بڑھایا کرتے تھے پہلے چار روٹیوں کے بدلے میں بریانی کی پلیٹ قبول کر لیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ دو روٹیوں کے بدلے میں بریانی کی پلیٹ وصول کرنی شروع کی چنانچہ ہیضے کے زمانے میں جتنی بریانی کھائی وہ آپ میں سے بہتوں کو تمام عمر جمعرات کو نصیب نہ ہوئی ہو گی۔

ایک دن ہمارے دوستوں ہی میں سے ایک صاحب مضمحل اور کسی قدر کھوئے کھوئے کالج کی طرف آرہے تھے پوچھنے پر بتایا کہ ہسپتال گئے تھے۔ بورڈنگ میں خبر مشہور ہو گئی کہ

فلاں صاحب کو ہیضہ ہو گیا۔ سب لوگ جمع ہو گئے۔ بریانی والوں میں سے ایک صاحب نے بڑھ کر پوچھا۔

''اور کیوں حضرت اپنے حصے کی بریانی کس کو سونپتے ہیں؟''

انھوں نے جواب دیا۔ ''بیماری میں جو میری خدمت زیادہ کرے گا۔''

ایک صاحب نے فوراً لوٹا بھر کر فرمایا۔ ''کالج چلیے اس خدمت کے لیے میں تیار ہوں۔''

دوسرے نے اپنے آپ کو پیش کرتے ہوئے جھک کر کہا۔ ''جناب پیدل کہاں تشریف لے جایئے گا، سواری حاضر ہے۔''

تیسرے نے کہا۔ ''بالکل ٹھیک۔ بہت ممکن ہے اس طور پر جائے ضرورت تک پہنچتے پہنچتے یہ وہ خدمت بھی انجام دے جائیں جس کی آپ کو ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔''

مریض نے خوش ہو کر کہا۔ ''بس آپ میری بریانی کے مستحق ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ میری طلبی پرنسپل آفس میں ہوئی تھی کہ حاضریاں کم ہیں اور بقایا بڑھ گیا ہے نام کیوں نہ خارج کر دیا جائے۔ نام خارج ہونے کی تلافی صرف یوں ہو سکتی تھی کہ ہسپتال میں داخل ہو جاؤں ورنہ طعام و قیام دونوں کا ٹھکانہ نہ رہے گا۔ ہسپتال والے کہتے ہیں کہ یہی نہیں کہ مجھے کوئی مرض نہیں بلکہ مستقبل قریب میں بھی اس کی کوئی توقع نہیں ہے اس لیے میں اب اس فکر میں ہوں کہ کوئی ترکیب ایسی بھی ہو سکتی ہے یا نہیں کہ روٹی دیے بغیر بریانی ملتی رہے۔''

وبا کا زمانہ بعض طبائع کے لیے عجیب و غریب ہوتا ہے۔ ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ جہاں وہ رہتے بستے ہیں وہیں اور انھیں پر سب سے پہلے وبا نازل ہوگی، اگر ایسا نہ ہو تو ان کو یہ اندیشہ رہتا ہے کہ وبا آخر آخر میں انھیں پر وار کر کے رفع دفع ہوگی۔ چنانچہ اس زمانے میں ان کی زندگی شروع سے آخر تک وبال بنی رہتی ہے۔ اگر کوئی ایسی بیماری ہوئی جو کھانے پینے کے ذریعے لاحق ہوتی ہے، مثلاً ہیضہ یا ٹائیفائڈ تو یہ مکھیوں سے ایسا سلوک کریں گے جیسے ہر مکھی انھی کی روح قبض کرنے کے لیے متعین کی گئی ہے۔ پھر کچھ یہ بھی دیکھا گیا ہے ایسے بزرگوں کے منہ پر اکثر مکھیاں بھنکتی بھی رہتی ہیں۔ کھانا کھائیں گے تو چولھے کے پاس بیٹھ کر براہِ راست دیگچی سے روٹی کو براہِ راست توے پر سے استقبال کر لیں گے۔ نوالہ منہ تک لے جائیں گے تو بائیں ہاتھ سے مکھیوں کے خلاف

بیلون براج بنا کر، بیوی بچے اِدھر اُدھر مکھیوں کے خلاف جہاد پر مستعد، پانی نل سے براہِ راست حلق میں پہنچائیں گے، اس اندیشے سے کہ کہیں درمیان میں وبائی لہریں پانی میں گھل مل نہ جائیں اور شکمی ریڈیو سٹ میں فضائی خلفشار نہ پیدا ہو جائے اس کے لیے اللہ کا شکر اس طور پر کریں گے گویا اس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ان کو آج کی روزی ہی نہیں دی بلکہ اپنی رحمتِ کاملہ سے ان کو کسی اور سے نہیں تو ہیضے سے ضرور محفوظ رکھے گا۔

بعض احباب وبا کے زمانے ہی کو وبا سے تعبیر کرتے ہیں ان میں بعض ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو وبا کے زمانے میں کہیں دعوت پر نہیں جاتے، ان کا خیال ہے کہ دوسرے صرف وبائی کیڑے مکوڑے پر بسر کرتے ہیں اور صفائی وصحت کا کوئی خیال نہیں رکھتے، وہاں جانا اپنے آپ کو موت کے منہ میں جھونک دینا ہے۔ ایک صاحب برسات کے موسم میں جالی کے پردہ کے اندر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے کے سارے برتن اور اوزار لال دوا میں (پوٹاشیم پرمنگنیٹ) غرقاب ہاتھ لائی سول سے دھوئیں گے اور لال دوا سے غرارہ کر کے پھر سے کانٹے کو اس طرح سے اُٹھائیں گے جس طرح سرجن آپریشن کے اوزار اُٹھاتا ہے۔ ایک دن پردہ کے اندر ایک بدقسمت مکھی آ گئی جب کہ دوسرے بدبخت اس کے اندر کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ مکھی مار قریب ہی رکھا ہوا تھا اُسے لے کر مکھی پر جھپٹے اور بغیر اس کا لحاظ رکھے ہوئے کہ مکھی بیوی کے کان پر بیٹھی ہوئی ہے یا مہمان کی ناک پر یا اپنے سر پر باری باری سب کی خبر لے ڈالی چنانچہ بیوی کان پکڑ کر بیٹھ گئیں، کبھی کبھی اُٹھ بھی جاتی تھیں۔ مہمان کی ناک کٹتے کٹتے بچی اور نادانستہ طور پر خودکشی کرتے کرتے رہ گئے۔ سنا ہے کہ برسات یا وبا کے موسم میں بیوی میکے چلی جاتی ہیں، مہمان آنا جانا بند کر دیتے ہیں اور خود مکھی مارا کرتے ہیں۔

غالباً سات آٹھ سال سے زیادہ نہیں ہوئے گردن توڑ بخار کی وبا پھیلی اس کی ہیبت ایسی طاری ہوئی کہ بعض اچھے بھلے لوگ بھی عجیب عجیب وہم میں مبتلا ہو گئے۔ ہر ایجاد کی مانند ہر وبا کا سہرا بھی بالعموم یورپ کے سر رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ محققین نے بڑی تلاش وتحقیقات کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ یہ بیماری یورپ سے آئی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو لوگ یورپ سے آتے ہیں وہ استعجاب یا لاعلمی کا اظہار اپنی گردن اور شانوں کو خاص طور پر جھٹک کر دیتے ہیں جس کو گردن پھٹکی

کہتے ہیں اور یہ یادگار ہے اُس زمانے کی جب یورپ میں گردن توڑ بخار پھیلا تھا۔ جو لوگ اس میں مبتلا ہو کر چل بسے ان سے تو کچھ پتہ نہ چل سکا البتہ جو لوگ مبتلا نہیں ہوئے یا جو تھوڑے بہت جاں بر ہوئے ان کے حالات کا مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں وہاں ایسی سراسیمگی پھیل گئی تھی کہ جو لوگ اس بیماری میں مبتلا نہ تھے وہ بھی احتیاطاً گردن اور شانے جھٹک کر اندازہ کرتے تھے کہ ان پر گردن توڑ مسلط ہے یا نہیں اور جو لوگ جاں بر ہو چکے تھے وہ بھی یہ معلوم کرنے کے لیے کہ مرض کا اثر باقی تو نہیں رہا ایسا ہی کرتے تھے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے انسان تعجب، نفرت، غصہ، رنج یا خوشی میں جتنی حرکت کرتا ہے اس کا پتہ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک اس زمانے کی یادگار ہے جب انسان اور جانور میں بہت ہی خفیف تفاوت ہوتا تھا اور یہ کچھ حرکات وسکنات ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ دور ترقی کے اکثر رسوم وعادات، ادارے، وحشت ہی کے انداز واطوار کی تہذیب یافتہ شکلیں ہیں۔

گردن توڑ بخار ہی کے زمانے میں ایک بار ایک دوست کے ہمراہ سفر کا اتفاق ہوا۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں اگر تھرڈ کلاس میں حسب معمول تعلیم بالغاں کی کلاس کھلی ہو اور ایرکنڈیشنگ کے تجربے ہو رہے ہوں اور دوسری طرف اپنی جیب کی آبادی فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی آبادی پر رشک کرتی ہو اس وقت سفر اور مسافر کی نوعیت کیا ہوگی۔ ہم دونوں کو ایک ہی کمپارٹمنٹ میں ایک دوسرے سے علاحدہ جگہ ملی۔ جگہ سے زیادہ مسافر، مسافروں سے زیادہ اسباب، ان دونوں سے زیادہ بدبو اور سب سے زیادہ شور۔ گاڑی چلی، مجھ پر تھوڑی سی غشی اور بہت کچھ غنودگی طاری ہوئی ہوش میں آیا تو دیکھتا ہوں کہ ہر شخص خاموش، لیکن کسی اندرونی خلفشار میں مبتلا ہے۔ اسٹیشن آیا تو لوگ بڑی بدحواسی کے ساتھ ڈبہ چھوڑنے لگے تھوڑے ہی عرصہ میں کمپارٹمنٹ خالی ہو گیا۔ البتہ میرے دوست ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے اپنے مخصوص انداز سے سگریٹ پی رہے تھے۔ میں نے اس بھگدڑ کا راز پوچھا تو بہت دیر تک چپ رہے پھر اُکتا کر بولے: ''کم بختوں نے سوال کر کر کے ناک میں دم کر دیا۔ میں برابر چپ رہا بالآخر ایک نے پوچھا۔

''بیمار ہو؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں''

دوسرا مردود بولا۔ ''کیا تکلیف ہے؟''

میں نے کہا: ''گردن توڑ، بس اتنی سی بات تھی۔''

سنا جاتا ہے ایک زمانہ میں امریکہ میں اپینڈ سائنس کو بڑا فروغ ہوا۔ جو مرض سمجھ میں نہ آتا اس پر اپینڈ سائنس کا اطلاق کر کے مریض کا آپریشن کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ بیش تر لوگ مرض کے نہیں بلکہ تشخیص وعلاج کے شکار ہو کر عدم آباد پہنچ گئے۔ اس آفت سے ہر شخص سراسیمہ تھا۔ ایک بار کوئی بزرگ کسی موٹر کی زد میں آ کر بے ہوش ہو گئے ان کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ معائنہ کے لیے لباس ہٹایا اُتارا گیا تو گلے میں ایک تختی آویزاں ملی جس پر لکھا تھا ''اپینڈ سائنس کا میرا چار مرتبہ آپریشن ہو چکا ہے، خدا کے لیے اب جاں بخشی ہو۔''

وباؤں میں سب سے زیادہ نقصان رساں، لیکن سب سے زیادہ دلچسپ ملیریا ہے۔ ایک دوست نے ملیریا کے مچھر سے بچنے کے لیے باریک جالی کے ٹاپے بنوا رکھے ہیں جن میں خود بھی بیٹھے رہتے ہیں اور ملاقاتیوں کو بھی بٹھاتے ہیں جہاں کوئی ملنے کے لیے آیا نوکر کو آواز دی گئی ''آپ کے لیے ٹاپا لاؤ۔'' ملازم ٹاپا لاتا اور ٹھیک جس وقت مہمان کورنش بجالاتا ہوتا ملازم ٹاپا ڈال دیتا جس کو جانا ہوتا وہ ٹاپے میں سے آواز دیتا۔ نوکر آ کر ٹاپا کھول دیتا یا اُٹھا لیتا کوئی بحث چھڑ جاتی اور صدر کو دخل دینا ہوتا تو وہ ''آرڈر، آرڈر'' کی بجائے ''رہو ٹاپے میں'' کہہ کر سب کو خاموش کر دیتے۔ معزز میزبان نے ایک بار ملیریا کے نقصانات اور ٹاپے کے فوائد پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''اگر جالی کے ٹاپے نمرود کے زمانے میں ہوتے تو اس کی خدائی کو زوال نہ ہوتا۔''

حاضرین میں سے ایک صاحب نے فرمایا، ''جی ہاں، مرزا نوشہ نے بھی ایک جگہ یہی بات کہی ہے۔

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا[1]

---

1 مرزا غالب کا پورا شعر اس طرح ہے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

دوسرے نے کہا: ''جناب والا یہ شعر نمرود پر نہیں فرعون پر کہا گیا ہے کیوں کہ ڈبونے کا واقعہ فرعون کے ساتھ پیش آیا تھا۔''

تیسرے صاحب نے فرمایا: ''یہ بھی تو ممکن ہے شاعر کے ذہن میں نمرود رہا ہو اور شعر میں فرعون بندھ گئے ہوں۔''

ایک نے جناب صدر کو مخاطب کر کے کہا: ''یہ شعر کی توہین ہے، جس کو ہم برداشت نہیں کر سکتے۔''

صدر نے حسب معمول فرمایا: ''رہ ٹاپے میں۔''

لیکن جب معترض خاموش نہ ہوا تو صدر نے نوکر کو حکم دیا:

''اُٹھا لوٹا پا اور نکال دو ان کو۔''

چنانچہ یہ پُرافشاں نکل کھڑے ہوئے۔

ملیریا کے سلسلہ میں مجھے اپنے بچپن کا زمانہ یاد ہے جب ہمارے مولوی صاحب اس میں مبتلا ہوئے تھے اللہ اللہ وہ جسم و جان، زمین و آسمان، وہ موٹی مٹر وہ دھیلے جیسے وہ ڈھول دھپّے اور وہ مولوی صاحب ملیریا میں مبتلا ہو کر حالتِ جنگ کا اعلان کر دیتے تھے یعنی ہمارا کھانا پینا، سونا، اوڑھنا بچھونا، اُچھلنا کودنا سب بحق مولوی صاحب ضبط، لیکن جیسا کہ مشہور ہے جنگ میں بہت سے انسانی جوہر چمک اُٹھتے ہیں مولوی صاحب کے ملیریا میں مبتلا ہونے پر ہمارے جوہر خاص طور پر جگمگا اُٹھتے تھے تو اسی بنا پر مولوی صاحب کی قمچیوں سے اکثر ہم خود بھی تلملا اُٹھتے تھے۔ مولوی صاحب بھی خدا جانے کس پیرایے کے سنگے تھے اور ان کا ملیریا بھی کیسا نامعقول تھا کہ ہماری خدمات کے باوجود وہ بہت جلد صحت یاب ہو جاتے تھے۔ ان کے لیے جو جوشاندہ تیار کیا جاتا تھا اس میں سے منقے، مصری اور آلو بخارے تو ہم حق الخدمت کے طور پر نکال لیتے تھے اور دوسری دواؤں کی بجائے خدا جانے کیا کیا خاک دھول گھوٹ چھان کر انھیں پلا دیتے تھے، لیکن ہوتا وہی تھا جس کا اندیشہ رہتا یعنی وہ توقع کے خلاف اچھے ہی ہو جاتے۔ مولوی صاحب پر لرزہ طاری ہوتا تھا تو ان کے اوپر کمبل، بستر، چٹائی، کاٹھ کباڑ ڈال دیا جاتا تھا اور ہم سب ان پر اس طور پر چڑھ بیٹھتے تھے جیسے کوئی فاتح فوج ناقابلِ تسخیر قلعہ پر قبضہ کرتی ہے اور اسی طرح کا ہم سلوک بھی کرتے

تھے، کچھ ان کو جمپنگ بورڈ کے طور پر استعمال بھی کرتے تھے۔ اگر ملیریا میں خوب کھل کر پسینہ آتا نیک فال نہ سمجھا جاتا تو آپ یقین مانیں ہم میں سے بعض کی دانستہ غلطی کو مولوی صاحب نادانستہ طور پر کبھی معاف نہ کرتے۔

لیکن یہ سب تو وبا کا لغوی مفہوم ہوا۔ ان وباؤں کا میں نے اب تک کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے جن سے آئے دن ہمارا آپ کا سابقہ رہتا ہے۔ مثلاً لیڈروں کی وبا، تحریکوں کی وبا، اسٹرائکوں کی وبا، تعلیم کی وبا، چندے کی وبا، بے روزگاری کی وبا، مشاعروں کی وبا، مہمانوں کی وبا، دعوتوں کی وبا، ماہرین کی وبا، شادیوں کی وبا، سینما کی وبا، عشق و عاشقی کی وبا، بھاگنے اور بھگا لے جانے کی وبا اور وباؤں کی وبا ''آل انڈیا ریڈیو'' کی وبا۔

جب وقت پورا ہو چکا ہو اور ان وباؤں کی اتلا ہو تو آپ ہی بتایئے میں کیا کر سکتا ہوں اور آپ میرا کیا کرلیں گے۔

1۔ نشریہ: 31/جنوری 1941

2۔ مطبوعہ: روزنامہ اجمل، بمبئی سنڈے ایڈیشن 9/فروری 1941

●●●

قسم قسم کے آنسو

بارش کا زمانہ ہے ''کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا!'' ارمان تھا برسات میں دہلی سے دعوت آئے گی، پکنک کی، پکوان کی، اوکھلے کی، قطب صاحب کی، مہرولی کی، کھائیں گے، کھلائیں گے، بھیگیں گے، بھاگیں گے، ہنسیں گے، ہنسائیں گے، جھومیں گے، جھولیں گے۔ دعوت آئی تو آنسوؤں کی!

لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ برسات میں یوں بھی لوگ بہکنے لگتے ہیں۔ اس پر میں ٹھہرا ساون کا اندھا، میرے بہکنے سے تو اور زیادہ لطف اُٹھانا چاہیے۔

برسات میں معلوم نہیں آپ کو کیا یاد آتا ہے۔ مجھے تو بے اختیار مگر مچھ یاد آتے ہیں۔ مگر مچھ کے ساتھ اُن کے آنسو، آنسوؤں کے ساتھ خواتین اور خواتین کے ساتھ اُن کے آنسو۔ اس کے بعد یادش بخیر۔ '' آنسو لانے والی گیس۔'' اس کے بعد تھوڑی دیر تک کچھ سجھائی نہیں دیتا صرف اپنی ثناء میں اقبال کا مصرعہ یاد آتا ہے:

آں سوئے افلاک ہے جس کی نظر!

ہمارے یہاں جہاں مذہب اور شاعری پیش پیش ہوں وہاں آنسوؤں کی کیا کمی۔ مذہب اور شاعری دونوں کا آنسوؤں سے بڑا گہرا اور وسیع تعلق ہے۔ کبھی مذہب آنسوؤں کا محرک ہوتا ہے مثلاً توبہ استغفار اور کبھی مذہب پر رونا آتا ہے مثلاً توبہ تلّی۔ شاعری پر رونا آئے تو بھی کوئی تعجب کی

بات نہیں۔ ہمارے ہاں (کذا) شاعری سے رونے رُلانے کا کام لیا گیا ہے، اور ہم نے اپنی شاعری پر بھی کافی آنسو بہائے ہیں۔ یہ تمام باتیں میں نے روئے بغیر کہی ہیں اور مجھے اُمید ہے ان باتوں پر آپ بھی رو نہ پڑیں گے۔

بعض کا خیال ہے کہ مذہب اور شاعری دونوں کی جڑ ایک ہے۔ دوسرے اس پر یہ حاشیہ لگاتے ہیں کہ دونوں جھگڑے کی جڑ ہیں۔ مجھے اس قسم کے جھگڑوں سے کوئی سروکار نہیں، ریڈیو کو بھی نہیں بقول شخصے ما بخیر شما سلامت!

آنسوؤں کی اقسام بتانے سے پہلے میں نے مذہب اور شاعری کا نام لیا تھا۔ نام تو میں نے لطفِ داستاں کے لیے لیا تھا، لیکن فوراً ہی مجھے محسوس ہوا کہ میرے لاشعور یا تحت شعور میں کچھ مشتبہ صلاحیتیں سوتے سوتے جاگ پڑی تھیں۔ لاشعور میں بالعموم ایسی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں، جو صلاحیتیں تو کچھ یوں ہی سی ہوتی ہیں مشتبہ کافی ہوتی ہیں۔ یہ کچھ میری رائے نہیں ہے، جرائم اور سراغ رسانی کے محکمے کی بھی یہی رائے ہے!

اب ذرا اس پر غور کر لیجیے کہ ہمارے یہاں مذاہب اور شاعری کی کتنی اقسام ہیں اس لیے کہ آنسوؤں کی تقسیم بھی اسی اعتبار سے کرنی پڑے گی، یعنی کتنی اور کیسے کیسے آنسو مذہب کا کارنامہ ہیں اور کتنے اور کیسے کیسے شاعری کی پیداوار۔ مذاہب کی تقسیم بڑا لمبا کام ہے خاصا خطرناک بھی بس یوں سمجھ لیجیے کہ ہم جتنے لوگ ہیں اُن سے زیادہ مذاہب ہیں، مذہب کو یہیں تک رہنے دیجیے۔ شاعری پر آجایئے ورنہ آنسوؤں کی اقسام بڑھ بھی جائیں گی اور پیچیدہ بھی ہو جائیں گی۔

ہمارے یہاں ایک شاعر گزرے ہیں جن کو بعض اصحاب یوں بھی کہتے ہیں کہ ایک شاعر ہوا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان میں پہلا فقرہ غلط تو ایسا نہیں، لیکن منحوس کافی ہے اس لیے کہ شاعر موجود ہیں۔ دوسرا یوں صحیح ہے کہ شاعر ہی جو ٹھیرا جو چاہے ہو جائے یہ باتیں کچھ زیادہ اہم نہیں ہیں۔ اہم تو وہ تقسیم ہے جو انھوں نے شاعری کی کی ہے (کذا) میری مراد رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی سے ہے۔ جنھوں نے بڑے آڑے وقت اردو غزل کی آبرو بچائی یہ اور بات ہے کہ اس سے دوسروں کی آبرو کا کیا حشر ہوگا۔

حسرت نے شاعری کی دوموٹی تقسیم کی ہے۔ایک اُستادانہ یا شاطرانہ،دوسری شاعرانہ۔ شاعر کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ عاشقانہ، عارفانہ اور فاسقانہ۔ شاطرانہ یا اُستادانہ کو بھی تین حصوں میں بانٹا ہے ناصحانہ، نافعانہ اور ایک اور جو مجھے اس وقت یاد نہیں رہی۔آپ کا جی چاہے تو اس شجرۂ نسب کو بالکل بھول جائیں اور غالبًا اب تک آپ اسے بھول بھی گئے ہوں گے صرف اُن کے تخلص یاد رکھیے۔اب شاعری کی جگہ پر آنسو رکھ دیجیے اور آنسوؤں کی اولاد دراولاد پر غور فرمائیے۔

تو آنسو دو طرح کے ہوتے ہیں۔ایک شاطرانہ دوسرے شاعرانہ۔اُستادانہ یا شاطرانہ آنسو بھی ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے کہ اُستادانہ شعر جو سوا شعر ہونے کے سب کچھ ہوتے ہیں، یا جو صرف شعر ہوتے ہیں اور کچھ نہیں۔سیاست اور مذہب کے استاد اسی قسم کے شعر یا آنسو بہاتے ہیں۔آپ نے ان استادوں کو اسٹیج پر آنسو بہاتے دیکھا ہوگا۔انھیں کے آنسوؤں سے وہ دریا نکلتے ہیں، جہاں مگرمچھ اشک بار ہوتے ہیں اور ہماری اَشک شوئی کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ استادانہ قسم کے اشعار تو بڑی دور سے اور بڑی محنت سے لائے جاتے ہیں استادانہ آنسو بڑی آسانی سے فراہم ہو جاتے ہیں۔ضرورت تو اُستاد کی ہوتی ہے آنسوؤں کی کیا کمی!

ان آنسوؤں کے کچھ طبعی خواص بھی ہیں۔ان کا مزاج بھی ہوتا ہے۔ جو درجوں کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے۔ یہ درجے قانونِ قدرت کے بلکہ رونے رُلانے والے کی مصلحت سے متعین ہوتے ہیں مثلاً جو آنسو فطری اعتبار سے پہلے درجے میں گرم اور دوسرے میں خشک ہوگا وہ ضرورت اور وقت کو دیکھ کر پہلے درجے میں خشک اور دوسرے میں سرد ہو سکتا ہے۔دراصل آنسوؤں کا مزاج اور خواص مخاطب کے مزاج و اعصاب کو مدنظر رکھ کر متعین کیا جاتا ہے مثلاً عورتوں اور شاعروں کا مجمع ہو تو استاد کا آنسو گرم تر ہوگا۔مزدوروں، کاری گروں اور طالب علموں کا ہو تو گرم خشک اور زمیں داروں اور سرمایہ داروں کا ہو، تو سرد تر، مولوی اور مہنتوں کا ہو تو سرد خشک اور ہمارا آپ کا ہو تو نورٌ علیٰ نور۔

بیسویں صدی میں سائنس کا غالبًا سب سے بڑا کارنامہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک قوت کو دوسری قوت میں منتقل کیا جا سکتا ہے، ہمارے یہاں کے شعرا اور رونے والوں نے اس قسم کے کسی (کذا) راز کا انکشاف کیا ہو یا نہیں اس سے کام برابر لیتے رہے۔انھوں نے رونے اور آنسو

بہانے کو جب چاہا شعروادب بنادیا اور جب چاہا رنگ ورقص، تصویر غرض کہ ہر انسانی سرگرمی میں منتقل کردیا (کذا)۔

ہمارے یہاں رونا ورزش بھی ہے اور تفریح بھی، اکثر صرف عادت! بعض مواقع ایسے بھی ہوتے ہیں، جہاں رونے یا آنسو بہانے کے یہ سارے نمونے اکٹھا مل جاتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ آنسو کسی شکل میں نہیں ہوتا بلکہ مرنے والے کا حلیہ بن جاتا ہے یہ درجہ بڑے ریاض کے بعد کسی کو نصیب ہوتا ہے اس کا ثواب بھی زیادہ ہے۔ ہمارے یہاں ایک دور ایسا بھی آیا ہے کہ جب اشک آفرینی کی حکومت نیشنلسٹ سوشلسٹ انداز کی تھی اور اشکوں کی پیداوار اور اُن کی نکاسی حکومت کے براہِ راست اختیار میں تھی، کارخانوں پر یہ پابندی تھی کہ وہ اپنی بیش تر پیداوار اور ان کی نکاسی حکومت کے حوالے کردیں یا پھر اپنے ساتھ آخرت میں لے جائیں۔ آخرت کے حصے میں کم ہی آتی ہے اس لیے کہ اس زمانے میں ہوائی جہاز نہیں بلکہ صرف روح پرواز کرتی تھی، اور اس کے نقل وحمل کے اصول وضوابط بڑے سخت تھے۔

استادانہ آنسو کے بعد شاعرانہ آنسو کا نمبر آتا ہے اس کی چند قسمیں ہیں۔ مثلاً عاشقانہ، عارفانہ اور فاسقانہ، فاسقانہ شاعری وہ ہے جہاں جذبات تو فطری ہوتے ہیں، لیکن فریقین کا رشتہ ذرا نازک اور ناشدنی ہوتا ہے مثلاً زید کی منکوحہ ہو یا بکر کی مرجوعہ یا بڈھو کی بھینس ہو اور بقائی کی بالٹی یا مونچھیں لیڈر کی اور کاسمیٹک قوم کی اس میں عشق تو اپنی جگہ پر رہتا ہے، فریقین میں سے ایک نہ ایک پٹ جاتا ہے اور اکثر آنسو نکلنے سے پہلے آنکھ نکل پڑتی ہے۔ عارفانہ شاعری کی مانند عارفانہ آنسو وہ ہوتا ہے جہاں شاعر خواب میں ڈرتا ہے اور احمق بیداری میں اس کی تعبیر تلاش کرتا ہے۔

یہ آنسو بڑی مشکل سے دیکھے اور پہچانے جاتے ہیں اکثر اس لیے کہ وہ اتنے آنسو نہیں ہوتے جتنے مژگان کے جھڑ جانے سے آنکھوں میں حاشیہ نشیں ہوجاتے ہیں اور اپنا اعلان کبھی خفقان، نیم شبی اور کبھی گریۂ سحری سے کرتے رہتے ہیں۔ آنسوؤں کی ایک قسم نہیں بلکہ ٹریجڈی یہ ہوتی ہے کہ محبوب کی طرف سے تو وہ اس دانے کا کام دیتا ہے جس سے عاشق کا مُرغِ دل شکار ہوتا ہے عاشق کے انہی دانہ ہائے اشک کو رقیب کا مرغا ایک ایک کرکے چن لیتا ہے اور بڑے اشتعال انگیز طریقے سے بانگ دیتا ہے۔

ہمارے یہاں شاعری میں عاشق کا وہی درجہ ہے جو اشتراکیت میں مفلسی یا جمہوریت میں مفسدی کا۔

شاعروں کی عاقبت اور عاشقوں کی دُرگت کا مطالعہ آپ نے اردو شاعری میں ضرور کیا ہوگا۔ اس میں آپ کو عاشقانہ آنسو کے نمونے کثرت سے ملیں گے۔ مثلاً عاشق کا وہ آنسو جو ٹھہر جائے تو انگارہ اور بہہ جائے تو دریا ہے۔ کبھی یہی آنسو نامۂ اعمال کی سیاہی دھوتے ہیں اور کبھی اس کی سیاہی میں اضافہ کردیتے ہیں۔ کبھی ان سے طوفان کا کام لے کر سارے جہاں کو ڈبو دیتے ہیں اور کبھی سارا طوفان کھنچ کر ایک آنسو بن جاتا ہے۔ کہیں کسی کے مژگانِ سرِ اشک آلود سے کتنوں کا لہو پانی ہوتا ہے اور کبھی تمام شب کی روداد غم مژگان پر ستارۂ سحری بن کر نمودار ہوتی ہے ایک آنسو وہ بھی ہوتے ہیں جن کی یوں تو کمی نہیں ہوتی، لیکن بہائے جانے رعایت طرف آستین سے! یا آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا۔ یا موتی سمجھ کر جن کو شانِ کریمی چن لیتی ہے۔

میرے ایک دوست ہیں معمّر، ایمان دار اور باخدا، مفلس، کثیر الاولاد اور مریض۔ ایک صاحب سے سخت بیزار رہتے ہیں ایک دفعہ مجھے بلا بھیجا جب کوئی مجھے بلا بھیجتا ہے تو میں سراسیمہ ہوجاتا ہوں، اس پر نہیں کہ جس نے بلا بھیجا ہے اس پر کیا افتاد پڑی ہے بلکہ اس پر کہ مجھ پر کیا افتاد پڑنے والی ہے۔ پھر اُن دوست کا بلاوا، طرح طرح کے دل میں دسوسے آئے ان میں بعض یہ تھے قرض مانگیں گے اور میری قرض لینے کی عادت کو برا بتائیں گے۔ نالائق اولاد کی سفارش کرائیں گے اور افسران کو نالائق متعصب اور بے ایمان قرار دیں گے، یا خدا کی کارسازی کا یقین دلائیں گے اور مقویات کا نسخہ مجھ سے دریافت کریں گے۔ میں پہنچا تو حریف کی شرارتوں کا قصہ چھیڑ دیا۔ میں نے کچھ عقل کی بات کہی کچھ ہمدردی کی جہاں تہاں خدا کی کارسازی کا اعتراف کیا اور اکا دُکا جعل سازی کے گر بتائے۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ دوست کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز اور آواز گلوگیر ہوگئی ہے میں نے یہ سمجھا کہ میں نے جو خدا کی کارسازی کا واسطہ دیا تھا یہ اس کا اثر ہے اور میرے دوست جن ذہنی بیماریوں میں مبتلا تھے اُن آنسوؤں سے ان کا غسلِ صحت ہوگیا۔ میں نے مسرّت و طمانیت کا اظہار کیا، اور خدا حافظ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا معاً ایک چیخ سنائی دی اور میرے گلے کی طرف ایک

ہاتھ جھپٹتا نظر آیا۔ میں دروازے کی طرف بھاگا اور سلامت نکل گیا۔ گھر آ کر سوچنے لگا کہ بھید کیا تھا اتنے میں دوست آ گئے اور قدموں پر گر پڑے۔ مجھے گڑگڑانا اور قدموں پر گرنا بہت ناگوار ہوتا ہے۔ بولے "بھائی معاف کر دو۔ مجھ پر غصے کا جنون سوار ہوتا ہے تو میری آنکھ آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہے، تم نے دھوکا کھایا۔" اب میں ان کے پاؤں پر گر پڑا!

کوئی تیس سال کا واقعہ ہے میں جمعہ کی نماز پڑھ کر قصبے کی مسجد سے نکل رہا تھا اُس زمانے میں قاعدہ یہ تھا کہ مسجد کے باہر بلاقید مذہب وملت بستی کے کچھ بچے، بوڑھے، عورتیں مسجد کے دروازے پر نمازیوں کی منتظر دورویہ صف باندھ کر کھڑی ہوتی تھیں کسی کے ہاتھ میں پانی کی کٹوری یا گلاس ہوتا کسی کی گود میں بیمار بچہ اور کوئی کسی بیمار کو سہارا دیے کھڑا رہتا نمازی برآمد ہوتے تو کچھ پڑھ کر ورنہ یوں ہی سب کو پھونکتے چلے جاتے، عقیدہ یہ تھا کہ نمازیوں کی پھونک میں شفا ہوتی ہے۔

میں مجمع کی دورویہ قطار سے پھونکتا ہوا گزرا تو کچھ فاصلے پر ایک جنازہ رکھا ہوا دکھائی دیا، صفوں کے کنارے پر چھ سات سال کی ایک بڑی ہی کمزور معصوم اور درماندہ لڑکی کھڑی تھی میں جنازہ کے لیے ٹھہر گیا۔ لڑکی دوڑ کر میرے پاس آ گئی مجھے کچھ خیال نہ ہوا بلکہ یہ سمجھا کہ جس طرح چھوٹے بچے جمعہ کے دن نماز کے بعد راستے میں مل جاتے ہیں تو تفریحاً سامنے آ جاتے ہیں کہ پھونک دو۔ اس طرح اس بچی نے بھی کیا ہوگا۔ میں نے اُسے خاموش دیکھ کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا "کیا بات ہے؟" لڑکی نے سر اُٹھایا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اُس نے میری اُنگلی پکڑ لی اور بڑے دل دوز انداز و لہجے سے کہا "میری اماں کو بھی پھونک دو" میں لرزنے لگا مجھے یہ معلوم ہوا جیسے میں اس بچی کے آنسو میں ڈوبنے لگا ہوں، جو ایک بحرِ زخّار کی مانند تمام کائنات پر محیط ہو گیا ہے۔ بچی کا وہ آنسو مجھے نہیں بھولتا۔ جیسے وہ میرا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ وہ آنسو میرے جسم و جان میں کچھ اس طرح پیوست ہو گیا ہے کہ میں اس سے چھٹکارا نہیں پاتا جنازے اور آنسوؤں کے اس دیس میں معلوم نہیں وہ درماندہ لڑکی کیا ہوئی، کہاں گئی۔ مہاتما جی جس دن شہادت سے سرفراز ہوئے وہ بچی اچانک یاد آئی کچھ ایسا یاد پڑتا ہے جیسے اُس بچی ہی نے شہادت پائی!

●●●

مصیبت میں دل لگی

فرض کر لیجیے ٹرین کا حادثہ ہو گیا۔ گو میں خود فرض کر لینے پر خاصی بدمزگی کے بعد ہی آمادہ کیا جا سکتا ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ میں حساب میں ہمیشہ کمزور رہا اور فرض کرنے سے میرا بدگمان ہونا یہیں سے شروع بھی ہوتا ہے۔ بھلا مانس سے بھلا مانس شخص بھی مجھے سوال سمجھانے کی کوشش کرتا تو پہلے اسی سے شروع کرتا کہ یہ فرض کرلو۔ اس کا جواب میں یہ دیتا کہ کیوں فرض کرلوں اور اس میں، میں ہمیشہ حق بہ جانب ہوتا۔ اس لیے کہ جو کچھ فرض کرلیا جاتا وہی آخر میں صحیح ثابت ہوتا۔ میں اس کو بڑی نازیبا بات سمجھتا ہوں کہ آپ سوال سمجھانے کے بجائے آنکھوں میں دھول جھونکیں۔ فرض کر لینا آنکھوں میں دھول ہی جھونکنا تو ہوا۔ اقلیدس میں اس سے بھی بڑھ کر اندھا دھند دیکھی وہاں فرض کر کے مسئلہ کو ثابت بھی کر دیتے ہیں اور فرض ہی کر کے اسے غلط ثابت کر دیتے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ آخر میں اس کا اعلان علاحدہ سے کرتے ہیں کہ یہی ثابت بھی کرنا تھا!

چنانچہ اوائل عمر میں مجھے جو سکھایا گیا وہ اس عمر میں، میں آپ پر آزمانا چاہتا ہوں یعنی فرض کر لیجیے ٹرین کا حادثہ ہو گیا۔ ظاہر ہے جب حادثہ ہو گیا تو پھر رہ کیا گیا تاوقتیکہ فرض کرنے میں خود آپ نے کوئی کسر نہ لگا رکھی ہو۔ اب جب کہ آپ فرض کرنے پر اُتر آئے ہیں تو ایک بار اور فرض کیجیے کہ ٹرین کے حادثہ کی خبر بغیر کسی تفصیل کے آئی اور بوڑھوں، مراقیوں اور بے فکروں کی بن آئی ان میں ہر ایک نے اپنی اپنی بساط کے مطابق حاشیہ آرائی شروع کر دی۔

ایک نے کہا: ''گاڑی کیوں نہ لڑے۔ نہ خالص گھی ملتا ہے نہ خالص آدمی۔ امتحان ہر جگہ ایمان کہیں نہیں نہ لڑکی کو شوہر ملتا ہے نہ لڑکے کو کمیشن۔''

دوسرے سور ما بولے: ''گاڑی لڑ گئی تو تعجب کیا۔ اونٹ، بیل، گھوڑے کو آدمی کے داموں بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ جب تک ان سواریوں پر لوگ آتے جاتے رہے کبھی کوئی آفت نازل نہ ہوئی۔ نہ گاڑی لیٹ ہوتی تھی نہ پھاٹک بند ملتا تھا۔ آپ نے کسی اونٹ گاڑی کو لیٹ ہوتے سنا؟''

ایک طرف سے آواز آئی: ''ہمیشہ کہتا رہا، بھائی کیا آفت آئی ہے، سنبھل کر چلو، یہ کیا بدحواسی ہے نہ دن کو دن سمجھو نہ رات کو رات۔ دو اُنگل پٹری کی بساط ہی کیا جس پر یہ آفت ٹوٹ رکھی ہے۔ ٹھیک کہا تھا مرحوم نے ۔

توسنِ عمرِ رواں آہستہ چل تھک کے مرجاتا ہے گھوڑا ڈاک کا

پھر زمانہ بھی تو نرالا آیا ہے۔ اگلے وقتوں میں یہ ہوتا تھا کہ کشتی پر سفر کر رہے ہیں مثلاً بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا۔ کہیں طوفان آ گیا یا کشتی بھنور میں پھنسی تو اس کا کھلا ہوا نسخہ تھا یعنی کوئی نہ کوئی منحوس آدمی کشتی پر سوار ہے۔ قرعہ ڈال لیا منحوس پکڑا گیا۔ پانی میں پھینک دیا گیا۔ کشتی نکل کھڑی ہوئی۔ آج کل اس کا کوئی لحاظ نہیں۔ معلوم نہیں کتنے تو بے ٹکٹ سفر کرتے ہیں اور اوّل درجہ کا سفر خرچ وصول کرتے ہیں۔ کچھ اس فکر میں بیٹھے رہتے ہیں کہ کب کوئی اپنی کتاب یا اخبار پر سے نگاہ ہٹائے اور یہ مانگ بیٹھیں۔ جب سے آزادی بڑھی اور حیا گھٹی کوئی منحوسوں کا خیال تک ذہن میں نہیں لاتا اور کوئی مانے یا نہ مانے میرا تو ایمان ہے کہ جب سے ہم نے منحوسوں کو نظر انداز کر دیا ہے ہم آئے دن مصیبتوں میں گرفتار رہنے لگے ہیں۔

ایک بزرگ نے یوں گل افشانی شروع کی: گاڑی لڑی تو کیا بُرا ہوا۔ آخر یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ٹکٹ کے منہ مانگے دام لیں گے، سفر آرام کا ہو تو ہوا کرے۔ خرید و فروخت کا مزا جاتا رہا۔ مرغی کی ایک ٹانگ اور ٹکٹ کے ایک دام۔ جس وزن، جس شکل، جس قماش کا آدمی ہو ٹکٹ کے دام یکساں۔ جب چیز زیادہ خریدی جاتی ہے تو محصول ڈاک یا کرایہ

ریل معاف کردیا جاتا ہے۔ یہاں اس کا کوئی سوال ہی نہیں۔ ٹکٹ کی تعداد سے ضرب دیتے جاتے ہیں اور حاصل ضرب ریلوے کا۔ دام ادا کردیجیے، گاڑی پر بیٹھ جایئے، نہ کوئی یہ پوچھنے والا کہ طہارت کے آداب سے بھی واقف ہو یا نہیں اور نہ اس کا کوئی لحاظ کہ کبھی آدمیوں میں بندھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے یا نہیں۔ جب تک آدمی نہیں دام دیکھ کر گاڑی میں جگہ ملتی رہے گی۔ گاڑی لڑتی رہے گی۔

ایک صاحب نے جمائی لے کر آنکھ کے کونے سے کیچڑ صاف کرتے اور پھر اُسے دیکھتے ہوئے بولے:

''میں کہوں تو بُرا بنوں وہ دن آ گیا ہے کہ سچّی بات منھ سے نکالنا دشوار ہے، غضب خدا کا، انجن اور گاڑی پر دنیا بھر کے نمبر اور نشان لگے ہوں گے نہ ہوگا تو نقشِ سلیمانی۔ قمر درعقرب پہچاننے کی تمیز نہیں ہنی مون پر مستعد۔ سیٹی بجائیں گے اشلوک یاد نہیں۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی جھونکے جاؤ کوئلہ اور دکھائے جاؤ لالٹین۔''

ایک بڑھیا پرچونئے کی دوکان پر سودا خرید رہی تھی۔ کہنے لگی:

''بدھو سیٹھ تم جانو میں لگی لپٹی نہیں رکھتی۔ سولہ آنے میں پونے سولہ آنے میری بات صحیح ہوگی۔ اُس گاڑی میں کوئی نہ کوئی برات ضرور ہوگی۔ سارے لڑائی جھگڑے کی جڑ بس یہی بیاہ برات ہے۔ تم ہی بتاؤ کوئی گاڑی آج تک ایسی لڑی ہے جس میں کوئی برات نہ سوار رہی ہو۔ نہ برادری کا کھانا دیں گے نہ پُرجوں کا (پُرکھوں) کا حق بانٹیں گے۔ نہ دلہن گھونگھٹ کاڑھیں گی نہ دولہا سلام کریں گے۔ نہ منگنی نہ چالا۔ شادی کی، لے بھاگے (ایک سادھو کو جاتے دیکھ کر ٹوک کر) کیوں بابا ٹھیک کہتی ہوں نا؟''

بابا بولے: ''مائی جی سب مایا ہے۔ کچھ سادھو کو دے کلّیان ہوگا۔''

بڑھیا بولی: ''بابا تمھارے دیدے پھوٹ کے مسجد ہو گئے ہیں۔ مائی جی ہوگی کوئی اور گاڑی لڑی کتنے لال ٹھنڈے ہو گئے۔ اس مسٹنڈے کو کسی نے نہ پوچھا۔ بڑا آیا ہے مائی جی کہنے والا۔''

ایک طرف دوچار بابوقسم کے لوگ جارہے تھے۔ پیچھے پیچھے ایک خلاصی، خلاصی کے سر پر آنے کی گٹھری۔ بابوؤں کے ہاتھ میں گوبھی کے پھول اور ہر ایک کی زبان پر گاڑی لڑنے کا واقعہ ایک نے کہا "پانسو اَپ تھا۔"

دوسرے نے کہا "نہیں، ساڑھے پانسو ڈاؤن تھا۔"

تیسرے نے کہا "اَپ ڈاؤن!"

چوتھا بولا "نہیں، ڈاؤن اَپ۔"

تھوڑی دیر تک سب کے سب اَپ اَپ ڈاؤن ڈاؤن کہتے رہے۔ خلاصی نے گٹھری کو سر پر تولتے ہوئے بیڑی نکالی تو سب کے سب ذرا دیر کے لیے رُک گئے بیڑی سلگائی گئی اور بحث شروع ہوئی۔

ایک نے کہا "مٹر السٹ ذرا شور ہوگا، بچہ کا مزاج ہی نہیں ملتا تھا۔ کھا گئے نہ تجھ 16 گریڈ میں تھا۔ پٹلو جی کو جگہ ملے گی۔"

دوسرے نے کہا "گھاس کھا گئے ہو، پٹلو نرا جونیر ہے اور وہ جو مسٹر بدھو نفر بیٹھے ہوئے ہیں ٹی پی ڈی۔ جس کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔"

ایک اور نے کہا "اور کیوں ٹی پی ڈی کے چچا WY2 جو بیٹھے ہیں وہ ٹمنی جنگ کو نہ آگے بڑھائیں گے!"

خلاصی نے پوچھا اور کیوں بابو جی، گارڈ بابو کون تھے؟"

سب مل کے بولے "ارے ہاں گارڈ! ٹھیک کہا، اگر کہیں 80 اَپ کے 79 اَپ نے دھکا دے دیا ہوتو مزا ہی آجائے۔ بھاجی بابو کا تو سوا یا ہو گیا ہوگا۔ پھر تو بھائی تھو خیرے تمہارے پو بارہ ہیں۔"

تھو خیرے ایک دفعہ وجد ہی میں آگئے۔ گوبھی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ بولے "کتاب قسم، تیرے منہ میں گھی شکر، اور لا تو ایک بیڑی۔"

خلاصی نے آخری بیڑی ان کے سپرد کی۔ پیشانی سے پسینہ پونچھا اور بیڑی کا خول پھینک دیا!

کئی سال گزرے، جہاں میں رہتا ہوں وہاں قریب ہی ٹرین کا ایک بڑا حادثہ گزرا جس گاڑی پر آفت آئی اس پر ایک صاحب تشریف لانے والے تھے۔ جس گاڑی پر سوار ہونے والے تھے۔ وہاں پلیٹ فارم پر آمنے سامنے دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ انھوں نے اپنا سارا اسباب ایک گاڑی پر رکھا اور دل بہلانے کی خاطر ٹہلتے ہوئے دور نکل گئے۔ گاڑی نے سیٹی دی۔ بدحواسی میں پاس ہی والی گاڑی میں، جو چھوٹ رہی تھی بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ اصلی گاڑی جس میں اسباب رکھا ہوا تھا وہ اُن کے بغیر روانہ ہوئی اور حادثہ سے دوچار ہوئی منزلِ مقصود پر لوگ ان کے منتظر تھے۔ وہاں حادثہ کی خبر پہنچی اور کچھ عرصہ میں ڈبہ میں ان کا اسباب پہنچا تو کہرام مچ گیا۔ یوسف گم گشتہ کو ٹرین کے حادثہ کی خبر نہ ہوئی اس لیے گھومتے پھرتے تیسرے دن وطن پہنچے وہاں گھر پر ان کے سویم کا کھانا ہو رہا تھا جس میں انھیں بھی شریک ہونا پڑا۔

ایک صاحب ریل میں بے ٹکٹ سفر ہی اس لیے کرتے ہیں کہ ریل پر سفر کرنا جان جوکھوں کا کام ہے اس لیے کہ معلوم نہیں کب گاڑی لڑ جائے یا غسل خانے میں کوئی قتل کر دیا جائے، جو شخص اتنے بڑے خطرہ کا مقابلہ کرے اس کے لیے جائز ہے کہ وہ ریل کا کرایہ ادا نہ کرے پھر اس میں ایک لطف یہ بھی ہے کہ کہیں گاڑی لڑ جائے تو تاوان وصول کیجیے۔ پوچھا گیا، ''اور کیوں جناب، بے ٹکٹ سفر کرتے پکڑے جایئے تو کیا ہو؟''

بولے: ''یہ تو معمولی بات ہے۔ اوّل تو سب سے ہلکی سزا بے ٹکٹ سفر کرنے کی ہے۔ دوسرے یہ کہ سادھو یا لیڈر سمجھ کر لوگ عقیدۃً کچھ نہ کچھ کھلاتے ہیں اور معافی مانگتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ سفر میں انتقال کر جایئے تو تجہیز و تکفین مفت ہو جاتی ہے۔ تصویر چھپتی، شہرت خوب ہوتی ہے۔''

پوچھا گیا: ''لیکن ٹرین لڑ جائے تو؟''

فرمایا: ''یہ کوئی بات نہیں، تھوڑی سی احتیاط کر لینی چاہیے اس کے بعد کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ یعنی بیچ کے کسی ڈبہ میں بیٹھنا چاہیے ٹرین آگے سے لڑے یا گرے یا پیچھے سے بیچ والوں کو بس اتنا نقصان پہنچتا ہے کہ تاوان لینے کا حق ہو جاتا ہے۔ دعویٰ کرنا چاہیے کہ دماغی صدمہ پہنچا ہے۔ بہکی بہکی باتیں کیجیے، ثقیل غذائیں کھایئے اور کوئی شریف آدمی

ایک طرف دو چار بابو قسم کے لوگ جا رہے تھے۔ پیچھے پیچھے ایک خلاصی، خلاصی کے سر پر آنے کی گٹھری۔ بابوؤں کے ہاتھ میں گوبھی کے پھول اور ہر ایک کی زبان پر گاڑی لڑنے کا واقعہ ایک نے کہا "پانسو اَپ تھا۔"

دوسرے نے کہا "نہیں، ساڑھے پانسو ڈاؤن تھا۔"

تیسرے نے کہا "اَپ ڈاؤن!"

چوتھا بولا "نہیں، ڈاؤن اَپ۔"

تھوڑی دیر تک سب کے سب اَپ اَپ ڈاؤن ڈاؤن کہتے رہے۔ خلاصی نے گٹھری کو سر پر تولتے ہوئے بیڑی نکالی تو سب کے سب ذرا دیر کے لیے رُک گئے بیڑی سلگائی گئی اور بحث شروع ہوئی۔

ایک نے کہا "مڑ السٹ ذرا شور ہوگا، بچہ کا مزاج ہی نہیں ملتا تھا۔ کھا گئے نہ تھے 16 گریڈ میں تھا۔ پٹّو جی کو جگہ ملے گی۔"

دوسرے نے کہا "گھاس کھا گئے ہو، پٹّو نرا جونیر ہے اور وہ جو مسٹر بدھو نفر بیٹھے ہوئے ہیں ٹی پی ڈی۔ جس کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔"

ایک اور نے کہا "اور کیوں ٹی پی ڈی کے چچا WY2 جو بیٹھے ہیں وہ ٹمی جنگ کو نہ آگے بڑھائیں گے!"

خلاصی نے پوچھا اور کیوں بابو جی، گارڈ بابو کون تھے؟"

سب مل کے بولے "ارے ہاں گارڈ! ٹھیک کہا، اگر کہیں 80 اَپ کے 79 اَپ نے دھکا دے دیا ہو تو مزا ہی آ جائے۔ بھاجی بابو کا تو سواہا ہو گیا ہوگا۔ پھر تو بھائی تھو خیرے تمہارے پو بارہ ہیں۔"

تھو خیرے ایک دفعہ وجد ہی میں آ گئے۔ گوبھی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ بولے "کتاب قسم، تیرے منہ میں گھی شکر، اور لا تو ایک بیڑی۔"

خلاصی نے آخری بیڑی ان کے سپرد کی۔ پیشانی سے پسینہ پونچھا اور بیڑی کا خول پھینک دیا!

کئی سال گزرے، جہاں میں رہتا ہوں وہاں قریب ہی ٹرین کا ایک بڑا حادثہ گزرا جس گاڑی پر آفت آئی اس پر ایک صاحب تشریف لانے والے تھے۔ جس گاڑی پر سوار ہونے والے تھے۔ وہاں پلیٹ فارم پر آمنے سامنے دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ انھوں نے اپنا سارا اسباب ایک گاڑی پر رکھا اور دل بہلانے کی خاطر ٹہلتے ہوئے دور نکل گئے۔ گاڑی نے سیٹی دی۔ بدحواسی میں پاس ہی والی گاڑی میں، جو چھوٹ رہی تھی بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ اصلی گاڑی جس میں اسباب رکھا ہوا تھا وہ اُن کے بغیر روانہ ہوئی اور حادثہ سے دو چار ہوئی منزلِ مقصود پر لوگ ان کے منتظر تھے۔ وہاں حادثہ کی خبر پہنچی اور کچھ عرصہ میں ڈبہ میں ان کا اسباب پہنچا تو کہرام مچ گیا۔ یوسف گم گشتہ کو ٹرین کے حادثہ کی خبر نہ ہوئی اس لیے گھومتے پھرتے تیسرے دن وطن پہنچے وہاں گھر پر ان کے سویم کا کھانا ہو رہا تھا جس میں انھیں بھی شریک ہونا پڑا۔

ایک صاحب ریل میں بے ٹکٹ سفر ہی اس لیے کرتے ہیں کہ ریل پر سفر کرنا جان جوکھوں کا کام ہے اس لیے کہ معلوم نہیں کب گاڑی لڑ جائے یا غسل خانے میں کوئی قتل کر دیا جائے، جو شخص اتنے بڑے خطرہ کا مقابلہ کرے اس کے لیے جائز ہے کہ وہ ریل کا کرایہ ادا نہ کرے پھر اس میں ایک لطف یہ بھی ہے کہ کہیں گاڑی لڑ جائے تو تاوان وصول کیجیے۔ پوچھا گیا: ’’اور کیوں جناب، بے ٹکٹ سفر کرتے پکڑے جایئے تو کیا ہو؟‘‘

بولے: ’’یہ تو معمولی بات ہے۔ اوّل تو سب سے ہلکی سزا بے ٹکٹ سفر کرنے کی ہے۔ دوسرے یہ کہ سادھو یا لیڈر سمجھ کر لوگ عقیدۃً کچھ نہ کچھ کھلاتے ہیں اور معافی مانگتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ سفر میں انتقال کر جایئے تو تجہیز و تکفین مفت ہو جاتی ہے۔ تصویر چھپتی، شہرت خوب ہوتی ہے۔‘‘

پوچھا گیا: ’’لیکن ٹرین لڑ جائے تو؟‘‘

فرمایا: ’’یہ کوئی بات نہیں، تھوڑی سی احتیاط کر لینی چاہیے اس کے بعد کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ یعنی بیچ کے کسی ڈبہ میں بیٹھنا چاہیے ٹرین آگے سے لڑے یا گرے یا پیچھے سے بیچ والوں کو بس اتنا نقصان پہنچتا ہے کہ تاوان لینے کا حق ہو جاتا ہے۔ دعویٰ کرنا چاہیے کہ دماغی صدمہ پہنچا ہے۔ بہکی بہکی باتیں کیجیے، ثقیل غذائیں کھایئے اور کوئی شریف آدمی

آتا جاتا دیکھیے لیٹ جایئے اور اخبار کا نمائندہ مل جائے تو اسے در پر مدعو نہ کیجیے اور کسی سے ملنا ہی پڑے تو اس کا بشرہ اس طور پر دیکھئے جیسے آپ چشمِ تصور سے اپنا انجام اور اس کا نفع دیکھ رہے ہیں۔ دیکھتے ہی ہر شخص یوں اُٹھے گا کہ ذہن کی چولیں کھسکی ہوئی ہیں۔"

خاکسار کو بعض ایسے بزرگوں سے بھی نیاز حاصل ہے جو اس بات کا پتہ لگاتے رہتے ہیں کہ گاڑی کہاں لڑی۔ اس کے بعد یہ کوشش ہوتی ہے کہ یا تو خود اپنے آپ کو مسافروں میں شامل کر کے تاوان وصول کریں یا اس کا امکان نہ ہو تو شورش مچا کر کہیں نہ کہیں سے اپنا اُلو سیدھا کرلیں یعنی یا تو تحقیقاتی کمیٹی میں شامل ہو جائیں یا گواہی دینے والوں میں نام لکھالیں!

ٹرین کا کوئی زبردست حادثہ ہو یا کوئی اور حادثہ اس کے اسباب دریافت کرنے کے لیے تحقیقاتی کمیشن مقرر کیے جاتے ہیں یہ کمیشن بجائے خود بھی ایک حادثہ ہوتا ہے، لیکن سب سے دلچسپ باتیں وہ ہوتی ہیں جو اس تحقیقات کے سلسلہ میں پیش آتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ تحقیقات ہمیشہ ہِلوُن میں کی جاتی ہے اور رپورٹ پہاڑ پر لکھی جاتی ہے۔

اب میں آپ کے سامنے ایک فرضی رپورٹ کی تنقیحات یا نتائج پیش کرتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی گاڑی پٹری سے اُتر گئی۔ شدید نقصان جان و مال کا ہوا ہے۔ ہندوستان میں جتنی انجمنیں اور ادارے ہیں انھوں نے رزولیشن پاس کر دیے جس جس کو جتنی اور جس قسم کی شکایتیں یاد تھیں ان سب کا اعادہ کیا گیا۔ کچھ لوگ جائے وقوع پر پہنچنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ جن کے ساتھ زادِراہ کافی تھی وہ انٹرویو دیتے اور بیانات شائع کرتے منزلِ مقصود تک پہنچے۔ جن کے پاس اس کی کمی تھی انھوں نے جہاں رُکے وہیں سے ریلیف فنڈ کا کاروبار شروع کر دیا۔ کچھ دنوں بعد ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا جس کی رپورٹ کا خلاصہ آپ کے سامنے ہے۔ سوال یہ ہے کہ گاڑی گری کیوں؟ اس کے بہت سے جواب ہیں۔ ان میں سے کسی کے بارے میں یقین سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کلیۃً صحیح یا کلیۃً غلط ہے۔ صحیح صرف اتنا ہے کہ گاڑی گری۔ ممکن ہے انجن بہت زیادہ تھکا ہو اور غنودگی کے باعث ٹھوکر لی ہو یا وہ اپنی اوقات سے اس درجہ مایوس و متفکر ہو کہ اس نے خودکشی کر لی ہو۔ خودکشی کا امکان اس لیے ضعیف ہو جاتا ہے کہ آں جہانی ہونے سے پہلے بالعموم غم زدہ یا

مستقر نہیں دیکھا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض نئے اور نوجوان انجنوں کے آجانے سے متوفی کو ہمیشہ اس کا اندیشہ رہتا تھا اور کبھی کبھی یہ اندیشہ حق بہ جانب بھی ثابت ہوا کہ متوفی کے افرادِ خاندان نوواردوں سے زیادہ مانوس ہوتے جارہے تھے اور یہی حال نوواردوں کا تھا۔ دوسری طرف متوفی کے بارے میں یہ منصوبے ہو رہے تھے کہ ان کو صرف ہواخوری پر رکھ لیا جائے۔

دوسرے یہ کہتے تھے کہ یہ مسئلہ خودکشی کا نہیں ہے، شباب کی بے اعتدالی کا ہے، یہاں تحقیقات کی نوعیت بدل جاتی ہے یعنی جس انجن کے یہ کرتوت ہیں وہ کارآزمودہ یا خدارسیدہ نہ تھا بلکہ ایک نئے قسم کا انجن تھا۔ یہ جناتی قسم کے انجن تھے۔ بڑے طاقت ور منہ زور اور بدلگام۔ ان کو پہلے سے نکالا نہیں گیا تھا جیسا کہ گھوڑوں کو نکالتے ہیں۔ چنانچہ یہ کبھی کبھی اڑنے اور الف ہونے لگتے تھے۔ کسی نے یوں کچھ خیال نہیں کیا جوانی کا زور ہے، ہندوستان کی آب و ہوا ہے۔ رفتہ رفتہ سنجیدگی اور بالآخر سعادت مندی آجائے گی زمین نرم تھی اور خون گرم، قلابازی کھا گئے۔ متوفی کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ انجن بنائے تو گئے تھے معمولی ہی، لیکن جس کارخانے میں یہ بنے تھے وہاں ہوائی اور آبی تارپیڈو بنانے کا بھی شعبہ تھا۔ غلطی سے مختلف پُرزے کچھ اس انداز سے ان انجنوں میں فٹ ہوگئے کہ یہ انجن ایک تیسری چیز بن گئے، یعنی زمیں توڑ تارپیڈو، جیسے قطب شمالی کے لیے برف توڑ تارپیڈو بنائے گئے تھے۔

بعضوں کا خیال یہ تھا کہ زلزلہ کی وجہ سے زمین پولی ہوگئی تھی اس لیے بوجھ اور رفتار دونوں کی تاب نہ لاکر زمین دھنس گئی اور انجن گر گیا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ستاروں کا قران اور مسافروں کا ہجوم بھی اس کا باعث ہوسکتا ہے۔ فلکیات، طبیعات اور ریاضیات کے ماہرین بہ روایت حکیم آئن اسٹائن یہ بیان کرتے ہیں کہ جس فاصلہ پر اور جس تیزی سے یہ گاڑی جارہی تھی اس کا اقتضا یہ ہے کہ اس کی ہیئت ترکیبی مختلف نظر آنے لگے، بجائے خود کوئی فرق کہیں نہیں آیا ہے، گاڑی ہنوز چلی جارہی ہے یہ ہماری آنکھ کا فتور ہے کہ ہم اسے حادثہ سے دوچار پاتے ہیں۔ اس نظریہ سے بعض ایسے لوگوں میں سخت برہمی اور سراسیمگی پھیلی ہوئی ہے جو دعوے دائر کرچکے ہیں کہ اس حادثہ سے ان کو جسمانی اور ذہنی صدمہ پہنچا ہے جس کا علاج بوعلی سینا کے پاس بھی نہیں ہے، لیکن جس کی تلافی ریلوے کمپنی کو بہرحال کرنی پڑے گی۔

ایک خیال یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ ریل کی پٹریاں جس پلیٹ سے جڑی ہوئی تھیں ان میں سے بعض کے اسکر یو اور نٹ میں فلزاتی ہم آہنگی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا سبب یہ بتایا گیا کہ ان میں سے کوئی تو ایسی کان سے برآمد ہوئے تھے جو ایک ہزار فٹ گہری تھی اور کوئی ایسی کان سے جو صرف 1199 فٹ گہری تھی۔ ایک پر دھوپ اور بارش خطِ مستقیم میں پڑتی تھی اور دوسرے پر ترچھی ہو کر اس لیے جوڑوں کی گرفت میں اُستواری نہیں پیدا ہوئی تھی۔ بعضوں نے یہ بھی بیان کیا کہ اس دن انجن میں جو کوئلہ جھونکا گیا تھا وہ معدنی نقطۂ نظر سے نیم برشت تھا جس کی حدّت میں یکسانیت اور توازن نہیں ہوتا۔ یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ جس دن یہ حادثہ ہوا ہے اُس دن آفتاب کے دھبّے بعض طوفانی میلانات کی وجہ سے زیادہ دھندلے یا اندھادھند ہو گئے ہوں جس کی وجہ سے جائے وقوع کی Visibility ناقص ہو گئی ہو اور وہاں کی زمین کے ذرّات مقناطیسی دباؤ کے برہم ہو جانے سے ڈھیلے بھی ہو گئے ہوں۔ آس پاس کی نباتات کا روحانی خوردبینی معائنہ کیا گیا تو ان میں پژمردگی پائی گئی اس سے پتہ چلتا ہے کہ نباتات کو پیش آنے والے حادثہ کی خبر پہلے سے لگ گئی تھی البتہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ پژمردگی حادثہ سے پہلے واقع ہوئی یا بعد میں۔

اس سلسلہ میں جو تحقیقات کی گئی اس سے اسبابِ حادثہ کے بعض اور پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے، لیکن چوں کہ اربابِ کمیشن کے سامنے صحیح اور ضروری شمار و اعداد نہیں ہیں اس لیے قطعیت کے ساتھ کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی مثلاً اس گاڑی میں کتنے لوگ بے ٹکٹ سفر کر رہے تھے، ان میں سے کتنوں کو پکڑے جانے کا اندیشہ تھا اور کتنے لیڈری اور بے روزگاری کے معاوضہ میں بے ٹکٹ سفر کرنا آرٹ سمجھتے تھے۔ کتنے لوگ ایسے تھے جن کے پاس روپے تھے، لیکن ناشتہ اور کھانا وہی بڑے کا کرتے تھے اور کتنے ایسے تھے جو دوسروں کے ناشتہ کے بھروسہ پر گھر سے ننگے بھوکے نکل کھڑے ہوئے تھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب چوں کہ حادثہ کو گزرے ہوئے بہت دن ہوئے۔ رپورٹ کافی طویل ہو چکی اس لیے خرچہ فریقین ذمہ فریقین اس قصہ کو ختم کر دینا چاہیے!

مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

(نشریہ 28/فروری 1941)

●●●

میں محمد تغلق کے زمانے میں ہوتا تو کیا ہوتا؟

سوال یہ ہے کہ اگر میں محمد تغلق کے زمانے میں ہوتا تو کیا کرتا یا کیا ہوتا۔ قبل اس کے کہ میں یہ بتانے کی کوشش کروں، کیا کرتا میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں سب سے پہلے وہی کرتا جو آج کرتا یعنی یہ سوچتا کہ نہ کروں تو کیا ہوگا، اور جب پورے طور پر بات سمجھ میں آجاتی تو پھر وہی کرتا جو کبھی زبان سے نہ کہتا اور کہتا وہ جو کبھی نہ کرسکتا۔ سنتے ہیں اُس زمانہ اور اِس زمانہ میں بڑا فرق ہے۔ اُس زمانہ میں حکومت کا کہا نہ مانئے تو گردن ماردی جاتی تھی اب عقل ماری جاتی ہے۔ تہذیب اور بربریت کے زمانہ میں یہی امتیاز رکھا گیا ہے۔

مجھے آپ جیسے بعض بزرگوں نے محمد تغلق کے زمانے میں دلّی سے دولت آباد جانے میں بعض مجبوریوں کا اظہار کیا تھا مثلاً ایک لنگڑے نے عذرِ لنگ پیش کیا تو اُسے گھسیٹ کر دولت آباد پہنچایا گیا جہاں صرف اس کی ٹانگ پہنچی۔ اس سانحہ کے بعد فارسی محاوروں میں تبدیلی کی گئی۔ پہلے ''پا بہ دست وگرے دست بہ دست دگرے'' کا محاورہ تھا اس کے بعد صرف ''پا بہ دستِ دگرے'' کا استعمال بھی جائز سمجھا جانے لگا۔ ''پائے مرا لنگ نیست وملکِ خدا تنگ نیست'' میں بھی اصلاح کی گئی یعنی ''پائے مرا لنگ نیست'' کوئی معذوری نہیں رہ گئی چنانچہ محمد تغلق کے زمانے میں مفرد ٹانگوں کی ایسی بہتات ہوئی کہ لوگ ''مرغ کی ایک ٹانگ'' کا محاورہ بھی بھول گئے۔ پائے چوبیں کو سخت بے تمکین بھی ماننے لگے۔ اُس زمانہ میں رہنے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ گھٹنے کو کتنا ہی کیوں نہ

مار ہئے آنکھ پھوٹنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا، اور بعض خاص حالتوں میں کسی کی ٹانگوں میں سے نکل جانے کا نہ محاورہ باقی رہا اور نہ ایسا کرنے کی ضرورت اور دقت پر کوئی غور کرتا یا کرگزرنے میں تامّل کرتا۔

دلّی کی پوری آبادی کو دولت آباد یا دیو گیر منتقل کرنے سے محمد تغلق کا منشا کیا تھا اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ تاریخ کے طالب علم اور نفسیات کی معلّم، اور ہم میں آپ میں کون اس صفت سے خالی ہے، اس سے بخوبی واقف ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ جس کو ان امور سے واقفیت نہ ہو وہ اس سلسلہ میں بعض دلچسپ لطیفے گھڑ بھی سکتا ہے۔ پوری آبادی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا یہ واقعہ اُس زمانہ میں عجیب وغریب سمجھا جاتا تھا، لیکن آج کل اس کی ہر طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔ بعض مقامات پر تو ہر طرح کی مخالفتوں کے باوجود آبادی کی آبادی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دی گئی اور بعض مقامات ایسے ہیں جہاں ہر قسم کی مخالفت مول لینے کے لیے نقلِ مکان کی تحریک بروئے کار لائی جاتی ہے۔ بعض تحریکوں کی کامیابی کا مدار ہی مخالفت پر ہے۔ مثلاً جب میں آپ یا دونوں لنگڑے ہوں اور دولت آباد کا سفر درپیش ہو، لیکن میں اس بحث کو یہیں ختم کر دینا چاہتا ہوں، اس اندیشے سے کہ اس قسم کے موضوع پر بحث کرنے سے اکثر وہ لوگ فائدے میں رہتے ہیں جو کسی اور مشغلہ سے فائدہ اُٹھانے کے قابل نہیں ہوتے۔

اس سلسلہ میں ایک بات ذہن میں یہ آتی ہے کہ محمد تغلق کے زمانے میں ہوتا تو میرا ذہنی تجربہ یا توازن کیسا ہوتا؟ ظاہر ہے وہ کبھی نہ ہوتا جس کا غالباً غلط اندازہ آپ ریڈیو پر کرتے ہیں اور میں تنہائی میں کرتا ہوں، محمد تغلق کے زمانے میں ذہنی اعتبار سے زیادہ سے زیادہ میں محمد تغلق کی مانند ہوتا اور کم سے کم خود اپنی مانند۔ اس کے بعد اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ موجودہ سوجھ بوجھ کے ساتھ (سوجھ اپنی اور بوجھ آپ کی) محمد تغلق کے زمانہ کو منتقل کر دیا جاؤں تو میرے تاثرات کیا ہوں گے تو یہ کہوں گا کہ میرے تاثرات وہی ہوں گے جو آپ کے میدانِ حشر میں ہوں گے اور انجام وہ ہوتا جو ہندستانی غزل گویوں کا انگریزی منش ناقدوں کے ہاتھ ہو رہا[1] ہے یا اس لنگڑے کا ہوا

---

[1] اشارہ مرحوم کلیم الدین احمد کی طرف ہے جو غزل کو "نیم وحشی صنفِ سخن" کہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ملاحظہ فرمائیے "خطباتِ رشید احمد صدیقی"۔

جس کا تذکرہ کچھ دیر پہلے میں نے کیا ہے، لیکن میں کچھ ایسا کرتا ہوں کہ آپ کو میرے تاثرات سے اتنی دلچسپی نہیں ہے جتنا محمد تغلق کے تجربات سے تاثرات اور تجربات کے مجموعہ ہی کا نام تو پروگرام ہے اور ایک صاحب نے پروگرام کے معنی ریڈیو بتائے تھے!

تو اس وقت مسئلہ کی نوعیت یہ ہے کہ میں محمد تغلق کے زمانہ کو منتقل کر دیا جاؤں تو کیا ہو، اس کا سیدھا سادا جواب تو یہ ہے کہ میں آخر منتقل ہی کیوں ہونے لگا۔ اس زمانہ میں بہت سی ایسی ترکیبیں ہیں جن سے میں اپنی منتقلی کو مسترد کرا سکتا ہوں یا نامعلوم مدت تک معرضِ التوا میں رکھ سکتا ہوں۔ اُن میں سے بعض یہ ہیں۔ سب سے پہلے تو میں بھلے مانسوں کو دھمکی کے گم نام خطوط لکھوں گا اور آبرو باختوں کے ہاں روپے بھیجوں گا۔ اس کے علاوہ اخبارات میں مضامین لکھواؤں گا اور عبادت گاہوں میں دعا منگواؤں گا۔ کسی معقول اُمیدوار کے خلاف الیکشن میں کھڑا ہو جاؤں گا۔ آل انڈیا قسم کی کانفرنس منعقد کراؤں گا اور چھپ کر اس پر ڈھیلے پھینکوں گا۔ کمیٹیوں کا ممبر بننے کی کوشش کروں گا۔ ظاہر ہے جیل خانہ بھیج دیا جاؤں گا۔ اچھی کلاس متعین کرانے کی کوشش کروں گا۔ ڈاکٹروں کے سرٹیفکٹس حاصل کروں گا اس درمیان میں موقع مل جائے گا تو غائب ہو جاؤں گا۔

لیکن قوم و ملک یا پھر ریڈیو کی خاطر مجھے منتقل ہونا پڑا تو کچھ ضرب الامثال یا نعرے لگا کر ہمتِ مرداں مدد خدا، قطرہ قطرہ ہمہ شود دریا، ہم یا آپ زندہ باد، دین و وطن خطرہ میں ہے محمد تغلق کے زمانہ کو منتقل ہو جاؤں گا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تغلق کے زمانہ میں اس قسم کی نعرہ بازی خطرہ سے خالی نہیں اور موجودہ زندگی بغیر اس قسم کی ریاضتِ خلقی کے بے کیف ہے اس لیے چلتے چلاتے ہر قسم کے ایک آدھ الوداعی نعرے لگا لیے جائیں تو جی بھی ہلکا ہو جائے گا، آئندہ خطرہ کا سدِ باب ہو جائے اور بات بھی جہاں کی تہاں رہ جائے گی۔

لیکن جناب معاف فرمایئے گا اُس عہد میں پہنچ کر اس عہد کی بعض اچھی یا بُری عادتیں کچھ دنوں ترک نہ ہو سکیں تو آپ خواہ مخواہ مجھ سے بدظن بھی نہ ہوں۔ دلّی پہنچ کر سب سے پہلے تو اس کی فکر ہوگی کہ طعام و قیام کا بندوبست کہاں کیا جائے۔ ظاہر ہے کسی سرائے میں قیام ہوگا جس کی استقبالیہ کمیٹی کی صدر روپائیں بی بھٹیاری ہوں گی۔ ان کے مسلسل خطبۂ صدارت کا کوئی جزو جو کل پر

ہمیشہ بھاری ہوگا، سنوں گا۔ اُسی دن نقیب شاہی نے اس کا اعلان کیا ہوگا کہ دتّی کا ہر کس و ناکس دولت آباد کو منتقل ہو جائے۔

دتّی میں سوا بی بھٹیاری کے میرا اور کون مربی ہوگا اس لیے میں اپنے آپ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں گا۔ اُسی دن رات کے وقت جب کتے جوٹھے پر لڑتے اور بی بھٹیاری برتن مانج کر شوہر کو گالیاں اور مسافروں کو بہ اعتبار مراتب لوریاں دے چکیں گی، شاہی اعلان پر گفتگو شروع ہوگی۔ اس گفتگو کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں میں نے کہا'' کیوں نیک بخت اب کیا ہوگا؟''

بی بھٹیاری نے چمک کر درشت لہجہ میں کہا: ''میاں زبان کو لگام نہیں! نیک بخت تم نے کس کو کہا۔ نہ بوڑھی نہ نمازی، یہ سرائے ہے اس کے آداب نہ سیکھو گے تو بھیک مانگو گے۔''

میں نے کہا: معاف کرنا ایسے دیار اور ایسے زمانہ کا ہوں جب نیک بخت گھروں کی بجائے کتابوں میں ملتی تھیں میں نے کتابی بات سمجھ کر تم کو اس لفظ سے مخاطب کیا تھا۔ تم نے اس کو جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ رہے سرائے کے آداب، سو بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں اب سرائیں تو باقی نہیں رہیں البتہ آپ کے نام لیوا قومی اداروں میں مل جاتے ہیں۔ میں مسافر ہوں، دتّی اس لیے آیا تھا کہ روزی سے لگ جاؤں گا۔ یہاں معلوم ہوا کہ دتّی خود مسافر ہے۔ ہائے ٹھیک کہا ہے:

جو چیز نظر آئی تقدیر نظر آئی۔''

بھٹیاری بولی: میاں میری خطا معاف کرو۔ یہ دتّی ہے؟''

میں نے بات کاٹ کر کہا: ''جی ہاں، یہ دتّی ہے۔ یہی خبر مجھے ہر روز اپنے ہاں ریڈیو پر بھی ملتی تھی۔''

بھٹیاری نے کہا: ''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ البتہ اس کا افسوس ہے کہ سرائے کی بات سرائے سے باہر پہنچی یہ آثار اچھے نہیں۔ تم کو نہیں معلوم ساری دنیا سرائے ہو یا نہ ہو سرائے یقیناً ساری دنیا ہے۔ یہاں کی عبادت ہی اور ہے۔''

''لیکن بی بھٹیاری یہ تو دیکھو کہ میں عبادت کے لیے یہاں نہیں آیا ہوں مجھے تو روٹی چاہیے۔''

میں نے بات کاٹتے ہوئے۔

بی بھٹیاری نے چھالی کترتے ہوئے جواب دیا: ''عبادت پھر عبادت ہے۔ مدِ نظر چاہے روٹی ہو چاہے عاقبت۔''

چوں کہ بی بھٹیاری نے شام کو میری آٹے کی روٹی پکاتے ہوئے نہ میری بھوک کا خیال کیا تھا نہ اپنی عاقبت کا اس لیے میں نے کسی قدر بے اختیار ہو کر کہا'' بی بھٹیاری میں مسافر ہوں، دلّی بھی مسافر ہے، میں کیا کروں؟

''میرا حشر کیا ہوگا؟ اور میری بیوی، بچّوں کا کیا انجام ہوگا؟ شاہی اعلان واجب الاذعان ہے، پھر کیا ہو؟''

بھٹیاری نے کہا: ''میرے لیے تو دلّی کا کہیں چلا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس قسم کے تماشے کسی قدر مختصر پیمانہ پر میں ہر روز اسی سرائے میں دیکھتی ہوں اور اس سے نپٹتی رہتی ہوں۔ لوگ بوریا بستر، بیوی بچّے، مال دولت، رنج و راحت لے کر آتے ہیں اور جس سے جیسی بن پڑتی ہے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اصل چیز تو سرائے ہے۔ مسافر کی کوئی حیثیت نہیں وہ آباد رہے گی۔''

میں نے کہا: ''یہ کتابی باتیں بالکل ٹھیک ہیں، لیکن میرے لیے تو یہ آفت ہے کہ دولت آباد تک پہنچ کیسے پاؤں گا؟ کھانے پینے کا کیا انتظام ہوگا؟ گزر بسر کیسے ہوگی؟ کتابی باتوں سے پیٹ نہیں بھرتا۔''

بھٹیاری بولی: ''ٹھیک کہتے ہو، لیکن جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ تمہارا زندگی کا مشغلہ کیا ہے، میں کیسے بتا سکتی ہوں کہ تم کیا کرنا چاہتے۔''

میں نے کہا: ''میں ہر قسم کا کام کر سکتا ہوں، لیکن کروں گا ایک نہیں۔''

بھٹیاری بولی: مبارک ہو، پھر تم کو دہلی سے دولت آباد منتقل ہونے میں کوئی دقّت پیش نہ آئے گی تم یا تو شاعر ہو یا بھک منگے۔''

میں نے کہا: ''دونوں''

اس نے کہا: ''نورٌ علیٰ نور، لیکن آپ سرائے کو خیر باد کہہ دیجیے اور کرایہ رکھ جایئے۔''

میں نے کہا: "کرایہ ادا کر سکتا تو یہاں کیوں آتا۔ میں یہ کر سکتا ہوں کہ تمہاری شان میں ایک قصیدہ لکھوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے جذبات کی قدر کرو گی اور یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ میں جہاں سے آیا ہوں وہاں کی زندگی کے دروبست میں بھٹیاری کا دخل سب سے زیادہ ہے۔"

بھٹیاری بولی: "آخر شاعر اور بھک منگے ہی نہ ٹھہرے! بھٹیاری سے کون زمانہ اور سوسائٹی خالی ہے جو تم اپنے ملک و زمانہ کی تخصیص کر رہے ہو، بھٹیاری سے زیادہ انسانی میرت کا نباض کہیں نہ ملے گا۔ وہ مسافروں کو اُن کے حدود میں رکھنا خوب جانتی ہے۔"

بھٹیاری نے شاعر اور بھک منگا قرار دے کر مجھے اپنے آپ سے مطمئن کر دیا یعنی سرائے کے مطالبات کی طرف سے بے نیاز بنا دیا پھر نیند آنے میں کیا دیر لگتی تھی۔ میں سو رہا اور صبح سویرے بیدار ہوتے ہی دہلی کے گلی کوچوں میں پھرنے لگا۔ ہر طرف ہر شخص مضطرب اور بے چین تھا۔ کسی کی آمدنی قلیل تھی اور خاندان بڑا تھا۔ وہ اس فکر میں تھا کہ دہلی سے دور دولت آباد میں روزی کیسے ملے گی۔ دولت مندوں کو اپنی املاک و جائداد کی فکر تھی کہ ان کو چھوڑ جائیں گے تو نئے دیار میں کیا کریں گے۔ غرض امیر، فقیر، بوڑھے، جوان، مرد، عورت، بچے سبھی سراسیمگی کے عالم میں تھے۔ صرف دو جماعتیں ایسی تھیں جنھیں کوئی فکر نہ تھی ایک شاعر دوسرے بھک منگے۔ ان فنون میں مجھے کچھ کم درک نہ تھا، لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں کسی چیز سے واقفیت ہی اُس چیز کی وقعت کم کر دیتی ہے یا پھر بہت زیادہ کر دیتی ہے، میرے باب میں بس یہی خیال کر لیجیے کہ کچھ اسی قسم کے عالم میں تھا۔

میرے لیے سوال یہ تھا کہ دلی کی زبان اور ہے دولت آباد کی زبان اور۔ شاعری اور بھک منگائی آخر کس زبان میں کی جائے گی، لیکن پھر اطمینان ہو جاتا کہ شاعر اور فقیر دونوں اپنے حلیہ اور حالات سے ہر جگہ پہچانے جاتے ہیں۔ دولت آباد اور دہلی کی کوئی تخصیص نہیں بقول شخصے، سائل کی صورت سوال ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ فقیر صدا تو کچھ دے رہا ہو اور سمجھنے والے کچھ سمجھ رہے ہوں اس لیے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ اگر اپنی صداؤں میں جو دہلی کی ہوں گی ایسے الفاظ کا اضافہ

کریں جو دولت آباد میں بولے جاتے ہوں۔ رہا شاعر، وہ پھر شاعر ہے اُسے اپنے ہی دیار میں کون سمجھنے کی کوشش کرتا ہے یا اُسے پسند کرتا ہے جو پرائے ملک میں اسے دقّت کا سامنا ہو۔

یہ عجیب بات ہے کہ دلّی سے جو قافلہ نکلا وہ مال و متاع سے زیادہ ایسی چیزیں لے کر نکلا جو پرانی یادگاریں تھیں۔ خاص دلّی کی تھیں اور انفرادی پسند کی تھیں۔ کسی کی بغل میں کوئی قلمی کتابوں کا جزدان تو کسی کے ہاتھ میں توتے مینے کا پنجرا۔ کسی کے ساتھ دلّی کے مخصوص پکوان اور مٹھائیاں تھیں تو کوئی دلّی کے خوشی و غم کے گانے گا رہا تھا۔ ان میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو دلّی سے جدا ہو کر دلّی کو خیر باد کہہ رہا ہو۔ ہر شخص اپنے ہی مزاج و مذاق کی دلّی سے لدا پھندا ہوا تھا اور دہلی کی۔

وہی عظمت، وہی عبرت، وہی شانِ دلآویزی

لے کر نکلا تھا جو اقبال مرحوم کو" سوادِ رومۃ الکبریٰ" میں یاد آتی تھی۔

دولت آباد کو اس کا ہمیشہ فخر رہے گا کہ اس کو دلّی کا مثنیٰ بننے کے لیے منتخب کیا گیا۔ وہ مثنیٰ نہ بن سکا اس لیے کہ دلّی کا سواد اور قوام کہیں اور ظہور نہیں پا سکتا تھا۔ وہ عناصر، وہ فشار اور وہ فشردہ کہاں سے آتا جو دلّی میں معلوم نہیں کب سے اور کن اثرات و برکات کے تحت ترکیب پا چکا تھا۔ چنانچہ ہوا وہی جس کا اندیشہ تھا۔ دلّی اُجڑ گئی، لیکن دولت آباد بس نہ سکا۔ کتنے راستے ہی میں مر کھپ گئے جو پہنچے وہ بھی ناموافق ماحول اور مسموم آب و ہوا کا شکار ہو گئے اس میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ دولت آباد کی آب و ہوا دلّی سے بہتر ہی کیوں نہ ہوتی دلّی والے کو وہ کبھی راس نہ آتی۔ متمدن انسان طبعی ماحول میں تو صرف سانس لیتا ہے، زندہ وہ اپنے ہی ماحول میں رہتا ہے۔ یہی حال دلّی کا تھا وہ تو اُسی فضا میں زندہ رہ سکتی تھی جس کو خود اس نے بنایا، سنوارا یا سلجھایا تھا۔ دلّی صرف بادشاہوں کی دلّی نہ تھی وہ ایسے انسانوں کی دلّی تھی جس میں بادشاہ بھی پیدا ہوتے، پرورش پاتے اور مٹ جاتے اور فقرا اور اولیا بھی پیدا ہوتے، پرورش پاتے اور زندہ جاوید ہو جاتے، محمد تغلق دولت آباد کو اپنی راجدھانی بنا سکتا تھا دلّی بنانا اس کا کام نہ تھا۔

(نشریہ 11 / اپریل 1941)

●●●

ضرورت ہے

صاحبو، تکلف اور تمہید دونوں برطرف، معاملہ نازک ہے، اس لیے میں سب سے پہلے اور سب سے آخری بات یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مجھے اشتہاری بیوی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے البتہ اُن لوگوں سے ہمدردی ہے جن کا سابقہ ایسی بیویوں سے ہے۔ سبب ظاہر ہے، یعنی میں ایک برسرروزگار بابو ہوں۔ اشتہاری بیوی کا بابو سے کوئی جوڑ نہیں۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ بابو برسرِ روزگار ہو۔ اگر بیوی خود برسرِ روزگار ہو تو مجھے کچھ بہت زیادہ عذر بھی نہ ہوگا اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا بھی ہر لحظہ امکان رہے گا کہ معلوم نہیں کب برسرِ روزگار بیوی برسرِ پیکار بیوی بن جائے، جو شہ کار بیوی بننے کا آخری زینہ ہے!

مجھے تسلیم ہے کہ میری یہ بات کلیۃً غیر بابووانہ ہے۔ اس لیے کہ وہ بابو ہی نہیں جو آخری بات سب سے پہلے کہہ دے اور جو کچھ کہے وہ دوسروں کی سمجھ میں بھی آ جائے، لیکن چوں کہ معاملہ روزگار کا ہے اور ضمناً بیوی کا یا اصلاً بیوی اور ضمناً روزگار کا، اس لیے نہ تو کسی کی دل آزاری کا خیال کرنا چاہیے اور نہ آرٹ واخلاق کو خاطر میں لانا چاہیے۔ فن کے نقطۂ نگاہ سے اسی کو Realism بھی کہتے ہیں۔ البتہ میں احتیاطاً یہ عرض کردینا چاہتا ہوں کہ چوں کہ بیوی کی تلاش مدِ نظر ہے اور سننے والے نظروں سے غائب ہیں اس لیے ممکن ہے آرٹ واخلاق کی آئندہ کہیں چل کر آڑ پکڑنی پڑے یا ان کے گلے پر (سننے والوں پر نہیں، آرٹ واخلاق پر) چھری پھیرنی ناگزیر ہو جائے اس لیے آرٹ واخلاق کو قطعاً نظر انداز بھی نہیں کرنا چاہتا۔

تو اب مسئلہ زیر بحث کی نوعیت یہ ہے کہ اس کے تین مستقل ٹکڑے ہیں۔ یعنی میرا بابو ہونا، بیوی کا متلاشی ہونا اور برسرِ روزگار ہونا۔ میں بابو ہونا گوارا کروں گا یا نہیں اس کا فیصلہ میں ابھی نہیں کر سکا ہوں۔ البتہ بابوؤں سے ڈرنے ضرور لگا ہوں، لیکن مجھے محسوس کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اگر میں بابو ہونے سے انکار کر دوں تو شاید مجھ سے بیوی کے متلاشی ہونے کا حق چھین لیا جائے گا، اور جب یہی اندھیر کھاتا ہے تو یہ بھی ناممکن نہیں کہ بیوی ہی چھین لی جائے، لیکن قبل از مرگ واویلا ٹھیک نہیں گو اصلی بابو وہی ہے جو مرگ سے قطع نظر کر کے واویلا کرتا رہے۔

ظاہر ہے بیوی کا جھنجھٹ درمیان نہ ہو تو روزگار کے پنپنے میں شبہ نہیں، لیکن روزگار کا لطف ہی کیا، اگر بیوی کے متلاشی ہونے کے حق سے دست بردار ہونا پڑے اس لیے فرض کر لیجیے کہ میں بابو بننے پر راضی ہو گیا۔ اس کے ساتھ میں آپ کو اس رمز سے بھی آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ جو شخص جلد راضی ہو جاتا ہے وہ اچھی بیوی تلاش کرنے میں اکثر ناکامیاب رہتا ہے، اور اپنی جگہ پر یہ بات بھی برحق ہے کہ جو شخص جلد راضی نہیں ہوتا وہ کبھی کبھی پائی ہوئی بیوی کو کھو بیٹھتا ہے!

گفتگو کا دوسرا ٹکڑا بیوی کا متلاشی ہونا ہے اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے، بشرطیکہ اس کا اعلان ریڈیو پر نہ کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے اعلانات سے ریڈیو کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ البتہ بابو شوہروں کی پوزیشن کچھ زیادہ قابلِ رشک نہیں رہ جاتی، بیوی کی تلاش اور بلوے کی افواہ دونوں نقضِ امن کے باعث ہوتے ہیں۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب بیوی کی تلاش اور بلوے کی افواہ دونوں ساتھ ساتھ شروع ہوں، اس لیے احتیاط ہر حال میں بہتر ہے۔ خواہ بابو میں ہوں خواہ آپ۔ اصلی بابو وہی ہے جو بیوی سے زیادہ امن کا متلاشی ہو۔

تیسرا ٹکڑا برسرِ روزگار ہونا ہے جو میں یقیناً ہوں اور رہوں گا، بشرطیکہ بیوی کی تلاش میں کہیں غلطی نہ کر جاؤں یا خود بیوی میری تلاش میں کامیاب نہ ہو جائے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ بیوی کا برسرِ روزگار ہونا مہمل ہے۔ دوسرے کہتے ہیں کہ برسرِ روزگار ہو کر بیوی کی فکر میں مبتلا ہونا مہمل تر ہے کچھ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جن کا کہنا یہ ہے کہ جنگ کے زمانہ میں روزگار اور بیوی دونوں مہمل ہیں۔ اس بارے میں، میں بجائے خود فیصلہ نہیں کر سکا ہوں۔ ممکن ہے تقریر کے دوران

میں یا اس کے بعد اس امر کا اندازہ ہو سکے کہ اس قسم کی باتوں پر وقت صَرف کرنا بجائے خود ایک مہمل بات ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بات خاص طور پر مدِ نظر رکھنی چاہیے، یعنی آج کل وہ زمانہ ہے جب روزگار ملنے کا امکان گھٹتا جا رہا ہے اور بیوی ملنے کا خدشہ بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ دیکھنا البتہ باقی رہ گیا ہے کہ بیوی ملنے کا امکان گھٹ جائے گا تو اس کا اثر روزگار پر کیسا پڑے گا۔ جنگ کے زمانہ میں اس قسم کے مسائل پر غور کرنا کچھ اچھی بات نہیں ہے۔ اس کو بیویاں خاص طور پر ناپسند کریں گی، اور ظاہر ہے بابو کو بھی جنگ سے زیادہ بیوی عزیز ہوتی ہے!

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرے بابو ہونے کے کیا معنی ہیں، اور یہ اس لیے کہ عام طور پر جو مفہوم بابو کا ہے میں اس سے کسی قدر مختلف واقع ہوا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ بیوی کی تلاش میں مجھے کامیابی ہو جائے تو میں بھرپور بابو بن جاؤں۔ پھر کچھ یہ بھی ہے کہ اصلی بابو شادی شدہ ہی بابو ہوتا ہے، اس لیے کہ بابو میں بیوتّت کا پایا جانا ضروری ہے۔ یہ بات بظاہر آپ کو عجیب معلوم ہوتی ہوگی، لیکن اکثر جو باتیں جتنی عجیب معلوم ہوتی ہیں اتنی ہی صحیح بھی ہوتی ہیں۔ یہ بات آپ کو اس وقت معلوم ہوگی جب آپ کسی بابو سے بات کرنا شروع کریں گے، آپ کو فوراً معلوم ہوگا کہ آپ سے ایسی غلطی سرزد ہوئی ہے جس کو صرف ایک بیوی جھگڑ کر ہی معاف کر سکتی ہے۔ آپ کی گفتگو کا بابو جواب ایسا دے گا جس کا کوئی تعلق سوال سے نہ ہوگا۔ آپ جرح کریں گے تو وہ آپ پر ترس کھا کر اور زیادہ غیر متعلق باتیں کرنے لگے گا۔ آپ خوش ہوں تو وہ ایسا جواب نہ دے گا جس سے آپ سوچ میں پڑ جائیں یا اپنے آپ سے بیزار ہو جائیں آپ ناخوش ہیں تو وہ ایسا جواب دے گا جس سے آپ محسوس کریں گے کہ آپ کا ناخوش رہنا بے سود اور خوش رہنا مہمل ہے، آپ گھبرا کر کوئی اور بات شروع کریں گے تو وہ اپنی چھتری سنبھال لے گا، آپ متعجب ہوں گے تو وہ چلا جائے گا!

بابو بات اس طور پر کرے گا جیسے وہ جھگڑنا پسند کرتا ہے اور جھگڑے گا اس طور پر گویا وہ بات کرنے کے درپے ہے، حالاں کہ نہ وہ بات کرنا چاہتا ہے، نہ جھگڑنا چاہتا ہے وہ صرف آپ کی عافیت میں مخل ہونا چاہتا ہے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ آپ اس کی عافیت میں مخل نہ ہوں۔ اس اعتبار سے وہ بیوی سے مختلف ہے۔ بیوی آپ کی عافیت میں اس لیے مخل ہونا چاہتی ہے کہ آپ

دوسروں کی عافیت میں مخل ہونے کے قابل نہ رہ جائیں بابو بالطبع کفایت شعار ہوتا ہے اور اطاعت گزار بھی، بیوی بھی ایسی ہی ہوتی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بابو نہیں ہوتی بیوی یا عورت جھگڑنے سے پہلے تیار رہتی ہے کہ وہ رو پڑے گی بابو جھگڑنے میں اس بات کے لیے بہت پہلے سے تیار رہتا ہے کہ وہ پٹ جائے گا۔ یہی سبب ہے کہ ان دونوں کے مخالفین ہمیشہ آخر میں زک کھا جاتے ہیں۔

آپ تعجب کرتے ہوں گے کہ میں نے اس سے پہلے جو یہ عرض کیا تھا کہ میں بابو کی مروجہ اقسام سے کسی قدر مختلف ہوں، اس کی وضاحت اب تک کیوں نہ کی۔ اس کا سبب ایک تو یہ ہے کہ میں اپنی باتوں کی خود وضاحت نہیں کرتا، اس لیے کہ میرے مخاطب صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو الہام کے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، تفسیر کے محتاج نہیں ہوتے اور نہ اسے گوارا کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایسی بات کی وضاحت کرنی کون سی عقل مندی ہے جس سے صرف بابو ہونا ثابت ہو جائے۔

بیوی تلاش کرنے کے بہت سارے طریقے ہیں، سب سے پہلا اور ایامِ جاہلیت کا تو یہ تھا کہ تلاش کرنے کے بجائے تلوار سے کام لیا جائے اس میں سب سے زیادہ دخل قوتِ بازو کو تھا۔ جس قبیلہ میں جس لڑکی کو پسند کیا اس کے نام پر کفن سر سے باندھ لیا یارانِ رزم و بزم کو خبر لگی، تلواریں نکل پڑیں، خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ حملہ کارگر ہوا تو حجلۂ عروسی، نہیں تو تختۂ میت، صدیوں انتقام کی آگ سلگتی رہتی اور یہی ڈراما المیہ یا رزمیہ کی کروٹیں لیتا رہتا۔ یہ باتیں مٹ گئیں، ان کی یادگار اب بھی باقی ہے۔ کسی فوجی افسر کی شادی ہوتی ہے تو دولہا دلہن تلواروں کی چھاؤں —— میں نکالے جاتے ہیں۔ ہندوستانی گھرانوں میں لڑکی روتی ہوئی اپنے گھر سے رخصت ہوتی ہے، تو جناب والا میں شادی میں خون خرابے کا بالکل قائل نہیں ہوں، اس قسم کی حرکتوں سے روزگار ہی نہیں بلکہ جان بھی چلی جاتی ہے۔ آدمی جن باتوں کو مدِ نظر رکھ کر شادی کرتا ہے ان میں یہ کہیں نہیں آتا کہ شہادت پہلے پائے، شوہر بعد میں کہلائے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ دو ملکوں میں سیاسی یا تجارتی تعلقات قائم کرنے یا رکھنے یا گھر کی جائیداد گھر ہی میں رکھنے کے لیے شوہر بیوی تلاش کی جاتی ہے، اس سے دو ملکوں میں تعلقات اچھے

قائم ہو جاتے ہیں اور گھر کی جائیداد بھی گھر ہی رہ جاتی ہے، لیکن اس میں اکثر یہ باتیں نظر انداز کر دی جاتی ہیں کہ میاں بیوی کس عمر کے ہیں کن امراض میں مبتلا ہیں، کیسی طبائع ہیں، اس لیے وہ مقاصد تو بر آتے ہیں جو پیشِ نظر تھے، لیکن اکثر دیکھا یہی گیا ہے کہ ایسے میاں بیوی کی اولاد جائیداد سے متمتع ہونے یا بھلے مانسوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں رہ جاتی۔ میں ایک سادہ دل اور مرنجاں مرنج بابو ہونے کی وجہ سے ایسی باتوں سے دور بھاگتا ہوں، لیکن اس شکنجے میں آ گیا تو جانتا ہوں کہ دور یا نزدیک کا سوال تو درکنار بھاگنے ہی کے قابل نہ رہ جاؤں گا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ کی اسی دنیا میں ایسے بین الاقوامی بابو بھی موجود ہیں جن سے سابقہ پڑنے پر اگر کسی کو سخت ہزیمت اُٹھانی پڑے تو مجھ لوکل بابو کو ایسے کلمات سے نہ یاد کریں جو بابو تو کچھ سمجھ کر برداشت کر لے گا، لیکن کوئی بھلا مانس کبھی گوارا نہ کرے گا۔

بیوی تلاش کرنے کا ایک طریقہ بادشاہوں کا ہوتا ہے، وہ یا تو کہیں سے کسی کا سونے چاندی کا بال پا جاتے ہیں یا انھیں کسی کی ایک پاؤں کی خوب صورت سلیپر مل جاتی ہے چنانچہ وہ اپنے وزیر باتدبیر کو یہ حکم سناتے ہیں کہ چالیس دن کے اندر اس لڑکی کو حاضر کرو جس کے یہ بال یا سلیپر ہیں ورنہ زن و بچہ سمیت کولھو میں پیل ڈالے جاؤ گے۔ یہ حکم سنا کر ایڑیاں رگڑنے اور اشعار پڑھنے لگتے ہیں۔ چالیسویں دن وزیر ان کی محبوبہ کو لے کر حاضر ہو جاتا ہے، جشن منایا جاتا ہے اور شادی ہو جاتی ہے، لیکن جناب مجھے اس قسم کے طور طریقے پسند نہیں ہیں۔ اوّل تو اس قسم کی بیوی صرف بادشاہوں کو میسّر آ سکتی ہے، دوسرے یہ کہ ایسی کوئی خاتون مل بھی جائیں تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھی کو کولھو میں پیل ڈالیں گی۔

بیوی تلاش کرنے کا اتنا نہیں جتنا کھونے یا پانے کا ایک طریقہ ڈنر اور ایوانِ رقص کا ہے اپنی منظورِ نظر کو سینما دکھایئے، کھلایئے، پہنایئے، تحائف دیجیے، گھوڑ دوڑ اور تاش میں اس کی طرف سے بازی ہاریئے، اس کو ناچنے دیجیے اور خود داد دیجیے، وہ گھوڑے پر بیٹھے آپ فخر کیجیے، وہ کشتی میں بیٹھے، آپ مونگ پھلی کھایئے، وہ کچھ سمجھ کر ہنسے آپ بے سمجھے رو پڑیئے، اس کے ساتھ ساتھ اس نیازمندی سے پھریئے کہ اس کا کتا آپ سے مانوس ہی نہ ہو جائے بلکہ آپ کا منہ چاٹ لے تو آپ اُسے پائیریا کا مجرّب نسخہ سمجھیں، اس کے بھنگی کو دیکھ کر آپ کی باچھیں کھل جائیں، اور

والدین نظر پڑ جائیں تو آپ پر گھڑوں پانی پڑ جائے ان سب ریاضتوں کے بعد دعا مانگیے کہ کوئی من چلا بیچ میں نہ آ کودے ورنہ وہ تو ہنی مون پر روانہ ہو جائے گا اور آپ اس کی شادی کی پارٹی کی پلیٹیں دُھلواتے گنواتے پھریں گے!! میں اس قسم کی شادی اور اس قسم کی بیوی کو دور ہی سے سلام کرتا ہوں گو بحیثیت ایک بابو کے لوگوں کو دور و نزدیک دونوں سے سلام کرنے کا یوں بھی عادی ہوں، اس قسم کی بیوی سب سے پہلے میرے بابو ہونے پر اعتراض کرے گی، وہ میرے لباس میرے کھانے پینے، رہنے سہنے، چلنے بولنے سب میں حفظانِ صحت قسم کے جراثیم نکالے گی اور وٹامن قسم کی باتوں کا اضافہ کرنا چاہے گی۔ آپ تو جانتے ہیں جراثیم اور وٹامن قسم کی باتوں کا تندرستی پر مطلق نہیں، لیکن روزگار پر کافی خراب اثر پڑتا ہے اور میں بحیثیت ایک بابو کے روزگار کو خطرے میں دیکھنا پسند نہیں کر سکتا۔

ایک طریقہ بیوی پانے کا اتنا نہیں جتنا کہ شوہر بن جانے کا یہ ہے کہ آپ تو ایک روشن خیال نوجوان کی حیثیت سے آرٹ کی تکمیل اور اخلاق کی تہذیب میں مصروف رہ کر ''رومانی فضا'' اور ''یاسمینی تبسم'' پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہوں اور اردو شعر و ادب میں افسانے کو حقیقت اور حقیقت کو افسانے میں سمونے کی فکر میں سرگرم ہوں کہ ایک دن یہ معلوم ہو کہ اردو شعر و شاعری میں اضافے کے ساتھ ساتھ آپ کی خانگی ذمہ داریوں میں بھی اضافے کے آثار پیدا ہو گئے ہیں اور آپ ان ذمہ داریوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں تو رومانی فضا اور جیل خانہ کی ہوا میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تو جناب والا ایک بابو اس قسم کی باتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا بابو اشتہاری اور افسانوی دو قسم کی بیویوں سے پناہ مانگتا ہے بابو نہ افسانے کا قائل ہوتا ہے، نہ حقیقت کا وہ تو اپنے آفس ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ وہ مسل بندی پر ایمان رکھتا ہے۔ ہندو مسلم فساد یا اتحاد قسم کی باتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتا غزلیں، افسانے، تنقید اور انقلاب زندہ باد، یا ہم آپ مردہ باد۔ آپ کو مبارک ہوں، مجھے تو بیوی چاہیے۔

اب میں ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ بھی بتا دوں کہ میں خود کیا ہوں، میرا برسرِ روزگار ہونا کیا معنی رکھتا ہے، اور میں بیوی کیسی چاہتا ہوں۔ میں جیسا کہ آپ جانتے ہیں ایک بابو ہوں، بات زیادہ کرتا ہوں، کھانا کم ہضم ہوتا ہے، دوسرے کی بات اتنا ہی سمجھتا ہوں جتنا کہ سمجھنا چاہتا ہوں،

سوتا کم ہوں خراٹے زیادہ لیتا ہوں، تنخواہ کم ہے، آمدنی معقول ہے آمدنی خرچ کرتا ہوں تنخواہ بچاتا ہوں، نہانے میں جسم صاف کرنے کا اتنا قائل نہیں ہوں جتنا اس سلسلے میں کپڑا بھگونے، نچوڑنے اور سکھا کر پہن لینے کا۔ لڑتا کسی سے نہیں، چھتری ہمیشہ رکھتا ہوں، سخت سُست کم کہتا ہوں، سن زیادہ لیتا ہوں، ترکاری خریدتا ہوں، ہارمونیم بجاتا ہوں، سفر میں ٹکٹ کم خریدتا ہوں، بیوی بچے اور اسباب زیادہ لے جاتا ہوں، رجسٹر مکمل رکھتا ہوں، اندراجات مشتبہ ہوتے ہیں، نہ اپنی بیوی کو شعر سناتا ہوں نہ دوسرے کی بیوی کو سینما دکھاتا ہوں، روپیہ بچانے کا گر جانتا ہوں، خرچ کرنے کے آرٹ سے نابلد ہوں، کنبہ کی پرورش کرتا ہوں، لیڈر کی تواضع نہیں کرتا، نہ چندہ دیتا ہوں، نہ چندہ کھاتا ہوں، قوم کا درد کبھی نہیں اُٹھا، سوہضم کی شکایت اکثر ہو جاتی ہے۔ خون کا دباؤ اکثر زیادہ ہو جاتا ہے، قرض کے دباؤ میں کبھی مبتلا نہیں ہوا۔ قومی ترانے سے بھجن گانا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں، سفر کرتا ہوں زنجیر کبھی نہیں کھینچتا، اپنے دہی بڑے کھاتا اور دوسرے کا اخبار پڑھتا ہوں، چھوٹی سے چھوٹی رقم بھی قبول کر لیتا ہوں۔ اس اصول پر کہ کچھ نہ کچھ آتا ہی ہے جاتا نہیں، دولت کا راز آمدنی میں نہیں پس انداز کرنے میں سمجھتا ہوں، افسر کی ہمیشہ اطاعت کرتا ہوں، ساتھ کام کرنے والوں سے ہمیشہ چوکنا رہتا ہوں۔ خبریں سنتا ہوں رائے زنی کبھی نہیں کرتا۔ گفتگو آزادی سے کرتا ہوں، مطلب کی بات کبھی نہیں کرتا، مدد کروں یا نہ کروں مداخلت بالکل نہیں کرتا، آگے بڑھنے میں ساتھ ڈھونڈھتا ہوں، پیچھے ہٹنے میں کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ سلام کرتا ہوں جواب کا متوقع نہیں رہتا۔

اب صرف اتنا بتانا اور رہ جاتا ہے کہ میں کس قسم کی بیوی کا متلاشی ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ اس بارے میں میری قوتِ تمیز ہی کچھ بہت زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ میرے لیے یہ آسان ہے کہ میں بیوی کا ایسا حلیہ بتاؤں جو ممکن ہے اچھے سے اچھے شاعر اور مصور کے ذہن میں بھی نہ آیا ہو، لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ مجھے یک قلم مسترد یا مردود کردے تو میں کیا کرلوں گا، اور چوں کہ میں نہ شاعر ہوں نہ لیڈر اس صدمہ کو برداشت کیسے کرسکوں گا۔ اس لیے میں یہ پسند نہیں کرتا کہ حلیہ کی تفصیل پیش کروں میں تو ایک ''نیک بخت'' چاہتا ہوں۔ جو خفا ہو تو تھوڑی سی خوشامد سے من جائے اور خوش ہو تو کوئی سستی سی مختصر فرمائش کر بیٹھے۔ نہ اتنی بات کرنے والی ہو کہ مجھے بار بار ''اسپرین'' کھانی پڑے اور نہ اتنی کم سخن ہو کہ میرے بولنے کی عادت زائل ہو جائے۔ نہ جانے اس درجہ حسین

ہو کہ میرا دماغ خراب ہو جائے اور نہ اس درجہ بدقوارہ کہ مجھے ایک خاص قسم کے شعر وادب میں پناہ لینی پڑے۔ صفائی پسند ہو، لیکن نہ ایسی کہ شوہر اور بچوں کو کوڑا سمجھے اور نہ صفائی سے ایسی بے نیاز کہ صافی اور ساری میں امتیاز نہ کر سکے۔ نہ ایسی موٹی کہ ڈانڈی والے دیکھ کر دم بخود ہو جائیں اور نہ اتنی لاغر کہ شعرا تک شرمائیں۔ میں ایسی بیوی نہیں چاہتا جو گھر کی اتنی دولت مند ہو کہ نہ مجھے اپنی کمائی پر فخر کرنے کا موقع دے نہ خود اس میں اس کی استعداد باقی رہ گئی ہو کہ میری کمائی پر فخر کرے۔ نہ میں ایسی ذہین بیوی چاہتا ہوں جو ''نکات بے دل'' کے مقابلہ میں میری کلفتوں کو خاطر میں نہ لائے اور نہ ایسا شوہر بننا پسند کرتا ہوں جو بیوی کی ذہانت کو اپنے گھامڑ پن کی توہین سمجھے۔ نہ ایسی ہو کہ تندرست ہو، لیکن بیماری کا بہانہ کرے نہ ایسی کہ بیمار ہو، لیکن تندرست ہونے کا اظہار کرے۔ میں ایسی بیوی نہیں چاہتا جو میری بیوی بن کر یہ سمجھے کہ اس کو اس کا اجر آخرت میں ملے گا اور نہ ایسی جس کو پا کر میں آخرت کو بھول جاؤں۔

بیوی ایسی ہو کہ میں اگر کسی سنسان جزیرہ میں پھینک دیا جاؤں تو اس کا ساتھ میری تقویت وتفریح کا باعث ہو اور وہ کسی آباد مینو سواد شہر میں اُتار دی جائے تو میرے ہی ساتھ کو تقویت وتفریح کا موجب جانے۔

(مطبوعہ۔ آج کل، دہلی، اکتوبر 1941)

●●●

شیخ چلّی وزیر اعظم بنا دیے جائیں تو کیسا ہو

سوال یہ نہیں ہے کہ شیخ چلی وزیر اعظم بنا دیے جائیں تو کیا ہوگا۔ لطیفہ یہ ہے کہ وزیر اعظم شیخ چلی کے کان کاٹتے ہیں تو ہم کیا کر لیتے ہیں! یہاں یہ بحث بھی اُٹھائی جا سکتی ہے کہ ہر وزیر اعظم شیخ چلی ہوتا ہے۔ اسے بحث نہیں حادثہ کہتے ہیں جو ہر اُس شخص کو پیش آتا ہے جو نہ شیخ چلی ہوتا ہے نہ وزیر اعظم، لیکن ریڈیو پر ایسی باتیں مقبول نہیں جن سے نہ شیخ چلی کا فن ظاہر ہوتا ہو نہ وزیر اعظم کی ذات پہچانی جاتی ہو!

میں تحقیق سے یہ نہیں بتا سکتا کہ شیخ چلی کون تھے، اُن کے افسانے سنے ہیں۔ اس پر ریسرچ بھی نہیں کر سکتا۔ معلوماتِ عامہ کے اعتبار سے یہ بتا سکتا ہوں کہ شیخ چلی آئس کریم نہ تھے۔ اس کے انکشاف پر آپ ہنس سکتے ہیں میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، لیکن اتنی بات یاد رکھیے کہ آج کل معلوماتِ عامہ یا جنرل نالج کا ایک مفہوم یہ بھی ہے۔ آخر سائنس وغیرہ میں ایسی بات کا ثابت کر دینا بھی تو بڑی بات سمجھی جاتی ہے کہ فلاں بات فلاں بات نہیں ہے!

یہ بات کہ شیخ چلی کو وزیر اعظم بنانا چاہیے یا نہیں بات کے طور پر تو ٹھیک ہے، لیکن اس کی عزت صرف ایک مصرعہ طرح کی ہے جس سے شاعروں کی ذات پہچانی اور شاعری کی آبرو بگاڑی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے اور آپ کا اندیشہ کہ کوئی شخص وزیر اعظم بن ہی نہیں سکتا جب تک وہ شیخ چلی نہ ہو۔ یہ بات اور ہے کہ ہزار ہا لکھو کھا شیخ چلی اس دنیا سے نامراد اُٹھ گئے اور کسی نے

ان کی قدر نہ پہچانی یعنی وہ وزیر اعظم تک نہ بن سکے۔ یہ بات بتانی ذرا مشکل ہے کہ ایک شیخ چلی وزیر اعظم کے کان کاٹنے لگتا ہے اور کب وزیر اعظم شیخ چلی کو پچھاڑ دیتا ہے۔ اس رمز کو صرف شاعر بتا سکتا ہے اس لیے کہ ہماری زندگی اور ادب میں شاعر ہی وہ عجوبہ ہے جو دلیل بھی ہے اور ثبوت بھی۔ وہ دلیل کو ثبوت کا درجہ دے دیتا ہے اور ثبوت کو دلیل کا اور دونوں سے باز رکھا جائے تو مفروضہ کو دونوں سے اونچا بنا کر اپنے اور اپنی شاعری دونوں کے انجام سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ شاعری میں شیخ چلیت اسی کا نام ہے اور آپ تھوڑا سا بھی غور کریں تو ہماری شاعری میں اس کے عجیب سے عجیب تر مظاہرے ملیں گے بلکہ یہ کہنا بھی کوئی انوکھی بات نہ ہوگی کہ آج کل بعض شعراء وہ کر گزرتے ہیں جو شیخ چلی کے باوا آدم بھی نہیں کر سکتے وہ باوا آدم جو روایت میں کوئی رہے ہوں کہاوت میں نرالے ضرور ہوتے ہیں۔

اردو کہانیاں شروع یوں ہوتی ہیں۔ ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ! تو آیئے آپ ہم اسے یوں شروع کریں۔ ایک تھے شیخ چلی، ہمارے آپ کے شیخ چلی وزیر اعظم! پُرانے زمانہ میں اکثر بادشاہ یوں بھی بنائے گئے ہیں کہ بادشاہ کے مرجانے پر تخت نشینی کا جھگڑا پڑا تو لوگوں نے فیصلہ کیا کہ صبح کے وقت شہر سے باہر نکل جائیں اور جو شخص سب سے پہلے شہر پناہ کے دروازے سے داخل ہو اس کے سر پر تاج رکھ دیا جائے۔ اس زمانے میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے جس پارٹی کے زیادہ لوگ منتخب ہوتے ہیں ان میں جو سب سے بڑا شیخ چلی ہوتا ہے اس کو وزیر اعظم بنا دیتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب اس کا بالکل نہیں خیال کرتے کہ وہ شہر پناہ کے صدر دروازے سے داخل ہوا ہے یا کسی چور دروازے سے گھس آیا ہے!

اب سے دور اور کہیں نہ کہیں سے قریب شیخ چلی وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ اخبارات نے بڑی نمایاں سُرخیوں میں اس کا اعلان کیا۔ حکومتوں نے شیخ چلی کے ملک سے اپنے اپنے سفیر واپس بلا لیے اور اپنے ہاں مشیروں کی تعداد دوگنی کر دی۔ سفیروں کی جگہ پُر کرنے کے لیے شعراء، قوال اور جھاڑ پھونک کرنے والے بھیج دیے۔ سرحد سے فوجیں ہٹالی گئیں ان کی جگہ عوامی تھیٹر اور پتنگ بازی کے اکھاڑے قائم کیے گئے۔ صرافے میں سونے کا بھاؤ گر گیا اور منڈی میں بتاسے کے دام چڑھ گئے۔ گیہوں سے کنٹرول اُٹھا کر گدھوں پر لگایا گیا اس لیے کہ ماہرینِ فن کی رائے یہ

ہوئی کہ شیخ چلّی کی منسٹری میں گدھوں کا ہل چل جائے گا۔ کپڑے کا کوٹا بڑھایا گیا اور جوتے پر کنٹرول کیا گیا۔ اندیشہ یہ تھا لوگ ننگے نہ ہو جائیں اور جوتا چلنے نہ لگے!

کونسل کا اجلاس شروع ہوا۔ شیخ چلّی نے بحیثیت وزیر اعظم تقریر شروع کی:

''بھائیو، زمانہ نازک ہے دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار!''

حاضرین نے دستار کی طرف ہاتھ بڑھایا تو معلوم ہوا کہ Chillites چلّئین، سارے کے سارے ننگے سر تھے۔ شیخ نے فرمایا:

''کوئی مضائقہ نہیں۔ ہمارے پاس دستار نہیں ہے نہ سہی، ہمارے پاس دستور ہے۔''

مجلس سے نعرۂ تحسین بلند ہوا۔ صدر نے فرمایا:

''ہم یہ دستور ترک کرتے ہیں۔ اب جب کبھی آپ کو کوئی بات پسند آئے تو نعرہ لگانے یا تالیاں بجانے کے بجائے ایک دوسرے کا کان پکڑ کر اُٹھتے بیٹھتے رہیے اس سے صدر کو معلوم ہوتا رہے گا کہ آپ کی قوتِ معدہ اور جذبۂ تحسین میں کیا ربط ہے اور وہ ربط کب تک قائم رہتا ہے اور کب 'ہم ہیں اپنی شکست کی آواز' میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تو بھائیو۔''

اتنے میں آواز آئی: ''جناب والا ہم میں سب کے سب بھائی نہیں ہیں، بیویاں بھی ہیں اور ان کے بچے اور دوسرے رشتہ دار بھی وہ کہاں جائیں؟''

شیخ نے جواب دیا: ''میں اپنی فروگذاشت کی معافی چاہتا ہوں، لیکن اس ایوان میں جہاں میں وزیر اعظم اور صدر مجلس ہوں نہ میری کوئی بیوی ہے نہ بچہ!''

ایک طرف سے نہایت بھیانک اور نامبارک سی چیخ بلند ہوئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ بیگم چلّی ایک درجن ذرّیات کے ساتھ مجمع کو روندتی، چیرتی پھاڑتی کرسیِ صدارت کی طرف اس طرح بڑھ رہی ہیں جیسے کوئی زخمی بپھرتی ہوئی شیرنی اپنے بچّوں کے ساتھ شکاری کی طرف بڑھ رہی ہو اور راستہ میں جھاڑیاں اور لمبی لمبی گھاس جھکتی، دبتی، پستی جا رہی ہو۔ صدر کے قریب پہنچ کر انھوں نے ایک ایک بچہ کو اُٹھا کر شیخ کے اوپر پٹکنا شروع کیا اور ہر وار پر کہتی جاتی تھیں: ''یہ تمہارے کون ہیں؟''

اور کون کے ساتھ ہر اُس نازک و نا گفتہ بہ رشتہ کا اعلان کر دیتی تھیں جو صرف اصلی رشتہ نہ ہوتا۔ اس کے بعد شیخ وزیر اعظم چلّی کے دونوں کان پکڑ کر اتنا زور لگایا کہ شیخ چلّی اور بیگم چلّی دونوں کی آنکھیں اور زبان باہر نکل پڑی اور تھوڑی دیر کے لیے یہ امتیاز کرنا دشوار ہو گیا کہ شیخ چلّی کے دونوں کان بیگم چلّی کے ہاتھوں کو نچوڑ رہے تھے یا بیگم چلّی کے ہاتھ شیخ چلّی کے کان کا افشردہ بنا رہے تھے سارے بسورتے ہوئے بچے ادرگرد بکھرے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی یتیم خانے کے پرانے مجروح یا سزا یافتہ کھلونے ٹوکری میں بھر کر اس طرح گرائے گئے ہوں جیسے کسان ہوا میں اناج سے بھُس دور کرتا ہے!

پھر بولیں: ''کیوں پھر ایسی بات منہ سے نکالے گا؟ اتنی بڑی جگہ بیٹھ کر ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے۔ یہ تو دیکھتا نہیں کہ کرسی پر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی خارشی بڈھا بس کہو، پڑا اونگھ رہا ہو اور باتیں ایسی کرتا ہے جیسے دھنونتری کے ناتی ہوں!''

شیخ چلّی آخر شیخ چلّی ہی تھے۔ وزیر اعظم بھی، سب کچھ پی گئے، آنسو بھی غصہ بھی۔ کانوں کی شکنیں ہولے ہولے سلجھاتے، سہلاتے، گلا صاف کرتے ہوئے بولے:

''میں اپنی فرو گذاشت کی معافی چاہتا ہوں اور اس کی تلافی یوں کرتا ہوں کہ بیگم چلّی صدارت فرمائیں اور کیوں نہیں، عورتوں پر صدیوں مردوں نے مظالم توڑے ہیں اور گو انھوں نے بھی اُٹھتے بیٹھتے مردوں کی مرمت کی ہے، لیکن میری وزارتِ عظمیٰ میں ان کو مکمل آزادی ہوگی کہ یہ پردہ توڑیں اور نوالہ توڑ کر نہ دیں!''

حاضرین کے کان کھڑے ہوئے، لیکن اظہارِ تحسین کے سلسلہ میں فوراً ایک دوسرے کا کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کرنے لگے۔ شیخ چلّی حاضرین میں آخر مل گئے۔ بیگم چلّی کرسیِ صدارت پر رونق افروز ہوئیں اور فرمایا:

''میں شوہر چلّی کے انصاف و پشیمانی کی داد دیتی ہوں۔''

اتنے میں محترمہ کیا دیکھتی ہے کہ شیخ چلّی کا کان ایک عورت پکڑے ہوئے ہے اور خود شیخ چلّی اپنے پس ماندگان کو دونوں ہاتھوں سے اس طرح پکڑے ہوئے ہیں جیسے خود اپنے کانوں

سے آویزاں کر دیے گئے ہوں۔ بیگم چلّی نے اس طریقہ یا انجام کو مشتبہ نظر سے دیکھا اور بولیں:

''کامریڈ شوہر، کان پکڑ وانے میں تمہارے انتخاب کو دخل رہا ہے یا نہیں۔''

شوہر نام دار نے فرمایا: ''محترمہ، کان پکڑ وانے میں تو میری رولنگ کو دخل ہے، لیکن میرے کان کے انتخاب میں پکڑنے والی کا دخل ہے۔ رہی میری خلوصِ نیت یا شومیٔ قسمت اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا ہی ایک کان پکڑ رکھا ہے اور میری اٹھک بیٹھک کو بھی اس ایوان کی روایت کی اتنی پابندی نہ سمجھی جائے جتنی ان محترم خاتون کے اعزاز میں میری خود لعنتی کو۔''

بیگم چلّی ابھی کچھ طے نہ کر پائی تھیں کہ ایک طرف سے بچّے کے بلبلانے کی صدا کان میں پڑی۔ بیگم چلّی نے ماسٹر چلّو کی آواز پہچانی تو بے اختیار کرسیِ صدارت چھوڑ کر حاضرین میں آ کر شامل ہو گئیں اور شیخ چلّی پھر سے کرسیِ صدارت پر براجمان ہوئے۔ شیخ نے فرمایا:

''حاضرین نے دیکھا ہو گا کہ ہماری حکومت نے خیالات اور اعمال کی کیسی آزادی دے رکھی ہے۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ ہر شخص کو اس کی آزادی ہونی چاہیے کہ جو اس کے جی میں آئے کرے اس سے ہماری تحت شعوری الجھنیں دور ہو جائیں گی۔ ہماری زندگی ہمارا ادب بن جائے گی اور ہمارا ادب ہماری زندگی۔ اس طور پر ہم بجا طور پر کہہ سکیں گے اور دکھا سکیں گے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری''[1]

مجمع سے شورِ تحسین وتہنیت اُٹھا۔ کان پکڑ کر اُٹھنے بیٹھنے کے بجائے حاضرین نہایت تحتِ شعوری انداز سے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے بچّے روندے جانے لگے۔ بوڑھے کھانسنے، عورتیں ہاپنے لگیں، لڑکیاں اپنی چالوں بھاگنے لگیں، شیخ چلّی نے صدارت کی میز پر کھڑے ہو کر ناچنا شروع کیا۔ یکا یک بیگم چلّی نے جست کی اور شوہر نام دار کے شانوں پر سوار

---

1 ترجمہ: میں تو ہو گیا اور تو میں ہو گیا، تا کہ بعد میں کوئی یہ نہ کہہ سکے میں الگ ہوں اور تم الگ ہو۔

ہوگئیں کچھ دیر تک ہر طرح کی تحت شعوری خوش فعلیاں ہوتی رہیں۔ پولیس کو خبر ہوئی اس نے آ کر انسدادی تفر تحسیں شروع کر دیں۔ ایوان خالی کر دیا گیا تو معلوم ہوا کہ تحتِ شعوری سرگرمیوں کے ساتھ کچھ غیر شعوری حادثات بھی پیش آ گئے تھے جس میں خود وزیر اعظم جلی کا Contribution سب سے انوکھا تھا!

دوسرے دن مجلس کا غیر معمولی جلسہ طلب کیا گیا۔ایک ممبر نے یہ سوال کیا کہ ایوان مجلس میں گذشتہ موقع پر جو ہنگامہ برپا ہوا تھا اس پر وزیر اعظم کا reaction کیا تھا اور کیا یہ آئینِ مجلس کی روایات کا شایانِ شان تھا؟ شیخ جلی نے جواب دیا کہ:

''یہ سوال بے محل بھی ہے اور بدتمیزی کا بھی اس لیے کہ ظاہر ہے کہ حکومت خود اختیاری میں بے اختیاری مضمر ہوتی ہے۔ رہا یہ کہ ہم نے ایوانِ مجلس کی روایات کا احترام کیا یا نہیں اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ہم ایک آزاد قوم ہیں، روایات ہماری پابند ہیں نہ یہ کہ ہم روایات کے پابند ہوں روایات کی پابندی جاگیردارانہ خرافات ہے۔ کسی ادارہ میں روایات کا پیدا ہونا ہی اس ادارہ کے زوال کی نشانی ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس طرح کی کمزوری ہماری حکومت میں راہ نہ پائے۔ پھر یہ کیسی بدتمیزی ہے کہ جو واقعہ آپ کے سامنے گزرا اور جس میں آپ خود شریک رہے اس کا حال مجھ سے پوچھتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ آخر آپ خود کیا سمجھے۔ اگر کچھ نہیں سمجھے تو آپ سے خدا سمجھے۔ صدر کو اتنی فرصت نہیں کہ وہ گذشتہ واقعات میں اظہارِ خیال کر کے تضیع اوقات کرے۔ نت نئی سوچنے کا فرض اس پر عائد ہوتا ہے کہ وہ کچھ اور نہیں سوچ سکتا۔''

صدر نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ:

''میں عنقریب اس ایوان میں یہ تجویز پیش کرنے والا ہوں کہ آئندہ سے پولیس حکومت کے ماتحت ہوگی نہ کہ حکومت پولیس کے ماتحت۔ ایوان مجلس میں پولیس کی مداخلت ممنوع ہوگی۔ پولیس کا کام یہ ہے کہ جو لوگ

قانون سے انحراف کریں ان کا انسداد کرے۔اس کے یہ معنی ہوئے کہ جو
لوگ قانون بنانے والے ہوں وہ پولیس کی مداخلت سے محفوظ رکھے
جائیں۔ اگر ایوان اس تجویز سے متفق نہ ہوگی تو پھر مجھے اپنے
اختیارِ خصوصی سے یا تو پولیس کو برخاست کرنا پڑے گا یا اس ایوان کو ختم کرنا
پڑے گا۔"

ایک ممبر نے دریافت کیا کہ:"ان دونوں کاموں کو پورا کرنے کے لیے پولیس کی مدد لازم آئے گی یا نہیں؟ شیخ چلی نے فرمایا کہ"ضرور لازم آئے گی اور اس میں کوئی قباحت نہیں۔اگر ایسا موقع آیا تو پولیس سے کام لینے کے بعد برخاست کیا جائے گا۔"

ممبر نے مزید سوال کیا کہ:"اگر پولیس نے خسارہ کی نالش کردی تو کیا ہوگا؟"

صدر نے فرمایا:"اس بارے میں عدالت کا امتزاج پہلے سے لیا جائے گا اگر اس کا فیصلہ حسب دل خواہ نہ ہوا تو اُسے پولیس ہی کے حوالے کردیا جائے گا۔لیکن میں آنریبل ممبر کے اطمینان کی خاطر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم ترقی کی اُسی منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں سے ہم بتدریج پولیس اور عدالت سے مستغنی ہوتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجائے گا جب صرف حکومت باقی رہ جائے گی اور دنیا میں کچھ اور باقی نہ رہے گا۔سوا اللہ کی ذات کے اور کنٹرول کے!"

ایک بزرگ نے جو بڑی دلجمعی کے ساتھ جمائی لے رہے تھے، معلوم نہیں شیخ کی اس بشارت سے یا منہ کے اندر کسی مکھی کے ازغیبی ڈرود سے منہ کو اس زور سے اور بدحواسی سے بند کیا کہ ان کے مصنوعی دانت بڑی صفائی اور بے تکلفی سے ایک خاتون کی گود میں جا پڑے۔ خاتون کا پرنواسا گود میں سو رہا تھا اور خاتون میٹنگ میں مصروف تھیں۔دانت کے گرنے سے بچّہ اور خاتون دونوں نے اپنے اپنے طور پر احتجاج کیا۔وزیر چلی کے یہاں جھگڑا پیش ہوا۔بزرگ نے فرمایا:

"جناب والا میرے یہ دانت مصنوعی بھی ہیں اور موروثی بھی، لیکن آج
تک انھوں نے دغا نہ کی اور کسی نے مجھ سے یہ بھی نہ پوچھا کہ تمہارے منہ
میں کتنے دانت ہیں۔آپ نے جو فرمایا کہ وہ وقت آجائے گا جب دنیا

میں کچھ اور باقی نہ رہے گا سوا ذاتِ اللہ کے اور کنٹرول کے تو میں اپنے آپ میں نہ رہا۔ جب اللہ کی ذات اور کنٹرول باقی رہے تو پھر باقی رہنے سے کیا بچا؟ میرے دانتوں کا جو انجام ہوا اس میں قصور آپ کا ہے نہ کہ میرا۔"

خاتون نے جواب دیا کہ: "پچاس سال سے اس شخص کا دانت مجھ پر رہا ہے۔ اس شخص کا اعتراض بالکل لچر ہے۔ اس کا عقیدہ نہ خدا کی ذات پر ہے نہ کنٹرول پر!"

شیخ چلّی نے فرمایا کہ: "یہ قضیہ تمام تر بورژوا ذہنیت کا نتیجہ ہے اور یہی وہ ذہنیت ہے جس کے خلاف میری وزارت ایک مستقل احتجاج ہے۔ میں موروثی یا وراثت کا لفظ سننا نہیں چاہتا خواہ وہ مدعا علیہ کے موروثی مصنوعی دانت ہی سے کیوں نہ متعلق ہو۔ رہا خدا کی ذات اور کنٹرول، یہ سوال مذہب اور سیاست سے متعلق ہے۔ ان دونوں کے بارے میں کمیٹیاں بنادی گئی ہیں وہ ان کی حد بندی کردیں گی اور رائے عامہ سے بھی استصواب کریں گی کہ وہ کنٹرول میں رہنا چاہتی ہے یا واصل بحق ہو جانا چاہتی ہے۔ مدعیہ اور مدعا علیہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی دانتا کلکل باہمی سمجھوتہ سے طے کرلیں۔ پچاس سال کی مدت یوں بھی ایسی ہوتی ہے جو کسی پر گزر جائے تو اس کو مرفوع القلم سمجھنا چاہیے!"

شیخ نے سرکلر جاری کیا تھا کہ ہسپتالوں اور دواؤں پر اخراجات یک قلم موقوف ان سے جو بچت ہو وہ لوگوں کو خوب کھلانے پلانے پہنانے اور بالآخر تجہیز و تکفین پر صَرف کی جائے اس کے بعد بھی کوئی مرض کی شکایت کرے تو اس کو کالا پانی بھیج دیا جائے جہاں اس کا پانی کا علاج کیا جائے۔ سر رشتۂ تعلیم کو ہدایت کی جائے کہ وہ استادوں کو یہ مشورہ دے کہ پڑھانے سے جو وقت بچا کرے وہ بھیک مانگنے پر صَرف کیا کریں اس سے ان کو تنخواہ کی کمی نہ محسوس ہوگی اور اس ملک میں بھیک مانگنے کا معیار بھی اونچا ہو جائے گا۔ ٹائم ٹیبل میں دو چار گھنٹے اسٹرائک کے رکھ دیے جائیں اس سے طالب علموں میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور قوم کا نصیبہ بھی جاگ اُٹھے گا۔ ٹرانسپورٹ کے محکمہ سے یہ حکم نافذ کیا گیا کہ قوم اور ملک میں لکیر کا فقیر بننے کا بڑا پرانا مرض ہے اس لیے آئندہ سے مقررہ راستوں پر چلنے کے بجائے ہر شخص اپنے بنائے ہوئے راستے پر چلے۔ سڑک اور مسافروں کی

مرمت پر کروڑوں روپے صَرف ہو جاتے ہیں اسی لیے ہر شخص سرنگ سے سفر کیا کرے جس میں جہاں تہاں بارود بچھادی گئی ہو جو وقت پر کام بھی آئے اور ہر تاج الملوک بکاؤلی کے باغ تک پہنچ سکے۔ عدالتوں میں نہ حاکم رکھے جائیں نہ وکیل کا دخل ہو صرف چپراسی اور کلرک ہوں گے۔ فوج داری کے معاملات چپراسی اور دیوانی کے کلرک طے کریں گے۔ پولیس اور ملٹری کی بالکل ضرورت نہیں سوا اس کے کہ جب کسی کے ہاں کوئی تقریب پیش آئے تو یہ بین بجائیں اور دو چار کرتب بازی گروں کے دکھا دیا کریں۔ امن کے زمانے میں آلاتِ حرب وضرب کے بجائے صرف گوپھن استعمال کی جائے تاکہ آم اور پھلوں کی فصل میں طوطوں اور چمگادڑوں یا منحوسوں کے منہ پر سے مکھی اُڑائی جاسکے۔

شیخ چلّی نے یہ پروگرام نافذ کیا ہی تھا کہ ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ شیخ چلّی اور ان کے وزرا ایوانِ حکومت میں اپنی اپنی گردنوں سے آویزاں ہیں نیچے ایک تختی لگی ہوئی ہے، جس پر لکھا ہوا ہے ''جس کا کام اسی کو سجے'' اس بیان کو لوگ پڑھتے تھے اور سوچتے تھے کہ یہ شیخ چلّی کے پروگرام سے متعلق ہے یا ان کے انجام سے!

(محرر۔ 1941 قیاس)

●●●

ہوتا تو کیا ہوتا

اگر بگڑا شاعر مرثیہ گو ہوتا ہے تو بگڑے ریاضی دان کو فلسفی کہہ دینے میں کیا مضائقہ ہے
بگڑے ریاضی داں کو فلسفی کسی نے نہیں کہا ہے، لیکن کیا معلوم یہی بات کوئی اور کہہ دیتا اس لیے
میں ہی کیوں نہ پہلے کہہ دوں۔ اس طرح کی بات کوئی کہہ دیتا ہے تو کوئی مار بھی بیٹھتا ہے، لیکن کوئی
ہرج نہیں۔ لڑائی کے زمانہ میں شرفا اس کی پروا نہیں کرتے۔ پھر انصاف تو کیجیے قافیہ اور مجمع بولتا ہوا
ہو تو شاعر یا لیڈر اپنے آپے میں کیسے رہ سکتا ہے۔ اب اتنی سی بات اور رہ گئی ہے کہ بگڑا مرثیہ گو یا
بگڑا فلسفی کیا ہوتا ہے، لیکن اس کا جواب دیا جائے تو سوالات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع
ہو جائے گا۔ اس لیے اس کو کسی فلسفی یا مرثیہ گو ہی پر چھوڑیے۔ اس طرح کی باتوں سے یہی دونوں
خوب نبٹتے ہیں۔

اس کے بعد مجھے یہ کہنا ہے کہ اب تک جتنی بات کہی گئی ہے وہ بطور تمہید کے تھی تمہید
سے نفسِ مضمون تک پہنچنے کا راستہ ہموار اور فاصلہ کم رہ جاتا ہے، یا فاصلہ طویل ہو جائے تو مضائقہ
نہیں سفر آسان ہو جاتا ہے، لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ فاصلہ اب بھی زیادہ ہے اس لیے ایک
دوسری تمہید بہ شکل ایک حادثہ کے گوش گزار کرتا ہوں وہ یہ کہ اس سال کرسمس میں ہماری یونیورسٹی
میں دو واقعات ''آل انڈیا'' قسم کے ہوئے، یعنی یکے بعد دیگرے آل انڈیا فلاسفیکل کانگریس اور
آل انڈیا میتھ میٹکل کانفرنس کے جلسے ہوئے۔ کرسمس میں جیسا کہ آپ جانتے ہیں اس ملک کی فضا

''آل انڈیا'' ہو جاتی ہے۔ آل انڈیا ایک قومی تخلص ہے جو ہر بحر میں موزوں ہو جاتا ہے، بہت سے شاعر اپنے تخلص کی رعایت سے شاعری کرتے ہیں، لیڈر اسی تخلص سے اس زمانہ میں شاعری کرتے ہیں یا یوں سمجھ لیجیے کہ آل انڈیا ایک طرح کا مشہور و مجرب چینترا ہے جس پر ہر عمر، صحت، حلیہ یا سرشت والا قادر ہوتا ہے اور جو ہر طرح کی جنگ یا شکست کے لیے موزوں ہی نہیں بلکہ لازمی ہے۔

عجیب اتفاق کہ عمر خیام اور باتوں کے علاوہ زبردست ریاضی داں اور فلسفی بھی تھا، لیکن ابھی تمہید باقی ہے اس لیے آپ تھوڑے سے اور صبر سے کام لیں، میں بھی شرافت کا سرشتہ ہاتھ سے نہ دوں گا۔ تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ تمام ہندوستان کے بیش تر جید فلسفی اور ریاضی داں علی گڑھ میں جمع ہوئے تھے (اور ہاں بعض لوگ ریاضی داں کو ریاضی وان کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں ممکن ہے اس سے علیت سے زیادہ ظرفیت پر زور دینا مقصود ہو) اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہر فن کا کامل اور ماہر طبعاً فلسفی بن جاتا ہے۔ چنانچہ ریاضی ہو یا فلسفہ، سائنس ہو یا شاعری، ان کے پہنچے ہوئے لوگ بالآخر فلسفی ہو جاتے ہیں ''خبرش باز نہ آمد'' کا حادثہ یہیں سے شروع ہو کر یہیں ختم ہو جاتا ہے!

چنانچہ ان فلسفیوں کو دور سے دیکھنے، قریب سے بھانپنے اور ان کے ساتھ کھانے پینے کا مجھے موقع ملا۔ اگر پہلے سے نہ معلوم ہوتا کہ سابقہ فلسفیوں سے ہے تو میں ان کو پہچان نہ سکتا، اس لیے کہ وہ بالکل ہمیں آپ جیسے تھے سوائے اس کے کہ یا تو کھاتے وقت بات نہ کرتے یا بات کرتے وقت کھانے لگتے۔ مخاطب کو اکثر بھول جاتے، اور کوئی نہ ہوتا تو اپنے آپ کو کھو بیٹھتے۔ اچھے شعرا کے بارے میں فلسفیوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے زمانہ سے سو سال پہلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ بڑے شعرا فلسفیوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ فلسفی بھی دراصل شعرا ہی کی ایک قسم ہے۔ البتہ وہ پیدا نہیں ہوتا تہ نشیں رہتا ہے!

اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فلسفیوں کے ساتھ رہنے سے مجھ پر کیا اثر ہوا ہے اور عمر خیام کا حشر میرے ہاتھوں کیا ہوگا۔ چنانچہ سوال یہ ہے کہ آج عمر خیام ہوتا تو کیا ہوتا۔ بغیر سوچے سمجھے صحیح جواب تو یہ دیا جا سکتا ہے کہ چوں کہ وہ شاعر بھی تھا اور فلسفی بھی، اس لیے یا تو کسی مشاعرہ میں شرکت کرنی پڑتی اور معاوضہ پر جھگڑنا پڑتا، یا اس کو فلاسفیکل کانگریس و میتھ میٹکل

کانفرنس میں داخل کیا جاتا اور مجھ سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ بہت ممکن ہے اسے ریڈیو پر تقریر کرنے کی دعوت دی جاتی اور مجھے اس ذمہ داری سے سبک دوش ہونے کا موقع ملتا جو اس وقت مجھ پر عائد ہے۔ اس طور پر آپ کو اس فکر سے بھی نجات ہو جاتی کہ کس بات پر ہنسیں اور بے وقوف نہ بنیں اور کس بات پر غور کریں اور فلسفی نہ کہلائیں۔

عمر خیام کا عام تصور یہ ہے کہ رند لاابالی تھا۔ شب و روز مست و سرشار پڑا رہتا تھا۔ اِدھر اُدھر کچھ پیالے، صراحیاں اور شراب کے ٹوٹے پھوٹے برتن ہیں اور وہ اسی عالم میں جو کچھ بک جاتا ہے وہ رباعی بن جاتی ہے۔ خدا کا شکر تھا، دنیا کی بے ثباتی کا جتنا دل نشیں نقشہ کھینچتا تھا اس سے زیادہ کھانے پینے اور عیش کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر ہے کہ ہم سب مغربی مصنفین بالخصوص فٹز جیرلڈ کے واسطہ سے آشنا ہوئے اور خیام کو جس رنگ و آہنگ یعنی شراب و ساقی کتاب و رباب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہی ہمارے ذہن و دماغ میں رچا ہوا ہے۔
لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ طبیب، ادیب، شاعر، ریاضی داں، قاری، صوفی ہونے کے علاوہ مسلمان تھا اور خدا رسول کا قائل، وہ نماز پڑھتا تھا، فریضۂ حج بھی بجالایا تھا، مغفرتِ الٰہی کی دعا بھی اس نے بار بار مانگی ہے، جزا و سزا اور بہشت و دوزخ کے بارے میں بھی اس کے وہی خیالات تھے جو دوسرے حکمائے اسلام کے ہیں اس کی وفات کے بارے میں ایک فاضل نے بتایا ہے۔

بوعلی سینا کی کتاب ''الٰہیاتِ شفا'' کا مطالعہ کر رہا تھا، جب واحد اور کثیر کی بحث پر پہنچا تو اس پر یہ اثر ہوا کہ بیچ میں خلال رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا، لوگوں کو بلا کر وصیت کی، پھر نماز پڑھی، اس درمیان میں نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ آخر عشا کی نماز پڑھ کر سو رہا اور سجدے میں بار بار کہتا تھا ''خدایا تو جانتا ہے کہ میں نے اپنی امکان بھر تجھ کو پہچانا، تو مجھے بخش دے کہ میری یہی پہچان تیرے دربار میں میرا وسیلہ ہے۔'' یہ کہہ کر یہ طوطیِ خوش نوا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

خیام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سرسری طور پر اس کے بعض بنیادی تصوّرات اور معتقدات بھی آپ کے سامنے پیش کر دیے جائیں۔

خیام بالکل وہ نہ تھا جو عام طور پر وہ مشہور ہے۔ وہ متکلم حکیم بھی نہ تھا اور نہ فلسفی یا اسمٰعیلی حکیم، اگر تھا تو صوفی حکیم، اسی طریقہ کو وہ پسندیدہ اور صواب جانتا تھا، یہاں ایک بات اور یاد رکھنی

چاہیے کہ تصوّف کی دو قسمیں ہیں ایک مذہبی تصوف دوسرا فلسفیانہ تصوّف، مذہبی تصوّف سے مراد مذہبی روح یعنی اخلاص ومحبت زہد وتقویٰ، عبادت وغیرہ ہے، اس کے پیرو کوئی خاص عقیدہ نہ رکھتے تھے، فلسفہ سے ناآشنا تھے۔ ان کا مشغلۂ زندگی فرائضِ مذہبی، اخلاصِ عمل اور خلق کی خدمت تھا، دوسری قسم فلسفیانہ تصوّف کی اس سے مراد الٰہیات کے متعلق حکیمانہ خیالات رکھنا اور فلاسفہ کی طرح خشک زندگی اختیار کر کے ان کی اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنا ہے، پہلے تصوّف کا مرکز خیال نبوّت ہے، یعنی وہ شخصیت کاملہ جو سنّتِ عادلہ لے کر دنیا کے امن ونظام کو قائم کرتی ہے اور اہلِ دنیا کو ملوثاتِ دنیا سے پاک کر کے حق تعالیٰ کی طرف دعوت دیتی ہے اور وہ روحانی قوتوں سے تائید پاتی ہے۔

دوسری طرف فلسفیانہ تصوف ہے جس کا مرکز حکمت ہے۔ جس میں فلاسفہ اور حکما کے احوال کی پیروی کی جاتی ہے، خیام کا تصوف مذہبی نہیں بلکہ حکیمانہ تھا۔ اس کے سامنے انبیاء کے احوال نہیں بلکہ حکما کے حالات تھے مختصر یہ کہ خیام کا مشرب ومسلک فلسفیانہ تصوّف تھا اور وہ خود ایک صوفی حکیم تھا، اس کا عقیدہ ملّتِ اولیٰ (First cause) یا خدا پر تھا جس کو وہ خیرِ محض سمجھتا تھا، وہ کمالاتِ انسانی کی انتہا معرفت کو سمجھتا تھا جس کا اقرار اس نے مرتے وقت تک کیا، معرفت کا راستہ خیام کے نزدیک ریاضت ہے، خیام جبر کا قائل ہے، اس کا جبر مذہبی استدلال پر نہیں بلکہ فلسفیانہ دلائل پر مبنی ہے، خیام جس زہد وپاکیزگی کی دعوت دیتا ہے وہ بھی مذہبی نہیں بلکہ یونان و اسکندریہ کے زاہد خشک فلاسفروں کی تعلیم کے مطابق ہے وہ گناہ یا رذائل سے پرہیز جنت کے حصول یا خدا کے لیے نہیں بلکہ عفتِ نفس کے لیے کرتا ہے، جس کی تکمیل علوم عالیہ اور اخلاقِ فاضلہ کے حصول سے ہوتی ہے اسی طرف وہ ایک رباعی میں اشارہ کرتا ہے:

روزے کہ جزائے ہر صفت خواہد بود — قدر تو بقدرِ معرفت خواہد بود!

در حسنِ صفت کوش کہ در روزِ جزا — حشر تو بہ صورتِ صفت خواہد بود [1]

---

1 ترجمہ: اس روز (روزِ قیامت میں) ہر اچھائی کی جزا ملے گی اور تمہاری قدر تمہاری پہنچ کے حساب ہوگی۔ اپنے اندر اچھی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرو، اس لیے کہ تمہارا انجام تمہاری خوبیوں کے مناسب ہی ہوگا۔

خیام پر شراب خواری کی تہمت بھی عام ہے اور غالباً یہ اسی تہمت کا تصرف ہے کہ خیام عام نظروں میں ملحد ولذت پرست قرار دیا گیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ خیام کے سخت سے سخت دشمن نے بھی اس کو شراب خواری سے ملوث نہیں کیا ہے۔ صرف رباعیات کی بنا پر جن میں بہت سی مشکوک الاصل ہیں، خیام کو شراب خوار نہیں قرار دیا جاسکتا، تحقیقات سے پتہ لگایا گیا ہے کہ جن رباعیوں میں شراب سب سے زیادہ تیز وتند ہے وہ تمام تر مشکوک ہیں یعنی خیام ان کا مصنف نہیں۔

بہر حال خیام کی شراب کیا ہے اور کیسی ہے ایک طویل بحث کی محتاج ہے جس کا یہ موقع نہیں، البتہ ایک جگہ خیام نے اپنے اس مسلک کا اظہار بڑے بلیغ انداز میں کیا ہے یعنی ۔

مے خوردنِ من نہ از برائے طرب است

نہ زبہرِ نشاط و ترکِ دین و اُدب است

خواہم کہ دمے ز خویشتن باز دہم

می خوردن و مست بودہم زاں سبب است [1]

ممکن ہے یہاں پہنچ کر آپ کا ذہن غالب کے مشہور شعر کی طرف منتقل ہو:

مے سے غرض نشاط ہے کس رُو سیاہ کو

اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ آج موجود ہوتا تو کیا کرتا یا کیا کہتا، آیئے تھوڑی دیر کے لیے فرض کرلیں کہ کسی اخبار کے نمائندہ نے خیام سے انٹرویو کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے۔

سوال: آپ کی رباعیات بہت مشہور ہیں، اس کا کیا سبب ہے کہ آپ نے ارشاداتِ عالیہ کے لیے رباعی کا وسیلہ اختیار کیا؟

خیام: بات یہ ہے کہ جس طرح آج کل یا اب سے کچھ عرصہ پہلے آپ کے یہاں غزل گوئی شاعری کی زبان قرار پا گئی تھی اور بڑی حد تک اب بھی ہے۔ اسی طرح ہمارے زمانہ

---

1 میرا شراب پینا کسی خوشی کے حصول کے لیے نہیں ۔ یہ نہ سرشاری کے لیے ہے اور نہ دین اور ادب کو ترک کرنے کے باعث۔

میں رباعی شاعری کی زبان بن گئی تھی۔ رباعی کو ترانہ بھی کہتے ہیں۔ بچوں اور عورتوں کو یہ لحن بہت پسند تھا۔ آپ کو غزل میں یہ سہولت ہے کہ ایک ہی شعر میں ایک مستقل خیال نظم ہو جاتا ہے اور ہر شعر میں آپ مختلف جذبات کا اظہار کر سکتے ہیں، اسی طرح ہر طرح کے جذبات یا مسائل ہمارے زمانہ میں رباعی میں ادا ہو جاتے تھے دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے کے لیے فرصت اور اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لوگ متحمل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ کم سے کم وقت میں بہتر سے بہتر بات جس آسانی اور لطف سے غزل گو کہہ جاتے ہیں ہم لوگ رباعی کہتے تھے، گو رباعی کہنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ غزل ہمارے زمانہ میں رباعی کو وہی قبولِ عام نصیب تھا جو اس زمانہ میں غزل کو ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ غزل گوئی کی جیسی مٹی اردو میں تباہ ہوئی ہے یا خود غزل نے جیسی مٹی آپ کی تباہ کی ہے ان سے رباعی کا دامن آلودہ نہیں ہے۔

یہاں پہنچ کر نامہ نگار نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا ''کیوں پیر و مرشد آپ کو مے خانے، شراب، ساقی، کوزہ اور اس قسم کے لوازمِ مے خانہ مے گساری سے اس درجہ شغف کیوں ہے کہ آپ ان کے بغیر آگے بڑھتے ہی نہیں؟'' خیام نے جواب دیا۔ ''آپ نے صحیح فرمایا، لیکن آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ میں ان سے پینے کا نہیں مطالعہ کا کام لیتا ہوں، مے خانہ میرے نزدیک دنیا کا خلاصہ ہے۔ میں دنیا کے ہر نشیب و فراز کی تفسیر مے خانہ سے کرتا ہوں آپ نے اپنے ایک عارف شاعر کا شعر سنا ہوگا:

یہی تھوڑی سی مے ہے اور یہی چھوٹا سا مے خانہ
اسی سے رند رازِ گنبدِ مینا سمجھتے ہیں!! [1]

اصل یہ ہے کہ شاعر کی شراب، شرابی کی شراب نہیں ہوتی، وہ شاعر کی دعائے مغفرت بھی ہے اور نعرۂ تکبیر بھی۔ شراب کا کمزور پہلو یہ ہے کہ اس سے آدمی فشارِ ذہنی کا خوگر نہیں ہونے پاتا، اور بجائے اس لذت کے جو سعی عمل کا نتیجہ ہو وہ سستے اور عارضی سکر و سکون کا دلدادہ بن جاتا ہے، شراب انسان کو ریاضت سے باز رکھتی ہے۔ حالاں کہ ریاضت ہی وہ چیز ہے جو خیال و تجربہ دونوں کو

متوازی و متوازن رکھتی ہے، جو جذبات کو ہموار اور ارادہ کو استوار کرتی ہے جو انسان کو مستعد و محکم اور اس کی فتوحات کو لازوال بناتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا آج کل کی جدید ترین اردو شاعری میں لذتیت کا یہی سستا فرومایہ اور عارضی سکر و سکون پایا جاتا ہے۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ انسان کو زندگی اس لیے نہیں دی گئی ہے کہ وہ اس کو روزگار نہ پائے تو اپنے کو کھو دے۔ زندگی کو انسان نہیں بخشا گیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے آدمی کو ملتی جلتی رہے۔ بلکہ انسان کو زندگی دی گئی ہے کہ وہ اسے موڑے بنائے۔ محکم و آراستہ کر کے ایسی باتیں بغیر ریاضت اور احتسابِ نفس کے ناممکن ہیں اور یہی چیز آج کل کی جدید اردو شاعری یا جس نے ابھی تجربہ کی منزل پوری نہیں کی ہے مفقود ہے۔

نامہ نگار نے سوال کیا: ''موجودہ اردو شاعری و ادب کے تکنیک (وسیلۂ پرداخت) سمبالزم (علامات) اور اس کے مقاصد و مستقبل کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟''

خیام: حضرت پہلی بات اور اصلی بات تو یہ ہے کہ زندگی صرف شباب یا بے دلی کا نام نہیں ہے۔ آپ کے جدید شعرا زندگی کی تلخیوں یا بر ہنگیوں کو پیش ہی اس لیے کرتے ہیں کہ ان کی کج روی، یا کمزوری کو معاف کر دیا جائے وہ علاج کے متلاشی نہیں ہیں، بد پرہیزی کرنا چاہتے ہیں۔ اچھا شاعر زندگی کی عکاسی نہیں کرتا وہ زندگی کی رہبری کرتا ہے۔ آرٹ اظہار یا اعلان کے مخصوص انداز کو کہتے ہیں، لیکن یہ شعرا اس مخصوص انداز کا جواز نفس کے احتساب میں نہیں بلکہ نفس کے مطالبات میں ڈھونڈھنا پسند کرتے ہیں۔ آپ کے اس دور میں اختیار کو جو آزادی دی گئی ہے اس نے احتراز کی گرفت کو بہت زیادہ ڈھیلا کر دیا ہے اور یہی سبب ہے کہ آج جو چیز ہم اختیار کرتے ہیں دوسرے ہی دن اسے ناقص یا نامکمل پا کر ترک کر دیتے ہیں۔ آپ کے ہاں شعر و ادب کے اسالیب جو جلد جلد بدلتے رہتے ہیں اس کا سبب بھی یہی ہے۔

اردو شاعری کا موجودہ تکنیک سے انحراف کرنا کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے، لیکن محض تکنیک کا نیا ہونا بھی کوئی بڑی بات نہیں تاوقتیکہ اس میں اس کی صلاحیت نہ ہو کہ وہ اچھے شعر کہنے اور اچھے خیالات کو اچھے طور پر ڈھالنے میں معین ہو اگر موجودہ اصنافِ سخن میں بعض

نئے اصناف کا اضافہ ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس صنف میں بعض وہ خامیاں ہیں جو اردو غزلوں میں بھی ہیں مثلاً باوجود اس کے سخت مجازی ہونے کے اس میں خیال بندی کا وہ شدید التزام ملتا ہے جس نے اردو کے بعض نامور شعرا کو بدنام کر دیا ہے پھر یہ بھی ہے کہ بعض سخت بندشوں کی وجہ سے غزل میں جو تعقید لفظی یا معنوی پیدا ہو جاتی تھی اس کو شاعری کے جدید اسلوب میں نہ ہونا چاہیے کیوں کہ غزل کی بندشوں اور پابندیوں سے جدید اردو شاعری اپنے آپ کو آزاد کر چکی ہے اس لیے اس میں وہ نقائص بھی نہ ملنے چاہئیں جو اردو شاعری کے قدیم اسکول میں ہیں۔

اس کے علاوہ سمبالزم جو مفہوم کی دل نشینی، جامعیت اور وضاحت میں معین ہوتی ہے اردو میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے۔ اس کی حیثیت سکۂ رائج الوقت کی ہے، جدید شاعری میں سمبالزم بہت ہی گنجلک اور پراگندہ ہے۔ اس پر وہ ٹھپہ نہیں جس سے اس کی قدر و قیمت ہی نہیں بلکہ اس کا مفہوم ہی متیقن ہو سکے۔ پھر سمبالزم کو ایسے مقام یا ایسے واقعات سے اخذ کرنا چاہیے جو بجائے خود واضح ہوں اور اپنی وضاحت خود کرتے ہوں نہ یہ کہ جس کھوٹے کھرے کو چاہا چلن میں لائے اس سے بازار میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ صرّاف کی ساکھ گھٹتی ہے اور مال جہاں کا تہاں رہ جاتا ہے اس شاعری کا مقصد میں پہلے بتا آیا ہوں۔ رہا اس کا مستقبل اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا سوا اس کے کہ جب تک اس فن کا کوئی حالی نہ پیدا ہوگا اس میں کسی اقبال کے پیدا ہونے کا امکان نہیں اور میرے نزدیک دنیا کا کوئی ادب، ادب کہے جانے کے قابل نہیں تاوقتیکہ اس میں حالی اور اقبال نہ جنم پا چکے ہوں۔

نامہ نگار نے سوال کیا: ''جناب والا زیرِ بحث شاعری کے پیرو جدید طرز کی نظموں کو غزل کا بدل قرار نہیں دیتے اور نہ غزل کو اپنا حریف سمجھتے ہیں۔ اس لیے غزل کی روشنی میں ان نظموں کا جائزہ لینا درست نہیں۔''

عمر خیام: آپ نے صحیح فرمایا۔ میں نے یہ باتیں برسبیلِ تذکرہ کہہ دیں، لیکن غزل کی جو گرفت اس وقت خاص و عام کی تخیل پر ہے اس کو ڈھیلا کرنے کے لیے ظاہر ہے آپ کو ایک ایسی صنفِ سخن بروئے کار لانی پڑے گی جو غزل کا بدل ہو سکے۔

نامہ نگار: معاف فرمایئے گا قطع کلام ہوتا ہے۔ آخر اس کی ضرورت کیا ہے، غزل اپنی جگہ پر اور یہ اپنی جگہ پر۔ اس میں کیا قباحت ہے؟

عمر خیام: کوئی قباحت نہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جو چیز پیش کی جارہی ہے، اس کی حیثیت کیا ہے یا آپ اس کو کیا حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ اگر یہ چیز محض ضمنی اور تفریحی ہے تو پھر کوئی بحث نہیں اگر آپ یہ چاہتے ہوں کہ قوم کا مذاق و مزاج بدل دیں یا قوم کا مزاج و مذاق کسی نئی چیز کا طلب گار ہے تو پھر آپ کو اس بات کا پتہ لگانا چاہیے کہ وہ کون سے عناصر ہیں جن سے قوم کا مزاجِ شعری بنا ہے۔ ہر قوم کا مزاجِ شعری جداگانہ ہوتا ہے اور اسی مزاجِ شعری کے مطابق ہر قوم مخصوص صنفِ سخن کا اپنے لیے انتخاب کرتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ غزل آپ کی افتادِ شعری کی ترجمانی شروع سے آخر تک کرتی رہی ہے اور چوں کہ اس میں بہت کافی وسعت، رنگارنگی، لچک اور لطافت ہے اس لیے زمانہ کے رجحانات کے مطابق اس کے اسالیب بدلتے رہیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھیے کہ بغیر اس کی آمیزش کے آپ کا کوئی اُسلوبِ سخن وہ مزہ نہیں دیتا جس کے آپ خواہش مند رہتے ہیں۔

نامہ نگار نے اُکتا کر سوال کیا: ''اگر سوءِ ادب نہ ہو تو یہ عرض کرنے کی جرأت کروں کہ یہ جنگ عظیم کیا ہے، کیوں ہے اور کیا انجام ہونے والا ہے؟''

خیام نے مسکرا کر جواب دیا: ''ماشاءاللہ آپ نے تو اظہارِ مطالب کے لیے رباعی سے بھی زیادہ مختصر پیمانہ وضع کر لیا۔ لڑائی کے زمانہ میں لڑائی پر رائے زنی نہیں کرتے بلکہ لڑائی کی تیاری میں مصروف ہوتے ہیں۔ یہ جنگِ عظیم کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی کارکردگی کا امتحان ہے، یعنی انسان اپنی ترقیوں کے فشار کا خود متحمل ہوسکتا ہے یا نہیں۔ کیوں ہے؟ اس لیے کہ ہونا چاہیے تھا، زندگی ہمیشہ اپنی قدروں کو تولتی پرکھتی رہتی ہے۔ کیا انجام ہونے والا ہے؟ اس کا حال اس سے پوچھیے جو اس کے انجام سے دلچسپی رکھتا ہو۔ میں تو صفِ جنگ میں کھڑا ہو کر سوال نہیں کرتا حملہ کرتا ہوں یا حملہ سہتا ہوں۔ انھیں دونوں کا حاصل اپنا انجام نہیں انعام سمجھتا ہوں۔ سنا ہے کہ نہیں

'زہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند!

خیام کے تیور اس وقت کچھ ایسے نظر آئے کہ نامہ نگار معمولی مراسمِ اخلاق بھی بجا نہ لاسکا اور اپنی جان لے کر بھاگا، اور واقعہ یہ ہے کہ میں بھی آپ سے کچھ اسی طرح رخصت ہونا چاہتا ہوں۔

(اس تقریر میں خیام کے معتقدات خصوصی علامہ سید سلیمان ندوی صاحب بالقابہ کی عالمانہ تصنیف خیام سے ماخوذ و منقول ہیں) رشید احمد صدیقی

(مطبوعہ' آج کل'۔ فروری 1942)

●●●

کیسے کہوں کہ باز آیا محبت سے

سوال یہ ہے کہ میں کیسے کہوں کہ محبت سے باز آیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں محبت سے باز نہ آیا تو آپ میرا کیا کرلیں گے؟ ظاہر ہے اس جواب سے آپ مطمئن نہ ہوئے ہوں گے خائف یقیناً ہوں گے۔ اسے جواب نہیں شامت کہتے ہیں، ایسی شامت جس میں مبتلا ہونے والے نہ عاشقی سے باز آتے ہیں اور نہ شوہری سے شرماتے ہیں۔ اس سوال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ میں محبت سے کیسے باز آؤں جب محبت مجھ سے باز نہیں آتی اسے شامت ہی شامت کہتے ہیں۔ یعنی شامت برائے شامت، ادب اور زندگی اس کے علاوہ ہیں، لیکن ذرا ٹھہریے ابھی میری شامت اور آپ کی سعادت مندی کو اور بہت سے مراحل طے کرنے ہیں، رواداری کی خاطر نہ سہی ریڈیو کی خاطر سہی۔

محبت سے باز آنے کا ارادہ میں نے کسی حادثے کی بنا پر کیا ہے یا محض سن و سال کے تقاضے سے مجبور و مرعوب ہو کر یا اخلاق و افلاس کی بنا پر اس کا فیصلہ تو آپ فرصت سے کرتے رہیے گا فی الحال مجھے ایک اعتراف کرنے دیجیے جس پر میرے نزدیک ازل سے محبت اور اس سے باز آنے نہ آنے کا مدار چلا آرہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ دنیا میں بے غرض و بے مقصد کچھ بھی نہیں! اگر ہے تو بس اتنا اور ایسا کہ اس سے میرے اصول کو کچھ اور زیادہ تقویت پہنچتی ہے۔

یہ بات میں نے صرف برائے بیت نہیں کہی ہے گو برائے بیت کا بھی ایک مقصد ہوتا ہے اور کبھی کبھی یہ بڑے آڑے وقت کام آتا ہے۔ غرض و مقصد کا مسئلہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے خواہ

غرض و مقصد خود کتنے ہی واضح کیوں نہ ہوں یہ مسئلہ جتنا مختلف فیہ ہے اس کا مجھے آپ سے کچھ کم احساس نہیں ہے۔ خاص طور پر جب محبت جیسی جذباتی چیز کی فنی حیثیت زیرِ بحث ہو! ممکن ہے آپ کو مجھ سے اختلاف ہو۔ محبت میں یوں بھی اختلاف ہو جایا کرتا ہے۔ میں اختلاف کی قدر کرتا ہوں، اکثر مجھے اپنے آپ سے اختلاف کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے اور مجھے یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ اس اختلاف میں مجھے شکست ہوئی ہے اور اپنے آپ کو فتح۔ بہرحال میرا عقیدہ یہ ہے کہ مخلصانہ اختلاف، منافقانہ اتفاق سے کہیں زیادہ دلچسپ اور مفید ثابت ہوتا ہے۔

یہاں سوال محبت کے مقصد یا انجام کا نہ تھا۔ میں مانتا ہوں کہ میرے اور آپ کے علاوہ مقصد و انجام کے کاروبار میں بہتیرے منہ دکھانے کے قابل نہ رہ گئے ہوں گے اور ان میں ایسے لوگ بھی یقیناً شامل ہوں گے جن کا منہ یوں دیکھنے میں خاصا دیدارو ہوگا۔ اس سلسلہ میں آپ نے بہت سے اصول پڑھے، سنے یا سوچے ہوں گے اور اس ذہنی قرنطینے کے دوران میں آپ کو کچھ شاعروں یا تھانے داروں کی صحبت بھی نصیب رہی ہوگی تو محبت کے بارے میں آپ نے کوئی نہ کوئی رائے بھی ضرور قائم کی ہوگی جو پچاس فی صدی صحیح ہوگی۔ البتہ جو بات آپ کی سمجھ میں نہ آئی ہوگی اور میری سمجھ میں تو بالکل نہ آئی وہ یہ کہ محبت جس کی اجارہ داری شاعروں نے لے رکھی ہے اُس محبت سے اتنی مختلف کیوں ہے جس کا رواج بھلے مانسوں میں ہے۔ ممکن ہے محبت دونوں صورتوں میں یکساں ہوتی ہو فرق صرف اس رویّہ کا ہو جو بھلے مانسوں کو شاعروں سے علاحدہ کرتی ہے اور رکھتی ہے۔

انجام یا مقصد کے بارے میں ایک بات اور گوش گزار کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ذاتی طور پر میں محبت ہی نہیں بے غرضی تک کو مقصد سے علاحدہ نہیں دیکھ سکتا۔ یوں میں فن برائے فن کا قائل ضرور ہوں اور اسے ایک خاص قسم کی فنی معراج بھی سمجھتا ہوں، لیکن اس کے باوجود میں کسی ایسے فن سے واقف نہیں جس کی پرداخت خلا میں ہوئی ہو اور جو محض خلا سے سروکار رکھے! میرا عقیدہ تو یہاں تک ہے کہ خود روحانیت ایک ہیئت ہوتی ہے اور سمت و رفتار بھی! افضل و اعلیٰ روحانیت مادّہ ہی کی پُرخلوص تعبیر اور اُسی کو برتنے، ترتیب دینے سے پیدا ہوتی ہے اور ایک ٹھوس حقیقت کی طرح پہچانی ہی اس طرح جاتی ہے کہ اس کی جبر کی قوت کتنی ہے اور کیا کچھ اس کے

حلقۂ اثر میں ہے، اسی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ فن کتنا ہی سیال اور اَن گڑھ کیوں نہ ہو، امامِ فن اُسے ایک خاص شکل اور رفتار دے کر ایک خاص سمت میں ڈال دینے سے باز نہیں آتا۔ اُسے آپ اخلاق و مذہب کہیں یا حسن شناسی و حسن آفرینی فن ہمیشہ لوہے کے بُرادے کی طرح اس مقناطیس سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہے جسے غایت کہتے ہیں اور جو زمینی مقناطیس کی طرح اس عظیم الشان زندگی کا مرکز ہے۔ محبت اُسی مقناطیس کا نام ہے جو فن کو غایت سے اور زندگی کو مقصد سے مربوط اور متصل رکھتا ہے۔ فن اور غایت کا یہ رشتہ جب کبھی ناہموار اور ناموزوں نظر آئے، سمجھ لیجیے کہ معاملہ محبت کا نہیں بوالہوسی کا ہے۔

محبت اور بوالہوسی کے اسی اصول پر خود محبت کے دو پہلو ہو سکتے ہیں، اور ہیں۔ یعنی خلوص اور عاشقی۔ خلوص وہ جسے غرض ہی نہیں جواب کی بھی طلب نہیں ہوتی اور عاشقی وہ جو غرض نہ بھی چاہے تو بھی جواب کی متمنی ضرور ہوتی ہے۔ ایک کی نظر اپنے سے باہر کسی شخص یا چیز پر ہوتی ہے دوسرا خود اپنا انعام ہے۔ یہ خلوص اور عاشقی ہی کے بارے میں کہا گیا ہے۔ ''دوست یاں کم ہیں اور بھائی بہت'' اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عاشقی مخلص نہیں ہو سکتی یا خلوص میں عشق کی شان ناپید ہے۔ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ ایک سے میں جتنا باز آنا چاہتا ہوں اتنا ہی دوسرا خود مجھ سے باز آنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے، لیکن یہ مصیبت صرف میری نہیں ہے۔ سنتے ہیں خلوص کا یہ کال عالم گیر ہے اور خلوص کا جتنا کال ہے عشق کی اتنی ہی افراط۔ اوسط کچھ یوں پڑتا ہے کہ حسن ایک تو عشق ہزار اور اب تو خود عشق کو بھی حسن کا دعویٰ ہونے لگا ہے جسے خودداری کہتے ہیں اور جس کے بارے میں غالب نے کہا:

واں وہ غرور و عزّ و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں! [1]

اب آپ ہی سوچئے کہ جب محبت کی اوقات راہ میں ملنے یا بزم میں بلائے جانے پر منحصر ہو اور یہ منصب بھی اس عشق نما حسن نے چھین لیا ہو تو ایسی محبت سے باز آنے کے علاوہ بندہ بے چارہ کو اور چارہ ہی کیا! چنانچہ انجام وہی ہوتا ہے جو عشق و محبت میں ہر نیاز مند کا ہونا چاہیے اور ہوتا چلا آیا ہے یعنی اکثر شادی ورنہ بیزاری!

---

1 مرزا غالب۔

شاعری کے بارے میں تو کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے بقول شخصے ؎

اگلے وقتوں کی ہے یہ چیز اسے کچھ نہ کہو [1]

لیکن جہاں تک بیزاری کا سوال ہے، محبت کے سلسلے میں اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں، بیزاری کا فارمولا یہ ہے کہ انسان من حیث النوع اشرف المخلوقات ہو یا نہ ہو ہم خود مرکزِ کائنات ضرور ہیں اور چوں کہ مرکزِ کائنات ہیں اس لیے حاصلِ کائنات بھی ہوئے اور حاصلِ کائنات ہونے کی حیثیت سے یہ حق مسلّم ہے کہ کائنات چاہے دوسروں کی ہو حاصل ہمیں ہونی چاہیے۔ یہ فارمولا یوں تو بالکل ٹھیک ہے، لیکن اس تعبیر میں اک صورت خرابی کی ایسی مضمر ہے جس نے ایک طرف تو اس فارمولے کے چھکے چھڑا دیے ہیں اور دوسری طرف خود محبت کی عافیت خراب کر کے چھوڑی ہے۔

میں ہر انسان کے انفرادی طور پر مرکز یا مرکزِ کائنات ہونے کو بھی تسلیم کر سکتا ہوں اور کرتا ہوں۔ زندگی کے تمام راستے مختلف چھوٹے بڑے دائروں کی شکل میں دوڑتے رہتے ہیں اور حلقۂ نگاہ سے حدِ نظر تک دائروں کے اس لامتناہی سلسلہ کو میں نے بھی دیکھا اور محسوس کیا ہے اور اس اعتبار سے میں ہر انسان کو اس کا حصہ یا جیسا کہ انگریزی کی ایک مثل میں کہا گیا ہے شیطان کو اس کا حق دے سکتا ہوں، لیکن اپنے مخصوص چھوٹے بڑے دائرے کا مرکز و محور ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اور جتنے دائرے یا مرکز ہیں وہ ہمارے گرد طواف کرنے لگیں اور اس میں جو معترض یا محترز ہوں گردن زدنی یا بہ صورت دیگر ہم مجبورِ خودکشی ہوں۔ میں اس وقت محبت کو ان وسیع معنوں میں لے رہا ہوں جس میں دولت و شہرت سے لے کر حسن و عشق تک کے سارے مراحل آجاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی مصیبت یا لعنت یہی ہے کہ ہم اپنی آسانی اپنے مسائل اپنے مفروضے یا خواہش کو سب سے پہلے رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا کے اور تمام مسائل مفروضے یا خواہشات اسی محور پر گھومنے لگیں اور اسی کی مناسبت سے ترتیب و تنظیم پائیں!

آپ نے وہ واقعہ تو سنا ہوگا، ایک مفلوک الحال، شاعر صورت اور عاشق صفت یہ اعلان کرتے پھرتے تھے کہ ان کی شادی بادشاہِ وقت کی لڑکی سے ہونے والی ہے اور معاملہ پچاس فی صدی

---

1 پورا شعر اس طرح ہے:

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں مرزا غالب

طے ہے۔ کسی نے اس کی تشریح چاہی کہ اس حلیہ پر خطبۂ صدارت تعجب خیز تو نہیں ہے پھر بھی داستان دلچسپ ہے۔ آگے سناؤ کہ معاملات آخر یہاں تک پہنچے کس طرح تو بہ انداز راز داری و سرگوشی یہ فرمایا کہ پچاس فی صدی یعنی تقریباً آدھا معاملہ بالکل طے سمجھو اور بھئی آپ سے کیا چھپانا قصہ دراصل یہ ہے کہ معاملہ میرے اور شہزادی کے درمیان ہے۔ میں تو بالکل راضی ہوں صرف شہزادی کا رضامند ہونا باقی رہ گیا ہے! آپ اس حادثہ پر محض ہنس کر آگے بڑھ سکتے۔ یہ بات اس غریب سے منسوب ہو کر کتنی ہی مہمل کیوں نہ معلوم ہو آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہم میں سے ہر شخص محبت کے معاملے میں اسی قسم کے اشعار کا مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ محبت کا یہ یک طرفہ اور بے محابہ مطالبہ میں سمجھ تو سکتا ہوں، لیکن اس کی نہ تو تائید کر سکتا ہوں نہ اس سے ہمدردی۔ نام نہاد محبت کا یہ پہلو محض خود پرستی ہی نہیں ناانصافی اور تنگ نظری بھی ہے۔ دنیا اس قسم کی شاعری اور شورہ پشتی سے بالکل بے پروا ہو کر اپنی اس گردش میں مصروف رہتی ہے جسے عشق شاعری و نام آوری کے ناکام گردشِ روزگار کہتے ہیں اور زندگی کے فاتح ارتقاے جات۔

اچھے اور بُرے، بلند اور پست، حسین و قبیح میں امتیاز کر کے ایک سے محبت اور دوسرے سے نفرت کرنا انسان کا سب سے بڑا حق اور زندگی کا اعلیٰ ترین تصوّر ہے جس طرح عقل مندوں کے لیے کہا گیا ہے کہ ہر اچھی چیز ان کا کھویا ہوا سرمایہ ہے وہ اسے جہاں بھی دیکھتے اور پاتے ہیں اپنی ہی چیز سمجھ کر اُٹھا لیتے ہیں اسی طرح انسان کی عینیت و شرافت کا تقاضا ہے کہ جہاں کہیں بھی حسن و خوبی دیکھے خواہ گوشت پوست میں یا خیال و روح میں اسے اپنا لے اور اس کی حفاظت اور قدر و منزلت اور تقدیس میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھے، لیکن یہ ہوتا نہیں، ہوتا یہ ہے کہ اچھی چیز کو دیکھ کر اس کی قدر و حرمت سے پہلے انسان یہ سوچتا ہے کہ دوسروں کو اس سے کس طرح جلد از جلد محروم کر دیا جائے اور وہ حاصل اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ وہ اس چیز کا صحیح مرتبہ پہچانتا ہے اور اسے ٹھیک طور پر برت سکتا ہے بلکہ تحتِ شعور میں صرف رقابت کا جذبہ کام کرتا رہتا ہے کہ چوں کہ یہ چیز اچھی ہے، حسین ہے اور عام طور پر قابلِ قدر ہے اس لیے کسی اور کی بجائے صرف اس کے تصرّف میں آنی چاہیے اور اسی کی ملکیت ہونی چاہیے۔ ایک خود پسند حریص کی طرح وہ پسند کی ہوئی تمام چیزوں کا انبار پہلے لگا لینا چاہتا ہے اور اپنی یا دوسروں کی ضروریات کا خیال بعد میں کرتا ہے یا بالکل

نہیں کرتا! یہ مرضِ محبت کا سب سے بڑا خطرہ اور اس کی سب سے بڑی بدتوفیقی ہے، دنیا کی شامت۔ بہتر ہے کہ یہاں اچھی اور اعلیٰ چیزوں کی کمی یا فقدان ہے۔ دنیا میں سب کچھ موجود ہے اور ازل سے موجود چلا آتا ہے۔ ایسی چیزیں جن سے محبت کی جاسکتی ہے اور محبت کو لازوال مسرّتوں کا سرچشمہ بنایا جاسکتا ہے جس سے ابد تک سکون اور خوش دلی کی پھوار پڑتی رہے، لیکن یہ محبت، خودغرضی وخود پرستی سے نہیں، دل کشادگی و دل سوزی سے پیدا ہوتی ہے یہ کاروبار نہیں، ہنر کی دین ہے! خدا کی دین بھی۔

یہاں تک آپ نے محبت کی ان کرشمہ کاریوں کا مطالعہ کیا جن کا تعلق عشق وحسن سے محض بر بنائے شعر تھا۔ اب ذرا یہ بھی سنیئے کہ اس واحد متکلم فرزندِ آدم پر محبت جتانے کے بہانے اور اس کے واسطہ سے کیا گزرتی رہتی ہے مثلاً کسی نے میرے حال پر ترس کھانے اور ساتھ ہی اپنا حالِ زار سنانے کے بعد مجھ سے قرض کی فرمائش کردی۔ کوئی میرے ادبی کمالات کی شان میں رجزیہ پڑھ کر یا نیا مرثیہ، مجھ سے اپنے ''کلامِ بلاغت نظام'' پر مقدمہ لکھوانے پر مصر ہوا، اور کسی بزرگ کو کچھ اور نہ سوجھی تو میری خدمتِ خلق کا، قوم یا خدا کی طرف سے صلہ دینے کے بہانے، اپنی کسی اولادِ نرینہ کو میری شاگردی میں دے گئے یا اگر اُسے شاگردی کا شرف پہلے سے حاصل ہے تو فیس اور امتحانات کے انتظامات میری شفقت کے سپرد کر گئے۔

یہ مراحل تو جیسے کچھ ہیں، ظاہر ہیں، لیکن ان سب سے بڑھ کر ایک مرحلہ وہ ہوتا ہے جسے تمہید کہتے ہیں اور جو اس قسم کی عزّت افزائی سے پہلے ایک سپاس نامے کی شکل میں پیش کی جاتی ہے جس کو پڑھ کر یا سن کر نفس موٹا ہوتا ہو یا نہ ہو عقل ضرور ماری جاتی ہے اور بدحواسی کے اس عالم میں ان کی محبت اور اپنے خلوص دونوں کے آداب بھول کر میں جلد سے جلد اس طرح حامی بھر لیتا ہوں گویا جب تک وہ کام نہ کرلوں گا جسم و جان کا کوئی اختیاری یا اضطراری مطالبہ ادا نہ کروں گا۔ دراصل جب میں کسی ایسے بلائے جان سے پیچھا چھڑا کر بھاگ رہا ہوں اسی وقت آپ صحیح معنوں میں اندازہ لگا سکتے ہیں کہ محبت سے کس طرح باز آیا جاتا ہے۔ رہا گزرنے کا سوال تو بہر حال ''فرزندِ آدم'' ٹھہرا، جو کچھ پڑتی ہے وہ گزر ہی جاتی ہے ورنہ اس گزر چکنے کا اس وقت پورا پورا یقین ہونے کے باوجود —

''چٹکی سے مرے دل میں لیے جاتا ہے کوئی''

کہ میں ان خطرات سے محفوظ نہیں ہوں۔ محفوظ تو دنیا میں کوئی جگہ نہیں کیا عجب چلتے چلاتے اور کوئی نہیں تو یہ ریڈیو والے ہی ادھر اُدھر کی باتوں میں آئندہ کس دن کے لیے حامی بھرلیں اور سند کی یہ نوعیت ہو جائے۔ کیسے کہوں کہ باز آیا مشقت سے!

خیر ریڈیو کا اور میرا معاملہ تو پھر بھی درگزر کیا جاسکتا ہے، لیکن محبت کے اُن دم بھرنے والوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو شروع کسی چیز سے بھی کریں ختم ہمیشہ کسی نہ کسی ''عرضِ مطلب'' پر کرتے ہیں۔ بہر حال ان تجربات کی نوعیت ممکن ہے آپ کو کم، بیش تر ذاتی معلوم ہو، لیکن اس کا بھی خیال رکھیے کہ ذات کا مجموعہ صفات ہونا صوفیوں کی اصطلاح میں نہیں انسانوں کی ایک فتح بھی ہے جو اس نے کائنات پر حاصل کی ہے یہ اور بات ہے کہ ایک طرف تو میری تنہا ذات ہو اور دوسری طرف آپ کی ساری صفات!

آپ کو ''یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' ابتدائے گفتگو ہی میں میرے منہ سے نکل گیا تھا کہ میں محبت سے کیسے باز آؤں جب محبت مجھ سے باز نہیں آتی! بیچ میں بہت سی ''سخن گسترانہ'' باتیں آگئیں، میں بھی بھول گیا اور آپ نے بھی کہیں نہیں ٹوکا۔ بات جہاں کی تہاں رہ گئی کہ باز آیا محبت سے! مومن کا ایک شعر سنیے جو اس موقع پر شاید چسپاں نہیں ہوتا، لیکن اسے آپ کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں چسپاں کرنے پر مجبور ہوں گے۔ مفہوم شعر کا یاد رکھنا ہے مواقع تو آتے ہی رہتے ہیں۔

تو کیا کرتا　　　　کہ ہر ہر بات پر ناصح تمہارا نام لیتا تھا

(نشریہ۔ 25/نومبر 1942)

●●●

جینے کا سلیقہ

جینے کی عادت سب کو ہوتی ہے سلیقہ کسی کو نہیں ہوتا، جن لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سلیقے سے زندگی بسر کرتے ہیں دراصل وہ سلیقے سے جیتے نہیں، سلیقے سے کسی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ زندگی میں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہر شخص سلیقے سے کسی مرض میں مبتلا ہے اور یہ شاید ایسا مرض ہے جس میں مبتلا ہوئے بغیر زندگی کا پورا لطف حاصل نہیں ہوتا۔ ایک صاحب ہیں جو کھانا کھا ہی نہیں سکتے، جب تک وہ اور ان کا بیرا وقت اور کھانے کے مقررہ کپڑے نہ پہن لے، چاہے ان کو کھانے پر دیکھنے والا کوئی نہ ہو اور چاہے وہ ایسے مقام پر کیوں نہ ہوں جہاں بھولے سے بھی کسی شریف آدمی کا گزر نہ ہو سکتا ہو۔ میرے ایک دوست ٹینس ٹورنامنٹ میں فائنل تک پہنچ گئے۔ اتفاق سے فائنل ایسے شخص کے ساتھ کھیلنا پڑا جس کی پتلون چست اور صرف شرعی حدود تک لمبی تھی۔ پتلون جتنی صاف تھی قمیض اتنی ہی میلی۔ دوست نے فائنل کھیلنے سے انکار کر دیا اور محض اس بنا پر کہ جس شخص کو ٹینس کے کپڑے پہننے کا سلیقہ نہیں ہے، اس کے ساتھ ٹینس کھیلنا شریفوں کا کام نہیں۔ چنانچہ نہایت سلیقے اور شرافت سے واپس تشریف لائے اور حریف نے کپ جیت لیا۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہم زندگی کے بعض بڑے اہم مسائل میں بھی اکثر بے تکلف کوئی نہ کوئی ترمیم کر ڈالتے ہیں، لیکن فروعی مسائل میں بڑے اصرار سے لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں

مذہب و اخلاق کی بڑی سے بڑی قدروں کو منقلب کر دینے میں ہم کو تامل نہیں ہوتا، لیکن ہم لوٹے اور لٹیا میں خفیف سی ترمیم یا مصالحت گوارا نہیں کرتے۔ اسے ہم زندگی کا سلیقہ بتاتے ہیں۔ سلیقے میں جینے کے شاید یہ معنی ہیں کہ جس کام کے جو آداب مقرر ہوں ان کو زندگی میں اسی طرح سے برتا جائے کسی اور طرح سے نہیں۔ یہ بات ٹھیک ہو یا نہیں میرے نزدیک اس سے آدمی بھلے مانسوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں رہ جاتا۔ سلیقے سے جینے والے اکثر از کار رفتہ پائے گئے ہیں۔ ان کی زندگی ضرور طویل ہوتی ہے، لیکن وہ خوش مذاقوں کی اچانک موت کا اکثر باعث ہوتے ہیں۔ سلیقہ ہی برتتے برتتے زندگی مشن سے مشین بن گئی ہے۔

ہمارے مورث اعلیٰ جب تک جنت میں رہے اپنے سلیقے کی زندگی بسر کرتے رہے، ایک دفعہ چوک ہوگئی اور یہ دنیا وجود میں آگئی۔ یہ اچھا ہوا یا بُرا اس پر بحث کرنے کا مجھے سلیقہ نہیں اور موقع تو یقیناً نہیں ہے۔ البتہ اگر ہمارے جدِّ اعلیٰ واوّل سلیقے سے جنت ہی میں رہتے ہوتے تو آج ہم کو کسی پر مرنے کی سعادت کیوں کر میسّر آتی۔ ایسی سعادت شہادت پر بھی فائز کر دیتی ہے۔ بعض ایسے لوگ جن کو سلیقے سے سروکار نہیں، بتاتے ہیں کہ جینے کا ایسا بھی کیا سلیقہ کہ جس جنت سے جیتے جاگتے نکل گئے یا نکالے گئے وہاں کے لیے مرمر کے جئیں۔ یہاں پہنچ کر اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں خود مرنے لگا ہوں یہی نہیں بلکہ مجھے مرنے نہ دیا گیا تو مار بیٹھوں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا ذہن جنت کے خیال میں کچھ ایسا ڈانوا ڈول ہوا کہ تحریر و تقریر کا سلیقہ ہی جاتا رہا۔ ناچار میں نے سلیقے کا کوئی شعر یاد کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں ایسا شعر یاد کرنے کی فکر میں مبتلا ہوگیا جس میں سلیقے کا لفظ بجنسہٖ آیا ہو۔ چنانچہ میر کا یہ شعر سنیے:

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میر اور اس قبیل کے دوسرے بڑے شعرا کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ ذہن میں جو خیال آئے اس کے لیے ان کے برمحل اشعار مل جائیں گے میرا خیال ہے کہ میر تمام عمر سلیقے کے مرض میں مبتلا رہے جیسا کہ اس شعر میں انھوں نے خود اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے ناکامیوں کو محبت کرنے کا فن بنالیا۔ میر نے عاشقی میں اتنا سلیقہ نہ برتا ہوتا تو وہ محبت میں کبھی ناکام نہ رہتے۔ وہ

سلیقے سے نباہنے کے لیے طرح طرح کے سلیقے ایجاد کرتے تھے محبت کا کام بھی تو آخر کام کاج ہی ہوتا ہے۔ میر نے محبت کے کام کاج کو سلیقے کی شامت سے فن ہی نہیں فلسفہ بنا دیا اور آپ تو جانتے ہیں۔فلسفہ نام ہی ہے سلیقے کی ناکامی کا یا نا کامیابی کے سلیقے کا! وہ محبوب کو اپنانا چاہتے تھے، لیکن اپنانے کے بجائے صرف سلیقہ برتتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلیقہ ان کے حصے میں آیا اور محبوب کسی دوسرے کے حصے میں۔ وہ محبوب کی بے وفائی اور محبوب کی ہوس ناکی کے گلہ مندر ہے۔ ماہرینِ فن کا خیال ہے کہ محبوب کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہوتی کہ وہ میر کے سلیقے کا شکار ہو جاتا۔ رقیب کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ میر کے سلیقے کی کمزوری سے خوب واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شعرا یا میر جیسے عشاق مقدمہ جیتنے کے نااہل ہوتے ہیں اور نہ اس کے مستحق۔ وہ تو صرف اس کے درپے ہوتے ہیں کہ مقدمہ باز بہ نمبر سابق قائم ہوتا رہے۔ میر کو محبت سے محبت نہ تھی۔ ناکامی سے اُلفت تھی جس کو انھوں نے سلیقے کا نام دے رکھا تھا وہ فوجی نقل و حرکت کے دل دادہ تھے، لڑائی جیتنے سے سروکار نہ رکھتے تھے۔

بعض لیڈر بھی ایسے ہوتے ہیں جو تمام عمر لیڈر رہتے ہیں، لیکن کارنامہ کوئی نہیں۔ ان کی مثال ایسے لوگوں کی ہے جن کو کام کوئی نہیں مصروفیت بہت زیادہ۔ وہ قوم کو قوائد پریڈ سے تو خوب آشنا کرا دیتے ہیں، لیکن اس کو جنگ کے قابل نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں ہمارے ملک میں ایک قوم کپر چُڑوا کی تھی۔ کپر چڑوا غالباً مرکب لفظ ہے۔ کپار اور چڑکا، پورب میں کپار سر کو کہتے ہیں اور چڑنے سے ہم آپ واقف ہیں۔ ان کا مشغلہ یہ تھا کہ اپنا خون بہا کر بھیک مانگتے تھے، آپ سے کچھ مانگا اور آپ نے دینے میں تامل کیا تو انھوں نے چھری اپنے سر یا جسم کے کسی حصے پر مار لی۔ خون کا فوارہ چھوٹنے لگا تو آپ نے کچھ دے دلا کر ان سے جان چھڑا لی۔ ایک دن بادشاہ کی سواری جا رہی تھی وہ اس کارنامے کو دیکھ کر کپر چڑوں سے بہت مرعوب ہوا اور سوچنے لگا کہ اگر یہ جاں باز فوج میں بھرتی کر لیے جائیں تو غنیم پر فتح پانا آسان ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے حکم دے دیا اور کپر چڑوں کی ایک پلٹن قائم ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد کسی غنیم کا حملہ ہوا۔ مشورہ یہ ہونے لگا کہ دشمن کی روک تھام کیوں کر کی جائے۔ بادشاہ کو دفعتاً کپر چڑوں کا خیال آیا کہ اسی دن کے لیے یہ بھرتی کیے گئے تھے۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے یہ دشمن کے مقابلے پر بھیجے گئے۔ معجزۂ فن کی نمود میں

خونِ جگر کی نوبت آئی۔ دو چار کپڑ چڑوں کو ایسے زخم لگے کہ سب بھاگ کھڑے ہوئے اور سیدھے دارالخلافت آ پہنچے۔ بادشاہ کو بڑا تعجب ہوا۔ ان سے جواب طلب کیا تو انھوں نے دست بستہ التماس کیا کہ جہاں پناہ! ہم رگ پٹھا دیکھ کر خون بہاتے تھے ان کم بختوں کو خون بہانے کا سلیقہ نہیں آؤ تاؤ کچھ نہیں دیکھتے مار بیٹھتے ہیں۔ بادشاہ جی میں تو بہت برہم ہوا، لیکن چوں کہ ان کے انتخاب میں ''جہاں پناہ'' کے سلیقے کو دخل تھا اس لیے ان کو خاص قسم کی خلعت سے سرفراز فرما کر ملک کے ایک گوشے میں بٹھا دیا۔

بے موقع نہ ہوگا اگر سلیقے کے فنِ شریف پر آپ کو ایک چشم دید واقعہ بھی سنا دوں۔ مدت ہوئی میرے وطن میں ایک خاں صاحب تھے جن کا کوئی فرضی نام بھی میں وضع کرنا نہیں چاہتا اس لیے ممکن ہے کہ یہی نام کسی کا اصلی نام ہو اور اسے اصرار ہو کہ میرا روئے سخن اس کی طرف ہے اور یہ وہ مقام ہے کہ جہاں بڑی آسانی سے تعزیراتِ ہند کی کوئی سلیقے کی دفعہ مجھ پر عائد کر دی جائے اور میں کسی سلیقے سے بھی اپنی جان نہ بچا سکوں۔ خاں صاحب سے زیادہ جفاکش، خاموش اور طاقت ور آدمی اس بستی میں کوئی نہ تھا۔ یہ قصبے کے پاور ہاؤس (Power House) تھے چھپّر اُٹھانا، درخت گرانا، سانڈ پکڑنا ہوتا تو خان صاحب سے رجوع کیا جاتا۔ چلم تمباکو پر خاں صاحب یہ سارے کام کر دیتے۔ قصبے کی لڑاکا عورتیں ان کو دیکھ پاتیں تو گالیاں دینے لگتیں اور بچے پا جاتے تو سر سے پاؤں تک ان پر لد جاتے، اور یہ اپنا ناریل پیتے ہوئے لڑکوں کا چھتا بنے گھومتے پھرتے۔ جیسے آپ نے جمعۃ الوداع کے موقع پر دہلی کی ٹراموں کا نظارہ کیا ہوگا۔

برسات کا زمانہ تھا، جنم اشٹمی کی تقریب تھی۔ بستی کے اکھاڑے میں باہر کا کوئی نامور پہلوان آیا ہوا تھا جس نے بڑی بڑی کشتیاں ماری تھیں۔ آس پاس کی شہرت پھیل چکی تھی۔ خاں صاحب بھی ہجوم دیکھ کر پہنچ گئے۔ بچوں اور بے فکروں کی بن آئی۔ سب نے خاں صاحب کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ نو وارد پہلوان سے کشتی لڑ جائیں۔ خان صاحب اپنی مضبوط نجیب الطرفین گھریلو گاڑھے کی مرزئی اور گھٹنوں سے اوپر دھوتی سمیت اکھاڑے میں اُتر پڑے اور ناریل سے کش لیتے ہوئے گرد و پیش پر نظر ڈالی اور بولے، ''کون سالا لڑتا ہے'' بستی کے ثقات نے خان صاحب کو زیادہ پارلیمنٹری الفاظ استعمال کرنے کی تلقین کی اور درخواست کی کہ مرزئی اور

دھوتی اُتار کر صاف لنگوٹ پر اکتفا کی جائے۔ بچوں نے ایک نعرہ لگا کر خان صاحب پر دھاوا بول دیا اور چشم زدن میں سبھوں نے کھینچ تان کر مرزئی اُتار دی لنگوٹ باندھے پر خان صاحب تیار نہ ہوئے۔ البتہ دھوتی زیادہ کس لینے پر آمادہ ہو گئے۔ درجنوں لڑکوں نے دھوتی کا ایک سرا پکڑ کر اس طور سے کھینچنا شروع کر دیا جیسے اسکول میں رسہ کشی کی جاتی ہے اور خان صاحب کو کس کر تیار کر دیا گیا اور خان صاحب کی جے بولی۔ خان صاحب اکھاڑے میں تھوڑی دیر تک کھڑے رہے، پھر بولے۔ ''کون کون سار لڑھین سب اک دے آجائیں۔'' لوگوں نے کہا۔ ''نہیں نہیں خان صاحب صرف ایک سے کشتی ہوگی۔'' چنانچہ حریف سامنے آیا۔ اِدھر اُدھر پینترا بدل کر سلامی دی، لیکن خان صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ حریف نے بڑھ کر ہاتھ ملانا چاہا۔ خان صاحب نے سمجھا لڑائی شروع ہو گئی۔ انھوں نے ہاتھ ملانے کے بجائے اس کی گردن پکڑ لی اور چاہتے تھے کہ چرخ دے کر اس طرح دے ماریں جیسے اپنے گاڑھے کی دھوتی کوئیں کی جگت پر پچھاڑتے تھے کہ مجمع سے ایک ''شورِ طوفاں خیز'' اُٹھا۔ ''ہاں، ہاں۔'' خان صاحب کہہ کر لوگ ٹوٹ پڑے اور بیچ بچاؤ کرا دیا۔ ریفریز کی میٹنگ ہوئی۔ خان صاحب کو بتایا گیا کہ یہ حرکت بُری تھی۔ حریف سے سب نے ہمدردی کی اور اس کو اطمینان دلایا کہ دوسری بار خان صاحب سارے آئینی و تمدنی آداب ملحوظ رکھیں گے۔ کشتی پھر سے ہوگی۔ حریف کے منہ سے آواز تو نکلتی نہ تھی، آنکھیں البتہ حلقے سے باہر نکلی پڑتی تھیں۔ بہ دشواری اُس نے کہا کہ ''اس جانگلو کو کشتی کا سلیقہ نہیں ہے۔ یہ پہلوان نہیں ہے مردم خور ہے، میں اس سے نہ لڑوں گا۔ اس میں فن کا احترام نہیں ہے۔ یہ جان کا لاگو ہے۔'' لوگوں نے خان صاحب کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا تو خان صاحب نے مرزئی کندھے پر اور ناریل کو منہ سے لگاتے ہوئے فرمایا ''سار شیخیا ہے اکھاڑ الڑے بدے ہے کہ ناچے بدے'' اور وہاں سے چل دیے۔

یادش بخیر! ایک بار ہم سب اسٹرائک کرنے کے صلے میں کالج سے نکال دیے گئے، کالج کے ایک ٹرسٹی تھے جو سلیقہ، ضابطہ اور پابندیٔ اوقات کے لیے بڑے مشہور تھے۔ کالج میں ان کی بڑی مان دان تھی۔ ہم سب نے سوچا کہ ان کو گھیرا جائے۔ چنانچہ طویل سفر طے کر کے ان کے آستانے پر حاضر ہوئے۔ عرض حال کیا، بڑی شفقت فرمائی۔ پھر کہنے لگے کہ:

''اسٹرائک کا تو پورا حال مجھے معلوم ہے، لیکن یہ نہیں معلوم کہ نتیجہ کیا رہا۔''

ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ''ہم نکال دیے گئے۔'' فرمایا۔

''ہرگز نہیں۔ تم نکالے نہیں گئے۔''

ہم سب بہت خوش ہوئے کہ اب کام چل جائے گا۔ ان کا فرمانا کہ ہم نکالے نہیں گئے۔ نہایت اُمید افزا ہے۔ پھر عرض کیا کہ ''جناب والا پرنسپل نے نوٹس نکال دیا ہے کہ فلاں فلاں طالب علم نکال دیے گئے۔'' بولے۔

''دیکھوں وہ نوٹس کہاں ہے؟''

ہم نے کہا کہ نوٹس تو موجود نہیں، لیکن ہم لا سکتے ہیں۔ فرمایا ''لاؤ'' چنانچہ ہم میں سے ایک شخص پہلی گاڑی سے روانہ ہو کر کالج پہنچا اور نوٹس کی دستخطی نقل لے کر ممدوح کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس درمیان ہم میں سے بقیہ کی پوری خاطر تواضع کی گئی اور اس طور پر مہمان رکھے گئے جیسے ہم جیسا بہتر اور برگزیدہ مہمان کبھی نہ آیا تھا۔ میزبان نے نوٹس دیکھ کر فرمایا ''ٹھیک ہے۔ تم سب نکال دیے گئے۔ پرنسپل کے دستخط میں پہچانتا ہوں۔ اب تم لوگ فوراً ہمارے یہاں سے چلے جاؤ، لیکن یہ بات یاد رکھو کہ جو بات کہو اس کا ثبوت بھی ساتھ رکھو۔ محض تمہارے کہنے سے میں یہ کیسے مان لیتا کہ تم نکال دیے گئے۔ اب تم نے باضابطہ نوٹس دکھا دیا تو میں نے مان لیا کہ بے شک تم نکال دیے گئے تم کو اپنی بات منوانے کا سلیقہ نہیں ہے۔ زندگی میں سلیقہ ہی سب کچھ ہے۔ بس اب چلے جاؤ۔ آئندہ سلیقے کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔'' ہم سب وہاں سے بڑے سلیقے سے رخصت ہو گئے۔

آج ہماری زندگی میں اس سلیقے نے عجب ابتری پھیلا رکھی ہے، آپ نے امراض کے علاج کے بہتیرے طریقے سنے ہوں گے انگریزی، یونانی، ویدک، ہومیوپیتھی، پانی سے علاج، روشنی سے علاج، غذا سے علاج، ورزش سے علاج، آب و ہوا سے علاج، فاقے سے علاج، نعروں سے علاج، کمیٹی کونسلوں سے علاج، شادی بیاہ سے علاج، مقدمہ سے علاج، مار پیٹ پکڑ دھکڑ سے علاج، شعر وادب سے علاج، گور و کفن سے علاج، صلح ناموں سے علاج، سٹر پٹر سے علاج، علاج ہی علاج، لیکن ان سب سے بڑھا ہوا علاج سلیقے کا علاج ہے۔ یہ علاج بالعموم بڑے

شہروں میں ہوتا ہے۔ جہاں سلیقے اور صرّافے کا بازار گرم ہوتا ہے۔ فرض کیجیے آپ کی ایک آنکھ پھڑکی، آپ نے سلیقے کا علاج شروع کر دیا اور سلیقے کے ماہرین کے پاس پہنچ گئے، ان کے جینے (جس کو میں جیتنے کہنے جارہا تھا) کے سلیقے میں سب سے بڑا سلیقہ یہ ہے کہ آپ ہاتھ سے نہ جانے پائیں چاہے جان سے چلے جائیں۔

آپ آنکھ کے ماہر کے پاس پہنچے اس نے آپ کی آنکھ پر پٹی باندھ کر دانت کے ماہر کے پاس بھیج دیا جس نے آپ کے سارے دانت اکھیڑ دیے اور آپ کو حلق کے ماہر کے یہاں پہنچا دیا۔ وہاں آپ کے حلق کے کوّے کاٹ دیے گئے اور کان کے ماہر کا راستہ بتا دیا گیا۔ وہاں کان کا ڈھول ٹھونک بجا کر ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا گیا اور ایک بھونپو معاوضے میں دیا گیا اور ناک کے امام سے رجوع کرنے کی ہدایت کی۔ ناک والے نے ناک کے اندر کے سارے غُدود اور بادی بلغم کو نون غنہ میں منتقل کر کے امراضِ سینہ کے ماہر کے گھر کا راستہ بتا دیا۔ اس نے آپ کے ایک آدھ پھیپھڑے کو سُن کر دیا اور دل کے ماہر تک رسائی کرا دی۔ اس نے دل کو اپنی جگہ سے کھسکا ہوا اور تھوڑا بہت پھولا پھیلا بتا کر پتّے کے ماہر کی طرف روانہ کر دیا۔ انھوں نے پتّے کی جگہ اپنڈکس نکال دی اور گردہ و مثانہ کے امامِ وقت تک پہنچنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے گردہ کا تعاقب مثانے تک کیا۔ ایک کو سرے سے غائب اور دوسرے کو مختصر کر دیا اور آپ کو گردہ و مثانہ کے بعض ناگفتہ بہ پڑوسیوں کے ماہر کے پاس بھیجا۔ جہاں سے نورٌ علیٰ نور ہو کر آپ گھر واپس آئے تو معلوم ہوا کہ گھر بک چکا ہے اور بیوی بچے محتاج خانے میں آباد ہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد آپ مر گئے، تو آپ کے گھر سے چند تصویرِ بتاں اور چند حسینوں کے خطوط کے بجائے یا ان کے علاوہ ایکسرے کی طرح طرح کی پلیٹیں، مصنوعی دانت، آنتیں اُتارنے چڑھانے کی کمانیاں، انجکشن اور عمل لینے کی از کار رفتہ پچکاریاں اور تام چینی کا تاملوٹ، گرمائی ٹھنڈائی پہنچانے والی بوتلیں، کانوں کے بھونپو اور دو چار لنگڑی بیساکھیاں برآمد ہوئیں، اس سارے افسانے کا مرکزی یا بنیادی فتنہ سلیقہ ہے جس نے سارے گھر میں ماہرینِ فن کا ہل چلوا دیا۔

سلیقے نے ہماری معاشرت میں سائنس اور عبادت کا درجہ حاصل کر لیا ہے کوئی چیز اس وقت تک شروع نہ کی جائے گی جب تک سلیقے کا رند اور بسولا موجود نہ ہو۔ ایک صاحب کو کتوں کا

شوق ہے۔انھوں نے کتوں کے شعروادب کا مطالعہ کرنے کے بعد کتوں کی طب وسرجری پاس کیا۔ پھر کتوں کے وٹامن بہم پہنچائے۔ان کی ٹوائلٹ کا سامان فراہم کیا۔کتوں کو سیر وتفریح کرانے کے لیے سفید پوش بھنگی ملازم رکھے،کتوں کا فرنیچر اکٹھا کیا۔کتوں کی دل آسائی اور دردمندی کے لحاظ سے بیوی کا انتخاب کیا۔کتوں کے عزتِ نفس کی خاطر عزیزوں، دوستوں اور ہمسایوں سے ترکِ تعلق کیا اوراس طور پر میونسپلٹی میں منتخب ہوئے اور قوم کے کام آگئے۔

دنیا کا ہر کاروبار اسی سلیقے سے انجام پاتا ہے۔تہذیب وتمدن پھیلانے کا سب سے موثر سلیقہ یہ ہے کہ ضرورتوں کو گھٹانے کے بجائے بڑھایا جائے۔بتایا جاتا ہے کہ جس قوم کی جتنی زیادہ ضرورتیں ہوتی ہیں اتنا ہی زیادہ قوم متمدن ہوتی ہے حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ جو قومیں زیادہ ضرورتوں کی محتاج ہیں اتنا ہی زیادہ زوال آمادہ ہیں۔موجودہ عہد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس زمانے میں سب سے زیادہ کوشش پست اقوام کی زندگی کو بلند کرنے کی کی جاتی ہے اور زندگی کا معیار اونچا کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ قوم زندگی کے تعیشات کو زندگی کی ضروریات میں منتقل کردے۔تعیشات میں اضافہ اوران کا ناگزیر ہونا قومی عظمت کا معیار سمجھ لیا گیا ہے۔میرے نزدیک یہ باتیں قوم کی عظمت کا اتنا نہیں جتنا اس کی اشاعت کی دلیل ہے۔زندگی کے اس گھن کو سلیقے کے سامری نے کیا درجہ دے رکھا ہے ہم سب جانتے ہیں۔

مطبوعہ: (1) کہکشاں۔دہلی،فروری 1945

(2) افکار۔کراچی،شمارہ: 477

(3) سیدالاخبار،ہفتہ وار۔حیدرآباد،یکم رمضان 1322

●●●

وقت ضائع کرنے کے طریقے

وقت ضائع کیجیے یا نہ کیجیے وہ خود ضائع ہوتا رہتا ہے۔ بعض لوگ وقت ضائع کرنے پر روپیہ صرف کرتے ہیں، اور بعض اسی طرح روپیہ کماتے اور شہرت حاصل کرتے ہیں۔ وقت ضائع کرنے میں ہم خاصے نیک نام ہیں۔ پھر بھی ہم اس کے محتاج ہیں کہ وقت ضائع کرانے میں کوئی ہماری رہبری کرے ورنہ ہاتھ بٹائے سب سے اچھی سوسائٹی اور سب سے اچھی حکومت وہ ہے جہاں اپنا وقت ضائع کرنے کا ہر شخص مختار ہو۔

سب سے مشہور و مبارک طریقہ وقت ضائع کرنے کا مکھی مارنے کا ہے۔ اس کا پرچۂ ترکیب استعمال ہر شخص کا جداگانہ ہوتا ہے، لیکن ہم میں کم لوگ ایسے ہیں جو مکھی مارنے کے فن یا فقہ سے واقف ہیں خواہ وہ فن برائے فن ہی کے کیوں نہ قائل ہوں یہاں چوں کہ مکھی مارنے سے بحث ہے اس لیے ظاہر ہے فن برائے زندگی کا کوئی سوال نہیں! یہ تو رہا مکھی مارنے کا فن اس کا فقہی پہلو یہ ہے کہ ہر شخص کہاں تک اپنی مکھی مارنے پر مختار رکھا جا سکتا ہے، اور کہاں تک دوسروں کی مکھی مارنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، اس مسئلہ کی انقلابی یا اختلاجی تعبیریوں بھی کی گئی ہے کہ ہر شخص اپنی احتیاج کے مطابق اپنا وقت اور اپنی سکت کے مطابق دوسرے کا وقت ضائع کرے!

مکھی مارنے کے بارے میں یہ عام تعصب ہے کہ مکھی مارنے سے مراد بے کاری اور نکما پن ہے یہ رویہ مکھی اور مکھی مارنے والے دونوں کے خلاف صریحی ناانصافی ہے یعنی ایک

طرف مکھی تو اپنی جان سے گئی اور کھانے والے کو سوا دنہ ملا دوسری طرف ہم کشتوں کے پشتے لگا دیں اور جان لینے کے لیے طرح طرح کے عذاب ایجاد کریں پھر بھی نکلے کہلائیں مکھی ماروں کا بیان ہے کہ مکھی مارنا خاصا مشکل کام ہے۔ اس میں نیکی بھی ہے اور بہادری بھی۔ اس نظریہ سے مکھیوں میں غصہ اور رنج کی لہر دوڑ گئی ہے جس کا اظہار یہ مکھیاں اس برسات میں خصوصیت کے ساتھ کر رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا جاں باز جتھا ہمارے بیش تر بزرگوں کے منہ پر مسلسل بھنبھناتا رہتا ہے، اور ان کو اس کا بالکل موقع نہیں دیتا کہ وہ ملک اور قوم کو وقت اور جان ضائع کرنے کی تدابیر بجھائیں اور خود سوجھ بوجھ سے کام لے سکیں!

ایک زمانہ میں آدمی مارنا آدمی کا پیدائشی حق سمجھا جاتا تھا، اب حق مارنے پر زور دیا جاتا ہے۔ نسلِ انسانی نے اپنا بیش تر وقت انہی باتوں پر ضائع کیا ہے اور فخر کیا ہے، لیکن اس وقت میں وقت ضائع کرنے پر مامور کیا گیا ہوں اور آپ کو فخر کرنے کا موقع دیا گیا ہے، یعنی وقت ضائع کرنے پر فخر کرنے کا!

ان دنوں اس پر زور دیا جاتا ہے کہ خوراک زیادہ پیدا کرو، کپڑے کم پہنو، اور سفر بالکل نہ کرو، زیادہ خوراک پیدا کرنے کا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ لوگ بھوکے رہنے پر وقت ضائع نہ کر سکیں گے۔ دوسرا سوال ننگے پن کا ہے۔ کپڑے کی کمی نے ہم میں ننگوں کا خاطر خواہ اضافہ کر دیا ہے۔ جس کا ثبوت آپ کو کپڑے کے کنٹرول کی دوکانوں پر نظر آ سکتا ہے۔ اس میں ایک خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ ستر پوشی پر نہ کپڑا ضائع ہوگا اور نہ وقت۔ کنٹرول کے کپڑوں میں یہ عجیب کمال رکھا گیا ہے کہ ان سے قانوناً ستر پوشی ہوتی ہے اور اخلاقاً ستر نمائی۔ کنٹرول کی دوکان پر آپ اپنا وقت بھی بڑے لطف سے ضائع کر سکتے ہیں وقت ہی نہیں کچھ اور بھی! بہت ممکن ہے آپ یہ ہزار خوبی و خرابی دوکان تک پہنچیں اور اسی طرح وہاں سے نکلیں تو معلوم ہو کہ آپ تو بیوی کے لیے ایک ساری خرید لائے، لیکن آپ کی دھوتی کوئی اور اُتار لے گیا۔ علاوہ بریں کپڑا نہ ہونے کے سبب سے اب کفن باندھ کر لڑنے یا کفن پھاڑ کر چیخنے کا نہ دستور رہے گا اور نہ محاورہ، اور جب کفن کا پردہ درمیان سے اُٹھ جائے گا تو غالب کے عیوبِ برہنگی کا بھی سوال نہ اُٹھے گا۔ گو یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ سوال نہ اُٹھے تو جواب لازماً بیٹھا رہے، اور ہم وقت ضائع کرنے سے باز آ جائیں۔

تیسرا سوال سفر کرنے یا بالکل نہ کرنے کا ہے اس بارے میں ہمارے کچھ شبہے اور شکایتیں ہیں، جن کے دور کرنے کی اب تک کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اوّل تو یہ کہ یہ ہماری مذہبی آزادی میں خلل اندازی ہے یعنی ہم کو آخرت کے سفر سے باز رکھا جاتا ہے جس کا سب سے زیادہ آسان اور سیدھا راستہ ریل پر سے گزرا ہے۔ یعنی یا تو آپ ریل پر سے گزریں یا ریل آپ پر سے گزر جائے۔ ہجوم کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ریل کو جگہ نہیں ملتی کہ وہ ہم پر سے گزر سکے، اس لیے ہم خود ریل پر آپے سے گزر جاتے ہیں، اور جلد سے جلد اپنے یا دوسرے کے کیفر کردار کو پہنچ جاتے ہیں۔ وقت ہی نہیں جان، مال، آبرو سب کے ضائع کرنے کا یہ طریقہ سب سے کم خرچ اور مختصر ہے۔

وقت ضائع کرنے کا ہمارے ہاں بزرگوں کے زمانے سے یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ ہم اپنا ہی نہیں دوسروں کا وقت بھی ضائع کریں۔ ہندوستان میں اس قوی عبادت کو بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ تعجب ہے آج کل جب کہ جرائم پیشہ لوگوں کی ہر طرح کی نگرانی کی جاتی ہے، وقت ضائع کرنے والوں کو کیوں آزاد رکھا گیا ہے۔ میں وقت ضائع کرنے میں خود بہت لطف محسوس کرتا ہوں، لیکن یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ ایسے لوگوں پر وقت ضائع کریں جن کو مار ڈالنا میں اپنے وقت کا سب سے مبارک مصرف سمجھتا ہوں۔ مار ڈالنا نہیں تو ان کے گلے کو اپنے ہاتھوں سے اس شدت سے گھونٹنا کہ دوسرا دیکھے تو یہ سمجھے کہ میرا ہی گلا گھونٹا جا رہا ہے۔

وقت ضائع کرنے کے کچھ اصول ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنا وقت کیسے ضائع کیا جائے، دوسرے یہ کہ دوسرے کا وقت کیسے ضائع کیا جائے، اور تیسرے یہ کہ دونوں کا وقت کیسے ضائع جائے یہ آخری بات اصول نہیں، اپیل ہے۔

ابھی ابھی کوئی نہ کوئی صاحب مجھ سے ملنے آتے ہوں گے، جن کی ملاقات سے بچنے کے لیے میں ہمہ تن اور ہمہ وقت تدابیر سوچتا رہتا ہوں، لیکن بالآخر مجھے اُن سے ملنا اس شوق اور خلوص سے پڑے گا، جیسے ''دن گنے جاتے تھے اِس دن کے لیے'' نہ فسخِ عزائم سے ایک بدذ وخدا کے وجود کا قائل ہوا تھا۔ میں فسخِ عزائم سے صرف اپنا وقت ضائع کیا کرتا ہوں اور اپنے او پر نفرین کرتا ہوں۔ وقت ضائع کرنے کا ایک درجہ یہ بھی ہے!

جیسا کہ پہلے کہہ آیا ہوں وقت میں خود بخود ضائع ہوتے رہنے کی صلاحیت موجود ہے شاید اسی صلاحیت کا نام وقت بھی ہے۔ آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ دانت اُکھیڑنے والے ایک ڈاکٹر نے اُس کرسی کے سامنے جس پر لٹا کر وہ مریض کے دانت اُکھیڑتا تھا ایک تختی آویزاں کر دی تھی جس پر جلی حرفوں میں یہ لکھا ہوا تھا۔ ''یہ وقت بھی گزر جائے گا'' میں نے معتبر ذرائع سے سنا ہے کہ وہ اس بشارت کی زائد فیس نہیں لیتا تھا۔ مریض کو اس بشارت سے یقیناً تسکین ہوتی تھی خواہ اس کا غلط دانت ہی کیوں نہ اُکھیڑ لیا جاتا اس لیے اور بھی کہ وقت کے ساتھ دانت بھی گزر جانے والی چیز تھی۔ اس واقعہ کے بیان کرنے سے میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ آپ وقت ضائع کرنے کے لیے اپنے دانت اُکھڑوانے شروع کر دیں یا جس شخص کو آپ وقت ضائع کرتے پائیں اُس کے بارے میں یہ رائے قائم کر لیں کہ اس کے دانت اُکھیڑے جانے والے ہیں۔

وقت کا ایک خاصّہ یہ بھی ہے کہ اگر آپ چاہیں کہ یہ جلد گزرے تو یہ کبھی نہ گزرے گا۔ فرض کیجیے آپ کی شادی ہونے والی ہے، اور آپ واقعی چاہتے بھی ہیں کہ یہ مرحلہ جلد پیش آئے تو یہ کبھی نہ پیش آئے گا۔ کبھی آپ کو یہ اطلاع ملے گی کہ آپ کی ہونے والی سُسرال میں ایک ایسے بزرگ کا انتقال ہو گیا جو آپ سے زیادہ ہر شخص کو عزیز رکھتے تھے، اور اب ان کے نعم البدل کی تلاش ہے، یا دفعتاً ایسا چاند نکل آیا جو شادی سے بھی زیادہ منحوس ہوتا ہے، یا سُسرال میں چوری ہو گئی اور خوش دامن کے علاوہ سب چوروں کے نذر ہوا، یا آپ نے رخصت کی درخواست دی تھی، لیکن اس کے منظور ہونے سے پہلے وہ محکمہ ہی ٹوٹ گیا جس میں آپ خانہ آبادی کے خواب دیکھ رہے تھے، یا آپ کے دشمن کچھ اس طرح بیمار پڑے کہ چاند کے سارے بال صاف ہو گئے اور انھوں نے آپ کی رفیقۂ حیات یا لازمۂ ممات کا مطلق انتظار نہ کیا!!

اگر آپ وقت ضائع کرنا چاہتے ہیں تو دو ایک باتیں پہلے سے ذہن نشین کر لینا چاہیے یعنی آپ کو کھانے بھر روٹی مل جاتی ہے یا نہیں، اگر مل جاتی ہے تو پھر آپ کو ہر طرح کی سہولت میسّر ہے، آپ کے سر کے اندر خلائے محض ہوگا۔ آپ چارپائی پر لیٹ جایئے اور سوچنا شروع کر دیجیے۔ اس کے لیے عافیت کی جگہ ہونی چاہیے۔ اگر آپ نے سڑک پر سوچنا شروع کیا تو قبل اس کے کہ آپ وقت ضائع کرنے کی مہم پر روانہ ہوں فوجی ٹرک آپ پر سے گزرتا ہوا اپنی مہم پر

روانہ ہو جائے گا، اور آپ کی جان لینے میں ٹرک کا وقت ضائع ہوگا۔ لڑائی کے زمانے میں اس کا وقت ضائع کرنا اچھی بات نہیں!!

اب آپ سوچنا شروع کیجیے کہ اگر زمین گول ہے تو چپٹی کیوں کر بتائی جا سکتی ہے اور چپٹی ہے تو گول کیوں نہیں ہے۔ اس کی شکل گاؤ زمین کے اعتبار سے گاؤدم ہو تو کیا قباحت ہے، اس کی حرکت لٹو کی مانند ہونے کے بجائے اس روایتی کچھوے کی مانند تو نہیں ہے جو خرگوش کی ضد میں ہمیشہ چلتا رہتا ہے، اور اپنی اسی حرکت سے گاؤ زمین کے پاؤں تلے آ گیا ہے۔ ہندوستان کے تیوہاروں میں ایک اضافہ کانفرنس تیوہار کا کیوں نہ کر دیا جائے، جہاں ہولی اور شب برات دونوں ساتھ ساتھ منائی جائیں پٹاخے بھی چھوٹیں اور کیچڑ بھی اُچھالی جائے! پھر دنیا کا روٹی کپڑے کا مسئلہ کیا ہے اور کیوں ہے، اور کیوں نہ ہوا! کیا بھوک کے سالمات کو پھاڑ کر ایسی قوت پیدا کی جا سکتی ہے جو غذا کا بدل بن جائے، جوان دنوں ناپید ہے۔ کیا کوئی سرمہ ایسا ایجاد کیا جا سکتا ہے جو ستر کو آنکھ سے اوجھل دل سے اُجالا رکھے۔ یہاں پہنچ کر آپ اونگھنے لگیں گے یہ بڑے معرکہ کا وقت ہوگا۔ یعنی وقت آپ کو اور آپ وقت کو ضائع کرنے لگیں گے۔

دوسری طرف اگر آپ کا پیٹ خالی ہے تو سر یقیناً بھرا ہوگا، اور وقت ضائع کرنے کا آپ کو حق حاصل ہوگا دنیا کے ہر بڑے تہلکہ کا راز ''بھوکا کیا نہ کرتا'' بتایا گیا ہے اگر آپ دنیا میں کوئی عظیم الشان انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو بھوکا رہنا چاہیے البتہ یہ نہیں بتا سکتا کہ بھوک سے انقلاب پیدا ہوتا ہے تو انقلاب سے کیا پیدا ہوتا ہے اگر اس مسئلہ سے آپ کو دلچسپی ہے تو مجھے یقین ہے کہ آپ کو وقت ضائع کرنے میں بھی دلچسپی ہوگی۔

اب فرض کر لیتا ہوں کہ آپ بھوک سے انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں یا انقلاب نے آپ کو بھوکا بنا دیا ہے، اور آپ کو اس کی لگن لگی ہے کہ کس طرح بھوک اور انقلاب کی مدد سے آپ اپنی عاقبت اور دوسروں کی اوقات خراب کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے دریافت کروں گا کہ آپ زندگی کے کس شعبہ کو عندالناس اور عنداللہ دونوں نورٌ علیٰ نور بنانے کے درپے ہیں۔ فرض کیجیے، آپ نے اردو شعر و ادب کو تاکا ہے، اور آپ اس پر وقت ضائع کرنا چاہتے ہیں، یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ شعر و ادب میں ہر طرح کی بھوک کام دے جاتی ہے۔ آپ کو چاہیے کہ ادب کو زندگی

سے قریب کریں اور ادب آپ کا کہنا نہ مانے تو پھر زندگی کو ادب کے قریب لائیے اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو آپ دونوں کے بیچ میں آ جائیے۔ اس وقت آپ کی جان سے دور، آپ سے آر پار زندگی کی نظر ادب پر پڑے گی، اور ادب کی زندگی پر اور دونوں

''لطافت، بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی'' 1

کی نیرنگیاں دکھانے لگیں گے، اور آپ جدھر نظر اُٹھا کر دیکھیں گے، آپ کو اپنا ہی جلوہ نظر آئے گا۔ اپنا ہی جلوہ دیکھنا وہ تفریح ہے جس سے آدمی کبھی نہیں اُکتاتا، اور وقت خوب کٹتا ہے۔

انقلاب کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ پہلے اس کی نشو و نما اپنی روح میں کرنا چاہیے اس کے بعد یہ خارج میں ظہور پاتا ہے۔ روح میں تو بھوک سے انقلاب پیدا ہو چکا جس کی جھلک ادب میں بھی نظر آنے لگی۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ خارج میں کب اور کیوں کر پیدا ہو؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ کی صورت بھی ادبی، انقلابی ہو۔ سب سے پہلے آپ کو سر کے بال اور ناخن بڑھانے پڑیں گے۔ بال اُلجھے ہوئے اور گرد آلود ہوں اور ان میں تھوڑی بہت جوئیں ہوں تو بہت بہتر تا کہ الہام آفرینی میں سر کھجانے کی تحریک ہوتی رہے، کرتہ، پاجامہ، موٹے کپڑے کا ہو اور میلا ہو، کرتے کی اوپر کی جیب میں کلپ سے لگے ہوئے دو تین فاؤنٹین پین ہوں جن میں سیاہی نہ ہو، پاؤں میں میلی چپل ہو، اگر شلوار نما افغانی چپل ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ہاتھ میں چمڑے کا آویزاں بستہ ہو، جس میں ہر طرح کے مفت تقسیم ہونے والے اشتہارات یا رسائل ہوں نچلی جیب میں سگریٹ اور ماچس ہو (جس کو دیا سلائی کہنا بورژوا حرکت ہے) سگریٹ مسلسل پیا جائے، اور اس کے دھوئیں کو منتشر کرنے کی ذرا کوشش نہ کی جائے تا کہ وہ چہرہ اور بالوں میں گھوم پھر کر ایک غیر ارضی (کچھ زیادہ افلاکی بھی نہیں) فضا پیدا کرتا رہے، اور ادبی، انقلابی اپنا وقت ضائع کرتا رہے۔

طبعی زندگی کے تحفظ اور بقا کے لیے فطرت نے ایسی چیزیں بے دریغ پیدا کی ہیں جو لازمۂ حیات ہیں۔ مثلاً ہوا، پانی، گرمی، روشنی وغیرہ۔ دوسری طرف اجتماعی زندگی کے نباہنے کے لیے انسان نے وقت ضائع کرنے کے بے شمار وسیلے اور بہانے وضع کر رکھے ہیں، مثلاً شاعری،

---

1. مرزا غالب کا پورا شعر اس طرح ہے:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　　چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

لیڈری، عاشقی، مفلسی، اور اس قبیل کی دوسری چیزیں، لیکن وقت ضائع کرنے میں جو کمال ہر قوم، ہر عہد، ہر عمر اور ہر درجے کی خواتین نے حاصل کیا ہے، وہ کسی کو اب تک نصیب نہ ہوا نہ ہوگا!

مغرب کے صنعتی کارخانوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہاں کوئی چیز ضائع نہیں کی جاتی۔ یہاں تک کہ مصنوعات کے فضلہ سے بھی کوئی نہ کوئی کارآمد چیز تیار کرلی جاتی ہے۔ ہماری خواتین بھی ارض وسما کے بڑے سے بڑے اور ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ سے مطلب کی بات اخذ کرلیتی ہیں۔ وہ اپنا وقت اس عقیدہ کی تبلیغ میں ضائع کرتی ہیں کہ رہتی دنیا سے جاتی دنیا تک ان کے علاوہ ہر عورت نے صحیح شوہر کا انتخاب کیا۔ دولت اور جوانی دونوں اندھی ہوتی ہیں۔ ایک غلط شوہر کے ہاں جاتی ہے، دوسری غلط عورت کے حصہ میں آتی ہے۔ جاڑا، گرمی، بہار، برسات، شادی، غمی، جنگ، قحط، وبا، نیکی، بدی، خوب صورتی، بدصورتی سب کی سب ان کی ضد میں اور ان کے چڑھانے کے لیے ظہور پاتی ہیں۔ بقول ان کے بحوالہ غالب:

کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

کم عمر بچوں اور ہر عمر کی خواتین میں یہ بات یکساں پائی جاتی ہے کہ ان کو چند لمحہ بھی خاموش یا نچلا نہیں رکھا جاسکتا۔ بچّے کے نچلا نہ بیٹھنے کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے خرچ سے زیادہ اس میں انرجی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے آمد و خرچ برابر کرنے کی خاطر وہ چیختا، کودتا، پھاندتا پھرتا ہے۔ خواتین کے پاس انرجی اور وقت دونوں فالتو ہوتے ہیں یہ ان کو خرچ نہیں کرپاتیں اس لیے ان کے ضائع کرنے میں منہمک رہتی ہیں۔ اس کارِ خیر میں دوسری خواتین بھی شریک ہوجاتی ہیں۔

اس صورت میں وقت ضائع کرنے کا اصول Rent and lease یا اُدھار پٹہ کا ہوتا ہے، اور رفتار راکٹ کی ہوجاتی ہے۔ مجھے ایک ایسی برگزیدہ خاتون سے شرف نیاز حاصل ہے جو دو سکنڈ ٹھہرے بغیر تین گھنٹے تک مجھ سے گفتگو کرتی رہیں اور اتنا موقع نہ دیا کہ میں ان سے عرض کرسکوں کہ مجھے ہیضہ ہوگیا ہے آپ کی خدمت میں امرت دھارا لینے کی غرض سے حاضر ہوا تھا!!

آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ ہم میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو واقعی اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ وقت ہی ضائع کرنے کا فن ایسا ہے، جس کو سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ واقعہ یہ

ہے کہ اگر ہم جان بوجھ کر وقت ضائع نہ کرسکیں تو زندگی اجیرن ہو جائے۔ وقت کا صحیح مصرف پہچاننا اور اس پر عمل کرنا، اس دنیا کا پیچیدہ ترین مسئلہ ہے، جو شاید سمجھا جا سکتا ہے، برتا ہرگز نہیں جا سکتا۔ ہم میں ہر شخص اپنے بارے میں کسی نہ کسی غلط فہمی میں لازماً مبتلا ہوتا ہے۔ کوئی اپنے کو افضلِ کائنات سمجھتا ہے اور کوئی اسفلِ کائنات، لیکن دراصل نہ تو کوئی چیز افضلِ کائنات ہے اور نہ اسفلِ کائنات، اس حقیقت کو شاید کائنات خود نہیں سمجھ سکی ہے کہ اس میں افضل کیا ہے اور اسفل کیا ہے۔ البتہ افضل اور اسفل کا فریب ایسا ہے جو ہماری زندگی کی گاڑی کو دشوار گزار راستوں سے کھینچتا رہتا ہے، لیکن میں وقت ضائع کرنے کے طریقے تو بتا سکتا ہوں اس کے فلسفہ سے آپ کا وقت ضائع کرنا گوارا نہیں کرسکتا۔

(مطبوعہ کانفرنس گزٹ، علی گڑھ 24 ستمبر 1945 نشریہ آل انڈیا ریڈیو، دہلی 13 ستمبر 1945)

●●●

بات میں بات

مجھے کچھ کرنا ہوتا ہے تو میں غور کرنا شروع کرتا ہوں کہ مجھے نہ کرنے کے لیے تدابیر اختیار کرنی چاہئیں اس میں مجھے ہمیشہ کامیابی ہوئی۔ اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسان مجبور ہرگز نہیں ہے، مختار ہے یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی مختار ہونے پر مجبور ہو یا مجبور ہونے پر مختار۔ اوّل الذکر صورت میں وہ ریڈیو والوں کی فرمائش پوری کرتا ہے اور موخر الذکر حالت میں خودکشی۔

چنانچہ میں نے خودکشی کی اسکیم پر غور کرنا شروع کیا۔ پہلی بات میرے ذہن میں یہ آئی کہ لوگ سوچتے پہلے ہیں اور خودکشی بعد میں کرتے ہیں یا خودکشی کرنے کے بعد سوچ میں پڑ جاتے ہیں اور شاعر بن جاتے ہیں۔ اُس کے بعد یہ خیال آیا کہ انسان کو دوسرے جانوروں سے جو باتیں خاص طور پر ممتاز کرتی ہیں اور اُسے کہیں کا نہیں رکھتیں ان میں دو خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں۔ خودکشی اور شاعری، لیکن خودکشی کی وہ قدر نہیں کی گئی، جس کی وہ مستحق ہے اور شاعری کی وہ قدر کی گئی جس کی وہ مستحق نہیں۔ کوئی خودکشی کر لیتا ہے تو عدالت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ متوفی اختلالِ حواس میں مبتلا تھا۔ دوسری طرف شاعر کو دیکھیے وہ مسلسل بدحواس رہتا ہے۔ اپنا کلام سنا سنا کر شریفوں کو خودکشی پر مائل کرتا ہے، لیکن آزاد رکھا جاتا ہے، اور سفرخرچ وصول کرتا ہے۔ میں نے سوچنے کا عمل جاری رکھا۔ بات میں بات نکلتی آتی تھی اور کچھ دور نہ تھا کہ خودکشی سے باز آجاتا دور سے اُستاد بُدبُد آتے ہوئے نظر آئے۔ اُستاد کا نام کچھ اور ہے۔ میں نے یہ نام رفع شر یا حفاظتِ خوداختیاری کی بنا پر یہ نام ان کو دے رکھا ہے۔

اُستاد بُد بُد کبھی میرے شاگرد رہے ہوں گے اب اُن کو شاگرد کہوں تو اپنے اُستاد ہونے کا یقین نہیں آتا، اور بزرگ سمجھتا ہوں تو اُن کی سعادت مندی آڑے آتی ہے۔ اُن میں وہ سدابہار ہم عصریت پائی جاتی ہے جو نہ بڑوں سے ڈرتی ہے نہ بچوں کو ڈراتی ہے۔

یہ جب بھی ملیں گے آپ کی بیوی بچوں اور آمدنی خرچ کا حساب اس طرح پوچھیں گے گویا بیوی اور خرچ تو ممکن ہے آپ کے ہوں، لیکن آمدنی اور بچے دونوں یقیناً انھوں نے آپ کو عاریتاً یا آدھ بٹائی پر دے رکھے ہیں۔ اُن کی زندگی کا ماحصل مشورہ دینا اور قرض لینا ہے۔ البتہ بڑے سے بڑا قیافہ شناس یہ نہ بتا سکے گا کہ یہ پہلے مشورہ دیں گے یا قرض مانگیں گے۔ ان کا ایک کمال یہ ہے کہ نہ پچھلے مشوروں کا حساب مانگیں نہ پچھلے قرض کا ذکر کرنے دیں گے۔ یہ تو ہوئی ان کی خوبی اپنی خواری یہ ہے کہ اُن کے مشورہ پر عمل کیجیے تو خود قرض دیجیے اور مشورہ دیجیے تو اس کا مختنانہ خود وصول کریں گے یعنی پچھلے قرض ادا نہ کریں گے نتیجہ یہ نکلا کہ استاد میرے لیے ذو اضعاف اقل بھی ہیں اور مقسوم علیہ اعظم بھی۔

اُستاد کا مشورہ دینا اور قرض مانگنا ایک خاص تکنیک کے ماتحت ہوتا ہے۔ جیسے کوئی ذہین گشتی بساطی جو آپ کے سامنے اپنی گٹھڑی کھول کر رکھ دے اور ہر چیز آپ کو دکھا دکھا کر پوچھے کہ اس کی ضرورت ہے؟ اس کی ضرورت ہے؟ کسی نہ کسی چیز کی ضرورت نکل ہی آئے گی۔ اکثر آپ اپنی خوش قسمتی پر اُچھل پڑیں گے کہ یہ چیز کتنی سستی مل رہی ہے اور کبھی آپ بساطی کی تگ ودَو پر آب دیدہ ہو کر دو چار چیزیں بےضرورت بھی خرید لیں گے۔ اُستاد کے مشوروں کا بھی یہی حال ہے۔

آج اُستاد میں کچھ غیر معمولی تبدیلی نظر آئی۔ جیسے اُستاد، اُستاد نہ رہے۔ کچھ خفیہ پولیس سے ہو کر رہ گئے ہوں۔ یا جیسے پولیس سے خائف اور مجھ سے خفا ہوں!

میں نے کہا۔

''اُستاد کیا بات ہے؟ زمین سخت ہے یا آسمان دور ہے۔''

اُستاد نے آنکھیں بند کر کے سر کو دائیں بائیں اس طور پر جنبش دی جیسے میری باتوں سے قطع نظر اپنے ورثا کی درخواست وصیت نامنظور کر رہے ہوں۔ اُستاد کے حق میں اسے بدشگونی

سمجھ کر میرا دل بھر آیا، لیکن جیسا کہ ایسے مواقع پر ہر بدنصیب دوست کو کرنا چاہیے میں نے جی کڑا کر کے کہا۔

''اُستاد دل تھوڑا نہ کرو۔ دنیا ناپائدار ہے تو اس میں تمہارا کیا قصور، قضا تو ساز گار ہے۔ دیکھو لڑائی ختم ہوگئی ہے صلح پھوٹ پڑی ہے۔ آؤ چور بازار کا کاروبار کریں۔'' اُستاد نے رفتہ رفتہ آنکھ کھول دی، اور میری کلی سے کچھ کم ہی تبسم فرماتے ہوئے بولے۔ ''بھئی تمھارے خلوص سے مجھے یہی اُمید تھی۔'' میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں اُستاد اُس خلوص کو جو میں نے اُدھار پٹہ پر پیش کیا تھا میرے ہی ہاتھ چور بازار کے نرخ پر فروخت نہ کر ڈالیں، میں نے پینترا بدل دیا اور کہا۔

اُستاد میرا دل کہتا ہے کہ میں یا آپ عنقریب کسی مہلک حماقت میں مبتلا ہونے والے ہیں، کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ میرا حلیہ اور آپ کی عمر اس قابل نہیں ہیں کہ کسی حماقت کا حوصلہ کر سکیں۔''

اُستاد نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔

''بات تو سنو، انسان حماقت کی جستجو میں نہیں رہتا۔ بلکہ حماقت خود اشخاص کی جستجو میں رہتی ہے۔''

میں نے کہا۔

''جیسے ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی۔'' اُستاد نے کسی قدر متنفر ہو کر جواب دیا۔

''شعر مت پڑھو شرافت سیکھو۔''

اُستاد کی آواز میں آرٹ، بیزاری، سوءِ ہضم اور بے خوابی اور بدتوفیقی کی علامتیں کچھ ایسی ملی جلی تھیں کہ میں نے اخلاق و احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر فوراً ایک پیشین گوئی سر کر دی۔

میں نے کہا۔

''اُستاد تم یقیناً قوم کے غم میں مبتلا ہو گئے ہو اور مجھ سے چھپاتے ہو۔''

اُستاد نے کہا۔

''تمھارا خیال یہاں تک تو صحیح ہے کہ میں قوم کے غم میں مبتلا ہوں، لیکن ایسا احمق نہیں ہوں کہ قوم کا غم بھی کروں اور چھپاؤں بھی۔ چھپانے کے لیے دوسرے غم کیا کم ہیں؟'' اُستاد کی

اس صاف بیانی پر کچھ دور نہ تھا کہ میرے دل میں جو غبار تھا وہ آنکھوں سے آنسو بن کر نکل جاتا، لیکن بے خیالی میں احتیاط کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ غبار نے آنکھ کا راستہ چھوڑ کر ناک کا راستہ اختیار کیا، اور میں نے چھینک کر اُستاد سے سُرخروئی حاصل کر لی۔ تھوڑی دیر تک خاموشی کا تسلط رہا۔ میں جمائی لینے والا ہی تھا کہ اُستاد بولے۔

''ملک میں آج کون ایسا ہے جسے قوم کا غم نہ کھائے جا رہا ہو۔ پھر جب کھانے کو کچھ نہ ہو تو اس غم کا بڑا سہارا ہے۔ تمہارا شاعروں سے بڑا کھاتہ ہے میں چاہتا ہوں کہ تم کوئی نعرہ ایسا بتا دو کہ ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگ جائے بس ایک نعرہ تصنیف کر دو۔ باقی اللہ مالک ہے۔''

میں نے کہا ''اُستاد ماشاء اللہ خود تو نعرہ تصنیف کر چکے اور ہمت میری بڑھاتے ہو اور نعرہ بھی کیسا نعرہ'' اُستاد نے کچھ خوشی اور کچھ تذبذب میں آ کر اپنے کان ایسے کھڑے کیے کہ مجھے وجد سا آتا محسوس ہونے لگا، پوچھا۔

''بتاؤ تو میں نے کیا کیا؟''

میں نے کہا۔

''اُستاد اس نعرہ سے بڑا نعرہ اور کیا ہو سکتا ہے۔''

اُستاد نے اُکتا کر کہا۔

''بتاؤ تو سہی وہ نعرہ کیا ہے۔''

میں نے کہا۔

''ارے آپ اتنا جلد بھول جاتے ہیں۔ آپ ہی نے تو ابھی فرمایا باقی اللہ مالک ہے۔ جی چاہے تو اس میں سے باقی نکال دیجیے۔ یعنی صرف اللہ مالک ہے۔'' اُستاد کچھ سٹ پٹائے، اور ایسا معلوم ہوا جیسے سہارا نہ دیا گیا تو بجھ جائیں گے، لیکن کسی سہارے بغیر خود ہی سنبھل گئے، اور خاصی مری ہوئی آواز میں گویا ہوئے۔ ''بات تو ٹھیک ہے، لیکن یہ مجاہدوں کا اتنا نعرہ نہیں معلوم ہوتا جتنا فقیروں کی صدا، نعرہ تو اپنی جگہ پر جیسا ہے ظاہر ہے، لیکن اس میں ایک جھول یہ ہے کہ آج کل مالک کے نام سے لوگ بدگمان ہوتے ہیں۔ سارا ہنگامہ مالک اور ملکیت ہی کا تو ہے میں یہ نعرہ

لگاؤں گا تو سوا میرے کسی اور کا کچھ نہ بگڑے گا۔ یعنی ملکیت کوئی نہ چھوڑے گا اور دھاوا مجھ پر بول دیں گے۔"

میں نے کہا۔

"اُستاد اتنی سوجھ بوجھ کی بات میں نے آپ سے کبھی نہ سنی کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ دنیا سے عنقریب اُٹھالیے جانے والے ہوں۔"

اُستاد کچھ اُداس سے ہونے لگے تو میں چونکا ہوا۔ اس لیے نہیں کہ اُستاد کے حق میں پیشین گوئی درست نکلنے والی تھی بلکہ میں اس لیے گھبرایا کہ یہی وہ مقامات ہیں جہاں اُستاد قرض مانگ بیٹھتے ہیں اور کبھی واپس نہیں کرتے۔ میں نے گفتگو کا رُخ بدل دیا۔

میں نے کہا۔

"اُستاد لیڈر بننا کوئی مشکل کام نہیں. لیکن ایک بات ابھی ابھی میرے ذہن میں آئی ہے، وہ یہ کہ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ قوم کا غم اکیلے نہیں کیا جاسکتا۔ اکبر اور انگریزوں کے زمانہ میں آپ کو یاد ہوگا، قوم کے غم میں لیڈر حکام کے ساتھ ڈنر کھاتے تھے اور ہم آپ پولیس کے ڈنڈے اب آپ یہ سوچ لیجیے کہ آپ تو قوم کے غم میں "اُچھوڑ" ہوگئے اور حکام برابر ڈنر کھاتے رہے، اور دسترخوان پر آپ کی حیثیت زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم اُچھوڑ ہی کی رہی تو کیا ہوگا۔"

اُستاد نے کہا۔ اور میں اُستاد کے ساتھ ناانصافی نہ کروں گا انھوں نے میری باتوں سے متاثر ہوئے بغیر کہا کہ "بھائی دیکھو لیڈری اور خطرہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور جب یہ دونوں چلنے لگتے ہیں تو پولیس بھی بیٹھی نہیں رہتی تو جرائم کے کھڑے ہوجانے میں کون مزاحم ہوسکتا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب نعرہ لگانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ نعرہ کا اصول یہ ہے کہ الفاظ مختصر سے مختصر ہوں مطالبہ زیادہ سے زیادہ اور خلوص کم سے کم ہو، لیکن سوال نعرہ کا نہیں تمہاری نیت کا ہے۔ آخر تم نفسِ مطلب پر کیوں نہیں آتے جب اسی ملک میں مارنا مرنا ہے، تو لیڈری کے مسئلہ کو اُلجھاوے یا التوا میں ڈالنے سے کیا نتیجہ؟ رہا یہ کہ کون لیڈر ہو اس پر مجھے زیادہ اصرار نہیں۔"

میں نے کہا۔ "جیسے ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر، ہوئے" اُستاد نے برافروختہ ہوکر کہا۔ "بات تو ٹھیک کہتے ہو، لیکن یہ شعر پڑھنے کی کیا لعنت ہے۔ میں کہتا ہوں لیڈری کا مسئلہ تو سیدھا ہے، لیکن

پولیس کا خاصا ٹیڑھا ہے۔ اس کا کیا کیا جائے؟'' اس لیے میں پولیس سے ہمدردی بھی رکھتا ہوں اور قدرے ڈرتا بھی ہوں۔ ہمدردی اس لیے کہ یہ بے چارے ایسے کام پر لگا دیے گئے ہیں جو ان کے بس کا نہیں اور ڈرتا اس لیے ہوں کہ یہ خود کسی کے بس کے نہیں۔'' اُستاد میرے اس اعتراف سے بالکل متاثر نہیں ہوئے اور کچھ اس انداز سے تقریر کرنے لگے جیسے وہ جہاں بیٹھے تھے وہ نہ صرف یہ کہ میرا امکان نہ تھا بلکہ دیر نہیں، حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں۔...... کچھ بھی نہ تھا صرف راہ گزار تھا۔ اور میں ان کا دست نہ تھا بلکہ اُن کا حقّہ بھرتا تھا۔ فرمایا ''دیکھو جی تمہاری ذہنیت مجرمانہ فلسفیانہ ہو یا فلسفیانہ مجرمانہ مجھے اس سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس قسم کی تعلیم یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہے، اور فیصلے عدالت میں ہوتے ہیں جہاں سے جیل خانہ اور گورستان کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں۔''

میں نے کہا۔

''اُستاد یہ تم کو ہو کیا گیا ہے لیڈری کے اُمیدوار ہو اور یونیورسٹی اور عدالت سے بے زار۔''

اُستاد کچھ سوچ میں پڑ گئے، اور دیر تک یونہی پڑے رہے بالآخر میری طرف ایسی نگاہ سے دیکھنے لگے کہ اگر اُستاد کو جلد از جلد بیڑی پیش نہ کی گئی تو یا تو اُن کی آنکھیں پتھرا جائیں گی یا میں خود پتھر کا بن جاؤں گا۔ میں نے بیڑی کے لیے آدمی دوڑایا تو اُستاد کی رگوں میں بھی خون دوڑنے لگا۔ جب تک بیڑی نہ آئی اُستاد آنکھیں میچے اور ہاتھ ملتے رہے۔ بیڑی آئی تو جلا کر ایک ایسا سنسار سمیٹ کش لیا کہ بیڑی تیزی سے ختم ہونے لگی اور میں ان کے قریب کھنچنے سا لگا۔ اُس کے بعد جو دھواں چھوڑا تو یہ معلوم ہوا جیسے اُستاد کے منہ میں دھوئیں کا بگل ہے اور میں اُس سے برآمد ہو کر دور جا گرا ہوں۔

فضا صاف ہوئی تو میں نے دیکھا کہ اُستاد کے لبوں سے ایک مذبذب تبسّم برآمد ہو رہا ہے پھر آپ ہی آپ بولنے لگے۔ فرمایا ''دیکھو بھائی میرے سامنے عدالت کا نام بغیر کافی نوٹس دیے نہ لیا کرو۔ دنیا کی ہر بات سمجھ میں آتی ہے صرف ''عدالت'' میری سمجھ سے باہر ہے۔ تم کو میں بہت عزیز رکھتا ہوں اس لیے تم سے کچھ نہیں چھپاتا۔'' میں پھر ڈرا کہ اُستاد کہیں ایسی فرمائش نہ کر بیٹھیں جس کی بنا پر اُستاد کی طرف سے میں کبھی مطمئن نہ ہوا۔ میں نے خشوع و خضوع سے جس میں تھوڑی سی دھمکی بھی شامل تھی کہا۔

''اُستاد ہرگز نہیں، جو بات چھپانے کی ہے اُسے ضرور چھپا رہنا چاہیے۔ لعنت ہے میری دوستی پر اگر میری وجہ سے آپ کو اپنا راز فاش کرنا پڑے۔ وہ بھی مجھی پر۔''

اُستاد پر اس کا مطلق اثر نہ ہوا فرمایا۔

''کیا بتاؤں وہ راز نہیں ہے صرف ایک حادثہ ہے۔''

میں نے کہا۔

''اُستاد حادثہ بھی ہے اور صرف بھی!''

کہنے لگے۔

''دیکھو بال کی کھال نکالنا بدتمیزی ہے، اور اسی سے میں عدالت کے نام سے بیزار ہوں۔ میں تم سے کہنے یہ جا رہا تھا کہ اگر عاقل اور بالغ ہو تو عدالت میں کبھی نہ جانا اور اس کے ساتھ ساتھ شریف بھی ہو تو کسی کو جانے نہ دینا۔''

میں نے کہا۔

''اُستاد زبانی وصیت میں بڑے جھگڑے پڑتے ہیں اس کی رجسٹری کرانے کی ضرورت ہے ورنہ تم خدا کی عدالت میں جواب دہ ہو گے اور میں دنیا کی عدالتوں میں کھنچا کھنچا پھروں گا۔''

اُستاد نے میری وقت کا کوئی لحاظ نہیں کیا اور نہ اُس حادثہ سے حراساں ہوئے جس کی میں نے بشارت دی تھی۔ کہنے لگے،''تمہارے اطوار ناپسندیدہ اور تمہارا انجام ڈراؤنا ہے۔ میں ایک بار عدالت میں پھنس گیا تھا مجھ سے کہا گیا کہ حلف لو اور کہو کہ سچ اور صرف سچ بولو گے، اور سچ کے علاوہ اور کچھ نہ کہو گے میں نے وعدہ کر لیا کہ ایسا ہی کروں گا، لیکن جب عدالت سے باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ وکیلوں کے دخل فصل سے میں دروغ حلفی میں مبتلا ہو گیا تھا اور اس سے بچنے کے لیے مجھے اپنی نقدی ورنہ اپنی آبرو سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ بالآخر ایک دوست نے ڈھارس بندھائی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں جس کے پاس پیسے نہیں اس کے پاس آبرو بھی نہیں ہوتی۔ میں ''مفلسی'' میں جواب دہی کر سکتا تھا۔ میں نے اپنے بارے میں دوست کی تشخیص پسند نہیں کی اس لیے کہ جس کے پاس پیسے اور آبرو دونوں نہ ہوں اس کو عدالت میں جانے کی کیا ضرورت تھی وہ تو براہِ راست

اس طرح کے قضیے فیصل کر سکتا تھا اور یہ سب اس لیے کہ بات میں بات نکلتی رہی، یا بال کی کھال کھینچی گئی۔ پھر ایسا نہ کیجیے یا نہ ہونے دیجیے، تو کھال کھینچنے سے بھی کوئی دریغ نہ کرلے۔ بولیے تو جج کی توہین رو دیجے تو اپنی توہین، گا ئیے تو عدالت کی توہین۔ اللہ نے بہت اچھا کیا کہ قبر میں وکیلوں کے لانے کی ممانعت کردی، لیکن قبر میں جس طرح کے فرشتوں سے سابقہ ہوتا ہے وہ کبھی کچھ وکیلوں کے نعم البدل نہیں ہوتے!"

اُستاد بغیر کوئی مطالبہ کیے ہوئے یک لخت اُٹھے اور چلے گئے۔ بیڑی کا بنڈل اور دیا سلائی کا بکس بھی بھولے سے اُن کی جیب میں چلے گئے، اور میرے آپ کے سوچنے کے لیے کچھ آثار چھوڑتے گئے۔

بات میں بات ایک ریڈیائی لطیفہ ہی نہیں عالمِ ہست و بود کا سب سے بڑا حادثہ بھی ہے جو صدائے کن سے شروع ہوا اور معلوم نہیں کہاں پر کب اور کیوں کر ختم ہوگا۔ اس ایک لفظ سے معانی و مطالب کا سلسلہ کہاں سے کہاں پہنچا اور خیال و عمل کا کیسا بے پناہ و بے پایاں طوفان بپا ہوگیا۔ انسان نے کیوں کر سوچا یا بات میں بات نکالی اُس کی اس صفت نے اس کے ذہن و فکر کو کہاں سے کہاں پہنچایا کس کس طرح اُس نے انسان کو گرایا اور اُبھارا۔ بڑا دلچسپ اور شان دار مطالعہ ہے۔ انسان کی ذہنی اور عملی ہر سرگرمی کی تاریخ تمام تر نہیں تو کسی نہ کسی حد تک کسی نہ کسی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اس پر ہم ایک سطحی نظر بھی ڈالیں تو معلوم ہوجائے گا کہ بات میں بات پیدا کرنے کا ملکہ انسان میں کس درجہ راسخ ہے اور اس ملکہ نے انسان کو کیا سے کیا بنایا اور کیا سے کیا بنا دے گا۔ انسان جانور ہے، لیکن ایسا جانور جو دوسرا جانور ہی نہیں بلکہ دوسرا خیال بھی پیدا کرسکتا ہے کسی ایجاد کو لے لیجیے۔ کسی بحث کو اُٹھا لیجیے کسی انجام کو دیکھیے اس کا سلسلہ کس طرح کہاں سے شروع ہوا عمل اور ردِّ عمل کے کن چکروں سے گزرتا ہوا کہاں تک پہنچا اور کہاں جاکر دم لے گا۔ زندگی خواب ہے دیوانے کا یا انکشاف ہے فرزانے کا۔ آغاز بے انجام ہے یا انجام بے آغاز جس طرح دیے سے دیا جلتا ہے۔ بات سے بات نکلتی رہتی ہے۔

(مطبوعہ۔ کانفرنس گزٹ، علی گڑھ 16 رمئی 1946)

●●●

پنگھٹ

بچپن میں میرے قصبہ میں بقول بعضے ایک تالاب ہوا کرتا تھا، اور ایک یکہ بان بھی۔ یکہ بان سے میرا سمجھوتہ یہ تھا کہ جب اس کا تھکا ماندہ گھوڑا واپس آئے تو میں اس پر سوار ہو کر قصبہ کے تالاب یا پنگھٹ پر پانی پلانے لے جایا کروں۔ ایک دن تالاب پر کوئی میلہ تھا۔ پانی پیتے پیتے گھوڑے کے دل میں معلوم نہیں کیوں دفعتاً یہ خیال آیا کہ یکہ کھینچنے میں جتنے پاؤں کی ضرورت ہوتی ہے اتنے کی پانی پینے میں بالکل ضرورت نہ تھی اُس نے اپنے پچھلے دونوں پاؤں کو ہوا میں اس طور پر پھینکا جیسے اُن سے نجات پانا چاہتا ہو، نتیجہ یہ ہوا کہ میں گھوڑے کی گردن اور سر پر سے گزرتا ہوا تالاب میں جا گرا اور جو پانی گھوڑے کے پینے سے بچ رہا تھا اُسے جلد جلد ختم کر دینے کی کوشش کرنے لگا پنگھٹ پر کچھ عورتیں تھیں، انھوں نے واویلا مچائی تو میں نکالا گیا۔ ممکن ہے یہی سبب ہو کہ میں عورتوں کو دیکھ کر کبھی واویلا نہیں کرتا!

پنگھٹ کا میرا دوسرا تصور وہ ہے جب اسکول میں ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ترجموں کی دقتوں اور نارسائیوں پر ایک دن لکچر دیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بڑے تن و توش کے آدمی تھے، اور تین چیزوں سے کبھی علاحدہ نہیں پائے گئے۔ بغل میں بید، ایک ہاتھ میں الارم ٹائم پیس، اور دوسرے میں نیب کا فقط تنکا، یعنی خلال!!! ان تینوں کا جوڑ کبھی میری سمجھ میں نہ آیا۔ اگر حضرت امیر خسرو کی عادت پنگھٹ پر جانے کے بجائے اسکول میں حاضری دینے کی ہوتی تو وہ ان پر کوئی

اَنمل جوڑ دیتے، لکچر میں انھوں نے فرمایا کہ ایک زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں مکمل طور پر نہیں ہوسکتا۔ مثلاً یہی دیکھو پنگھٹ کا یہ گیت ہے۔ ''پنیا بھرن کو میں کیسے کیسے جاؤں۔'' اب بتاؤ'' کیسے کیسے'' میں جو بات ہے وہ ہاؤ ہاؤ سے کیوں کرادا ہوسکتی ہے۔ کیسے کیسے اور ہاؤ ہاؤ کو موصوف نے ذرا سرنوشی میں آ کر ایکٹ کرکے بتایا تھا۔ میں اب تک نہ پنگھٹ کے اس گیت کو بھولا ہوں اور نہ ہیڈ ماسٹر صاحب کو!

پنگھٹ کا میرا تیسرا تصوّر وہ ہے جب میں نے گراموفون ریکارڈ پر پہلے پہل غالباً جانکی بائی کا ایک گانا سنا۔ اس گانے کا ایک ٹکڑا یہ تھا۔ ''گوری دھیرے چلو گگری چھلک نہ جائے۔'' حاضرین پر سکتہ اور سکرات دونوں کا عالم طاری تھا۔ مدتوں میں اس مسئلہ پر غور کرتا رہا کہ گگری کا چھلکنا کیا وہ گر کر ٹوٹ بھی جائے تو کیا ہرج واقع ہوگا۔ دوسرے یہ کہ گگری لے جانے والی کبھی گوری نہیں ہوتی خاصی کالی اور بھدّی ہوتی ہے اور بفرضِ محال کوئی گوری بھی ہو تو اُس غریب کو گگری کے چھلکنے کا خوف دلانے کے بجائے یہ مسخرے گگری خود اپنے سر پر کیوں نہیں اُٹھا لیتے!

پنگھٹ کا چوتھا تصوّر میں نے ادبِ لطیف سے لیا جب آج سے بیس بائیس سال پہلے ٹیگور کے تتبع میں ہر لکھنے والے کی تان تالاب، پنگھٹ، گاگر، کنول، ستارے سے شروع ہوتی تھی اور سینکڑوں نقطوں اور نامکمل جملوں سے گزرتی ہوئی کچھ اس طور پر ختم ہوجاتی تھی کہ شرفاء تملانے اور شہدے ناچنے لگتے تھے! (لتابعد)

پنگھٹ کو گاؤں میں وہی حیثیت حاصل ہے جو یورپ میں سوئزرلینڈ یا امریکہ میں ہالی ووڈ کو۔ یہاں جمیعۃ اقوام کے جلسے بھی ہوتے ہیں اور بُتانِ خود بین و خود آرا کی نمائش بھی۔ شادی بیاہ، فوتی فراری، کھیت، مویشی، بارش اور فصل پر تبصرہ بھی ہوتا ہے اور بلبل کے کاروبار پر خندہ ہائے گُل بھی۔ کس کا میل کس سے بڑھ رہا ہے۔ کس کے پاس نیا زیور آگیا ہے کس کے ہاں نیا گُل کھلا ہے کہاں ساس سُسرے کا غم ہے اور کہاں نند بھاوج کا الم، کس بچّے کے چیچک نکلی ہے، اور کس کھیت میں سرسوں پھولی ہے۔ کون بے وقت جوان ہورہا ہے، اور کون بروقت بوڑھا۔ کس کے سر میں جوں زیادہ ہے، اور کن تلوں تیل نہیں۔ ساہوکار نے کتنے مقدمے جیتے، اور

کاشت کار نے کتنے کھیت بیچے۔ زمیں دار اور تحصیل دار کی کیسی بنتی ہے۔ ساہوکار اور پٹواری کی کیسی گھٹتی ہے۔ ان تمام باتوں کی تحقیق و تفتیش اسی طرح ہوتی ہے جس طرح حکومتیں ایک دوسرے کی تجارت و صنعت اور سیاسی معاہدات اور اختلافات پر نظر رکھتی ہیں راز و نیاز، طعن وطنز، ڈرنا ڈرانا، جوڑتوڑ، کبھی عرش پر کبھی فرش پر، غرض وہ سب جو سیاسی ایوانوں میں پیش آتا رہتا ہے۔ عورتوں کے اس پنگھٹ پارلیمنٹ میں پیش آتا ہے، جو اپنے حقوق، اپنے ذمے داریوں اور اپنی کمزوریوں کا اتنا ہی احساس رکھتی ہے، جتنا خود مختار اور متحدہ اقوام کی ایک مجلس کو رکھنا چاہیے۔ گو بایں حیلہ، صد ہزار انجام یا انعام وہی سفر خرچ یا زادِراہ ہوتا ہے جو گاگروں میں بھر کر لایا جاتا ہے۔ جس کے چھلکنے پر ہندستانی فلموں کے گیت بنتے ہیں۔ شمع حیات لَو دینے لگتی ہے۔ کائنات کی کمر لچکنے یا اس کی نبض چھوٹنے لگتی ہے، اور افسانے برائے زندگی تصنیف کیے جانے لگتے ہیں۔

پنگھٹ پر افسانے بھی ملتے ہیں اور زندگی بھی۔ ایسے افسانے جن پر زندگی کا اور ایسی زندگی جس پر افسانے کا دھوکا ہوتا ہے۔ ہندوستان کا گاؤں زندگی کا افسانہ اور افسانے کی زندگی ہے۔ ایک مثل مشہور ہے کہ ہر راستہ روم کو جاتا ہے یہ صحیح ہو یا نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ گاؤں کا ہر راستہ یا تو پنگھٹ کو جاتا ہے یا اَر ہر کے کھیت کو۔ زندگی کے لیے پانی ہی ضروری نہیں ہے کچھ ناگفتنی اور ناشدنی بھی ضروری ہے، لیکن اس وقت میں پنگھٹ سے باہر قدم نہ نکالوں گا۔ دراصل میں کہنے یہ جارہا تھا کہ زندگی کے لیے پانی ہی ضروری نہیں ہے، بات کرنا بھی ضروری ہے۔ جس طرح پانی اپنی سطح خود متعین کرتا ہے بات بھی اپنی سطح متعین کرنے کے لیے پانی ہی کے نقشِ قدم پر عورتوں کے سہارے پنگھٹ تک پہنچتی ہے۔ کلیرنگ ہاؤس میں ہر قسم اور ہر طرح کے حسابوں کی چول بٹھائی جاتی ہے پنگھٹ پر یہی کام عورتیں کرتی ہیں۔ دن بھر کی افواہوں پر تبصرہ ہی نہیں کرتیں بلکہ افواہیں تصنیف بھی کر دیتی ہیں۔ جن خبروں کی چول نہیں بیٹھتی اُسے بٹھا دیتی ہیں اور جن کی بیٹھی ہوئی ہے اسے اُکھاڑ دیتی ہیں۔ پنگھٹ کا روزانہ کا پروگرام یہی ہے۔ ہر چھوٹا بڑا خالی برتن لاتا ہے اور پانی کے ساتھ طرح طرح کی غذا فکر وتخیل کے لیے لے جاتا ہے۔ جو غذا فکر وتخیل کے کام نہیں آتی وہ ہیضہ اور ٹائیفائڈ کے کام آجاتی ہے۔

صبح وشام پنگھٹ کی طرف عورتوں اور بچوں کی قطار جاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ان میں وہ بھی ہیں جو قطعاً بے زبان ہیں اور ایسے بھی جو کلیۃً بے لگام ہیں۔یعنی مویشیاں بھی اور عورتیں بھی انھیں میں ملے جلے ایسے کتنے بھی نظر آئیں گے جو بھونکتے بھونکتے فاقہ کرتے کرتے، اور مار کھاتے کھاتے بقول غالب:

یاں تک مٹے یا پٹے کہ آپ ہی اپنے قسم ہوئے!

گاؤں میں مویشی کو کسان سے اور کسان کو مویشی سے جدا کرنا بہت مشکل فن ہے، کبھی مویشی کسان معلوم ہوتی ہے، اور کبھی کسان مویشی۔پنگھٹ کے ماحول میں آپ کو کیچڑ، ڈھول، پگڈنڈی، تتر بتر جھاڑیاں، گرد اور جالے کی سوغاتوں سے اری پھندی ملیں گی۔پیپل کا پرانا درخت ہوگا جس کے سب سے اونچے الگ تھلگ ٹھنٹھ پر ایک گدھ کسی مردہ جانور کی پرانی چکلی پسلی کی ہڈی جیسے اُفق پر نظر جمائے بیٹھا ہوگا۔درخت کے نیچے مرے ہوئے کوے کی نُچی ہوئی لاش ہوگی جس کو کتے کبھی کبھی سونگھ اور بچے کھیل لیتے ہوں گے۔پیپل کے کھردرے تنے کی ایک سمت سیندور کے چند ٹیکے نظر آئیں گے جہاں گاؤں کے مرد عورت بچے آسمان و زمین کی بلاؤں سے نجات پانے کی دعا مانگتے ہیں۔کسان صرف آفتوں سے نجات پانے کی دعا مانگتا ہے۔مقبول آسائش کی دعا مانگنے کا عیش اسے کبھی نصیب نہ ہوا۔کچھ فاصلے پر خوانچے والے کی خستہ حال جھونپڑی ہوگی۔جہاں چنے، گڑ، مُرمُرے اور بیڑیاں بکتی ہیں۔خوانچہ والا تھکے ہارے مسافروں یا صبا رفتار موٹروں کو پانی پلائے گا۔رات میں اسی چھپّر کے آس پاس یا سیندور لگے پیپل کے سائے میں چور اور ڈاکو مالِ غنیمت کی دعا مانگیں گے یا اُسے تقسیم کریں گے جس میں خوانچہ والے کا بھی حصہ ہوگا۔

پنگھٹ میں گاؤں کی پوری تاریخ ملے گی۔مختصر پیمانہ اور مدھم رنگ و روپ میں وہ تمام نقوش نظر آئیں گے جن سے دنیا کی بڑی سے بڑی قوم و ملک کا ادب معمور ہے اور ہوس و حوصلہ، حسن و عشق، فلاح و فلاکت کی وہ تمام نیرنگیاں ملیں گی جو تمدن کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔پنگھٹ طرح طرح کے ہوتے ہیں۔کنوئیں، تالاب، ندی، چشمہ اپنی اپنی جگہ پر پنگھٹ کا کام دیتے ہیں، لیکن روایتی پنگھٹ وہی ہے جہاں سیدھے سادے دیہاتی مرد عورت

بچے پانی لینے اور پینے جاتے ہیں۔ جہاں وہ فراغت اور بے تکلفی سے ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ محبت کرتے ہیں، جھگڑتے ہیں اور پھر شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھ کر کہ ان کو ایک دوسرے سے شکایت ہو یا نہ ہو پنگھٹ کو کسی سے عداوت نہیں، اس کا فیضان سب کے لیے یکساں ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے قانع مرنجان مرنج اور پُرسکون فضا کی ضرورت ہے۔ جہاں زندگی کی رفتار مدّھم اور فشار نرم ہوتا ہے۔ جہاں لوگوں کو نہ شاعری کا شوق ہوتا ہے نہ شُہد پن کا حوصلہ۔ شہروں میں پنگھٹ نہیں ہوتا پمپ ہوتا ہے جہاں پانی تو ملتا ہے پنگھٹ نصیب نہیں ہوتا!

گنجان سنسان جنگلوں میں کوئی ندی نالا گہرائیوں میں خم کھاتا نکل جاتا ہے۔ یہ جنگل کے جانوروں کا پنگھٹ ہے۔ یہاں رات میں درندے اور چرندے پانی پیتے ہیں۔ جب چرندوں کا شکار درندے کرتے ہیں اور درندوں کا شکار آدمی کرتا ہے۔ کسی سوکھی ٹہنی پر ایک اُلّو پورے چاند کی تھال پشت پر لیے ہوئے یہ سب دیکھتا ہے۔ اپنے پَروں کو جلدی جلدی پھلا کر تحسین یا نفرین کا نعرہ لگاتا ہے اور پھر چاند کے چوکھٹے میں تصویر بن جاتا ہے۔

بڑے بڑے شہروں میں مقدس دریاؤں کے کنارے مرد عورت صبح سویرے نہانے اور عقیدت و محبت کے نذرانے پیش کرنے جاتے ہیں۔ میں تمام مذاہب کو اچھی طرح جانتا پہچانتا ہوں۔ یہاں صبح کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور یہاں صبح سے مراد سورج نکلنے سے پہلے کا وقت ہے۔ جب لوگ اپنے اپنے دستور کے مطابق زندگی کی نئی صبح مناتے ہیں اور زندگی کی عظمت و فضیلت کا اقرار کرتے ہیں، اور ڈوبتے تاروں اور اُبھرتے آفتاب کی جھلملی میں خواب اور حقیقت کے رشتہ کو سمجھتے ہیں اور اس سے متاثر بھی ہوتے ہیں!

پنگھٹ کی ہمارے افسانہ نویسوں نے وہی گت بنائی ہے جو شاعروں نے کوچۂ یار کی یا آرٹ نے اخلاق کی اور ہم سب نے قوم کی! ہیرو سفر میں ہو یا حضر میں، شکار کر رہا ہو یا ہو رہا ہو حوالات میں ہو یا میدانِ جنگ میں پیچش میں مبتلا ہو یا افلاس میں، ہمارے افسانہ نویس یا شاعر کوئی نہ کوئی نالا نخلستان ردیف قافیہ، شملہ یا شکار پور تلاش کر کے پنگھٹ کا سماں ضرور باندھ دیں گے، جہاں نہ زمانہ کی کڑی دھوپ ہوگی نہ کنٹرول کی دوکان بس تاروں کی چھاؤں، بگلوں کی قطار ایک چشمہ، تالاب، کنواں یا بہتا ہوا دریا ہوگا مہکتی فضا، لہکتا سبزہ، ایک آدھ پرند، دو چار مویشی تھکے

ہارے بھو کے پیاسے، عشق کے قولنج میں مبتلا ہیرو کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔ اس رقص و موسیقی کی آغوش میں بیٹھ کر وہ شعر، شباب و شبراتن کے ان تمام مراحل سے گزر جائے گا، جو اس کی قسمت میں لکھے ہوں یا نہیں اس کے افسانے میں ضرور لکھے جائیں گے!

ہماری ہندوستانی معاشرت اور فلسفۂ قدیم کا بنیادی تصوّر، یکسر منفی اور نسوانیت لیے ہوئے ہے۔ شاعری ہو یا موسیقی، رقص ہو یا عبادت، اس میں فروتنی، سپردگی اور محویت ہی نہیں بلکہ نسوانیت سے رنگین و معطّر دل کشی بھی ہے۔ اس تہذیب کے بنانے سنوارنے والے کلوسس کا دیوآسا بُت بنانے کے بجائے اجنتا کے نازک تخیلی پیکر تراشتے رہے۔ مذہبیت اور نسوانیت کا یہ عجیب امتزاج اُس وقت اور بھی معنی خیز ہو جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اجنتا میں نسوانیت کی جو حسن کاری نظر آتی ہے اُس کی تشکیل و تزئین بدھ راہبوں کے ذہن و فکر میں ہوئی جو دنیا کی آزمائشوں کو چھوڑ کر ذہن کی دنیا اور فطرت کی نزہت گاہوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ انسانی طبیعت کی یہ نیرنگی دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ یعنی عورت سے پناہ ڈھونڈتے بھی ہیں تو عورت ہی میں!

آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں

ہمارے ڈرامہ نگاروں نے اڈی پس نہیں بلکہ شکنتلا کی تخلیق کی ہے اور ہماری شاعری کی بیش تر فضا یولیسیس کی رزمیہ کے بجائے میراجی کی گیتوں سے معمور ہے۔ جس طرح لوگ مغرب کی یونانی تہذیب کا اندازہ ایتھنز کی جسمانی طاقت کے سالانہ مقابلے سے کرتے ہیں اُسی طرح ہندوستان کی اصلی معاشرت اُس کی روح اُس کی سادگی اور حسن کو بے نقاب دیکھنے اور اس کے فلسفہ اور موسیقی کو سمجھنے کے لیے اُس زندگی کا مطالعہ ضروری ہے جو یہاں کے مذہم سوگ و سہاگ کے اردگرد کہانی یا سپنے کا ریشمی جال تنتی رہتی ہے۔

دراصل چوپال، ارہر کا کھیت، الاؤ یا پنگھٹ سب ایک ہی جذبے کی مختلف شکلیں ہیں وہی لازوال سکون کی تلاش کا جذبہ جو نسلوں اور صدیوں کو خاطر میں لائے بغیر وحشی انسان کے دل میں بھی اسی طرح موجزن ہے جس طرح دنیا کے سب سے زیادہ مہذب انسان کے دل میں۔ جو انسان کو اس کی ترغیب دیتا رہتا ہے کہ وہ اس ہنگامۂ رست خیز میں دم بھر کے لیے ٹھہر جائے، اور

اپنے اجنبی ہم سفروں کے ساتھ مل بیٹھے۔ اپنا دکھ سکھ سنائے اور ان کی سنے۔ اس کا پس منظر گاؤں کی وہ سادا اور پُرمحن زندگی ہے جہاں مٹی کو پسینہ سے نرم کر کے پھول کھلائے اور پھل اُگائے جاتے ہیں۔ جہاں انسان اور جانور ایک ہی طرح رہتے سہتے ہیں۔ ان بے جان مٹی کا بیوپار کرنے والوں کی اُمیدیں اور افسانے بیج کے ساتھ بوئے جاتے ہیں۔ خوف اور خوشی کی دھوپ چھاؤں میں اُگتے ہیں اور اسی طرح کاٹے جاتے ہیں۔ یہ کہیں ہوں دل ان کا یہیں بستا ہے۔ ان کو نہ کبھی شباب میسّر آتا ہے نہ فراغت نصیب ہوتی ہے۔ اس لیے یہ نہ اپنی زندگی کو خانوں میں بانٹ سکتے ہیں نہ دوسروں کی زندگی کے در پے ہوتے ہیں۔ یہ کام ہی کو شباب بھی سمجھتے ہیں اور فراغت بھی اسی کو خوشی بھی اور محبت بھی، اور خوشی اور محبت کے ظرف کو جس میں بہت سے چھید ہوتے ہیں، ہر اُس چیز سے بھر لیتے ہیں جس پر صرف ان کا حق ہوتا ہے کسی دوسرے کا نہیں، خواہ وہ حسین و کیف آور ہو یا نہ ہو۔ مسرّت کے سمندر کی تلاش میں نکلنے اور ہار کر مسرّت سے ہی انکار کر دینے کے بجائے یہ اُن مسرّت پاروں ہی سے آس لگاتے ہیں جو بادل کے ٹکڑوں میں فضا میں تیرتے اور زمین پر برستے ہیں۔ یہی بادل کے ٹکڑے برس کر ان کے کھیتوں کو سیراب، ان کے کھیتوں کو معمور اور ان کے پنگھٹوں کو آباد کر دیتے ہیں۔

خوشی کا یہ پنگھٹی معیار کیا ہے، اور گاؤں سے باہر شہروں کی پیچیدہ اور گوناگوں زندگی پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے یا نہیں، اس کا انحصار اس پیمانے پر ہے، جو تہذیب کو فطرت سے الگ کرتا اور رکھتا ہے۔ جو چیزوں کی قدر و قیمت کا تعین ان کی افادیت کی بنا پر کرتا ہے، لیکن جب وقت کے تیز و تند دھارے کو اس بے نیازی سے گزرتے دیکھا جائے جس میں ہر قطرہ کو موجوں کے تلاطم میں حصہ لینا پڑتا ہے یا بڑی سے بڑی موج بھی اپنے یا پرائے فشار سے پاش پاش ہو کر قطروں میں بکھر جائے تو یہ غور کرنا ہی پڑتا ہے کہ کسی قوم کا اعلانِ جنگ زیادہ اہم ہے یا وہ بنیادی باتیں اہم ہیں جو ایک بچّے کی پیدائش، شادی اور موت بن کر اپنی یکسانیت کے باوجود پنگھٹ کی سرگوشیوں اور مباحثے کا موضوع بنی رہتی ہیں!

یہ سچ ہے کہ زندگی وسیع ہوتی جا رہی ہے اور فرد کی دلچسپیاں اور ضرورتیں بھی اُسی نسبت سے بڑھ رہی ہیں۔ اب ہر آدمی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دنیا کے بقیہ تمام آدمیوں کو کام

کرنا پڑتا ہے، اور ملکوں و قوموں کی تفریق کے باوجود دنیا آہستہ آہستہ ایک ریاست بنتی جارہی ہے، جس میں بغیر ارادہ و خواہش کے بھی ہر انسان کو ایک دوسرے کا دست نگر ہونا پڑے گا، اور قربت کے اس احساس کو تہذیب و سائنس کی روز افزوں فتح یابیوں سے اور زیادہ تقویت پہنچتی رہے گی، لیکن جانے پھر ایسا کیوں ہے کہ اس گہما گہمی میں نامعلوم طور پر افراد ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہوتے جارہے ہیں۔ نہ دوسروں کے غم میں شریک ہونے کا حوصلہ اور نہ اپنی مسرتوں کی پائداری کا احساس۔ فطرت کے خزینے لٹائے جارہے ہیں۔ کہیں آسودگی کی دولت نہیں ملتی۔ بڑے سے بڑے معرکے سر کر لیے مگر دل کا چور اب بھی کہتا ہے یہ تو کچھ نہ ہوا، وہ چیز جو زندگی میں اپنائیت کا احساس پیدا کرتی ہے اب بھی وہیں ہے جہاں سرسوں پھولتی ہے۔ جہاں بھدّے پیروں اور ننگی پیٹھ والے انسان بیلوں کے ساتھ بنتے رہتے ہیں اور جہاں پنکھوں پُر دونوں وقت اب بھی ہنس کر ملتے اور جدا ہو جاتے ہیں۔!!

(مطبوعہ: ساقی، دہلی۔ طنز و ظرافت نمبر، اپریل 1946)

●●●

ہنسائے بھی رُلائے بھی — اولاد

کچھ ہی دن ہوئے مجھے لکھنؤ بلا کر بیماری میں حسن یا حسن میں بیماری دریافت کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جہاں تک حسن کی بیماری یا بیماری کے حسن کا تعلق ہے لکھنؤ کے حضور میں میری لب کشائی سوءِ ادب ہے۔ آج میں یہ بتانے پر مامور کیا گیا ہوں کہ ایک ہی بات پر ہنسی کیوں کر آتی ہے اور رونا بھی۔ اس فن یا تجربہ کے سلسلہ میں لکھنؤ کا مجھے یاد فرمانا مجھے ایک بار پھر مجبور کرتا ہے کہ لکھنؤ کے سامنے میں اپنے دانتوں میں عجز کا تنکا رکھ لوں۔ ایسے مواقع پر غالب یہی کیا کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ریڈیو اسے "ریشۂ نیستاں کا" بنا دے!

سب سے پہلی بات جو میں اپنے بارے میں عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ والدین ہونا میری قسمت ہے میری ذات نہیں اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ اولاد کے بارے میں ایک صاحبِ اولاد کے اظہارِ خیال کو کس حد تک جانب دارانہ یا غیر جانب دارانہ قرار دیں گے اور اس میں نفسیات کے کون کون سے پہلو دریافت کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ میں ان دونوں میں سے کسی ایک کا ماہر نہیں ہوں اور کیا عجب آپ میری اس کوتاہی سے فائدہ اُٹھا کر میری باتوں سے کچھ ایسا مطلب نکالیں اور اس مطلب کی اس طرح تشریح کریں کہ اولاد کی پوری قوم مجھ سے بدظن ہو جائے اور آپ تو جانتے ہیں لفظ قوم کے ساتھ بدظنی کچھ اس طور پر مدغم ہے کہ قوم کی تعریف یا ڈیفی نیشن اب صرف اتنی اور یہ رہ گئی ہے کہ وہ

جو بدظن ہو، ضمناً، لیکن حلفاً یہ بھی عرض کروں گا کہ بدظن میں اردو املا کی اصلاح میں نے ملحوظ نہیں رکھی ہے!

جن دو اُمور کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے یعنی نفسیات اور نفسانیت ان کا عجیب دستور ہے۔ ان کے پردے میں یا ان کے بہانے کسی بات سے کوئی مطلب نکالا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر میں یہ کہوں کہ اولاد نالائق ہوتی ہے اور والدین کو رُلاتی ہے تو آپ یہ نتیجہ نکالیں گے کہ میں خود اپنے والدین کی نالائق اولاد میں سے ہوں اور یہ کہوں کہ اولاد لائق ہوتی ہے اور والدین کو ہنساتی ہے تو آپ بڑے وثوق اور خلوص سے کہہ دیں گے کہ میرے خاندان کی ستر دیں یا ایک سو ستر دیں پیڑھی میں کوئی معقول آدمی بھی گزرا ہے جس کے جبڑے کی ہڈی فلاں عجائب خانہ میں محفوظ ہے اور یہ کہوں کہ اولاد لائق بھی ہوتی ہے اور نالائق بھی یعنی ہنساتی بھی ہے اور رُلاتی بھی تو ریڈیو والے کہیں گے کہ یہی تو ہم بھی کہتے ہیں۔ اس کا جواب میرے پاس اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ میں دل مسوس کر رہ جاؤں اور دبی زبان سے یہ کہوں کہ آپ کس سے کم ہیں!

آپ متعجب نہ ہوں مطلب نکالنے کا یہ طریقہ اب بہت عام ہے اور اِدھر کچھ عرصہ سے تو ادب میں بھی اسے بڑا فروغ ہو رہا ہے۔ شاید آپ کو معلوم ہو اور یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو یقیناً نہ معلوم ہوگا کہ ادبی اصطلاح میں اسے تنقید کہتے ہیں۔ اس فن میں مہارت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ تنقید کرنے والا خود کہاں تک ہنستا ہے اور دوسرے روتے ہیں یا خود روتا ہے اور دوسرے تالیاں بجاتے ہیں۔ اس بوالعجبی کو ایک مصرعہ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں:

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے!

لیکن میرے ماہرِ نفسیات نہ ہونے سے آپ بددل نہ ہوں۔ اس اظہارِ واقعہ کو آپ میری خاکساری پر محمول نہ فرمائیں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، اس لیے کہ جس موضوع پر مجھے آپ سے گفتگو کرنی ہے وہ ہے کچھ ایسا کہ اس میں فن کے لحاظ سے جو جتنا ماہر ہوتا ہے ذاتی تجربہ کے معاملہ میں اُتنا ہی بے بس ثابت ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے اولاد کو خدا کی دین بھی کہتے ہیں اور ہنسنے اور رونے دونوں مواقع کو اس سے یوں متعلق کر رکھا ہے کہ اولاد پر تو ہنستے خوش ہوتے ہیں، اور اس کے حال پر روتے رُلاتے رہتے ہیں۔ اولاد کا خدا کی دین ہونا والدین کی سمجھ میں اس وقت ذرا زیادہ آنے لگتا ہے

جب اولاد اس دین میں اپنی طرف سے لین کا تعلق بڑھا لیتی ہے اور جب اس لین دین کا سلسلہ دور تک پہنچتا ہے تو والدین کے ذہن میں کبھی کبھی یہ بات بھی آنے لگتی ہے کہ اگر اولاد خدا کی دین ہے تو والدین خدا کے کون ہیں!

اسی لیے اس موضوع سے میں کتراتا ہوں اور براہِ راست اولاد کے بارے میں گفتگو کرنے کی بجائے خیر و عافیت دونوں اس میں سمجھتا ہوں کہ والدین ہی زیرِ بحث رہیں۔ آپ تو جانتے ہیں ہندستانی، تعریف کرنے کے لیے دوسری قوموں کو اور بُرا بھلا کہنے کے لیے اپنی قوم کو منتخب کرتا ہے خاص طور سے ایسے نازک وقت میں جب کہ اولاد اور والدین دونوں اپنی اپنی الگ قومیت منوانے پر مصر ہوں۔ کیا ہوا جو سننے والی برادری میں اولاد اور والدین کا جو تناسب ہے وہ خطرہ میں پڑ گیا یا کچھ اور نہیں تو جوانوں کی سعادت مندی میری دانائی کو پیری کی کمزوری ہی سمجھ بیٹھے۔ یہ دونوں صورتیں خطرناک ہیں اور جب انسان خطرہ میں گھرا ہو تو محض خطرہ کی گھنٹی بجاتے رہنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ یا تو خطرے سے سرے سے انکار کردے یا خود خطرہ بن جائے!

لیکن خطرے کا ذکر یا اعلان وہ بھی ریڈیو پر شاید آپ کو پسند نہ آئے اور شاید ہی نہیں بلکہ یقیناً ریڈیو والے بھی اس کے متحمل نہ ہوں گے اس لیے میں ایک محفوظ سی بات یہ عرض کروں گا اور بات کے محفوظ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس بات کے لیے آپ کو حفاظت خود اختیاری کے حق کو کام میں نہ لانا پڑے یا پھر وہ بات آپ کی سمجھ میں آجائے تو آپ کچھ نہ کر سکیں اور سمجھ میں آجائے تو سب کچھ کر ڈالیں۔ وہ یہ ہے کہ دنیا میں سب سے انوکھی قوم وہی ہے جس کا ذکر آچکا ہے اور جس کے افراد والدین کہلاتے ہیں۔ یہ قوم دنیا کے ہر حصہ میں ملتی ہے اور ہر جگہ اس کی حیثیت یکساں ہے وہی جو انسانوں میں خدا کی ہے۔ مصیبت پڑے تو اللہ اللہ ورنہ لاحول ولا۔

اس قوم کی خصوصیات عام طور پر مشترک ہیں مثلاً یہ کہ ان میں سے ہر ایک خواہ وہ کتنا ہی افلاطونِ زماں کیوں نہ ہو اس میں اُن کی اولاد بے وقوف بنائے جانے کی صلاحیتیں دیکھ لیتی ہے یا پیدا کر دیتی ہے، اور جہاں اس میں کامیاب نہیں ہوتی وہاں اُن کو خبطی یا بوڑھا قاز کا لقب دے کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ شاید ہی کوئی قوم ایسی ہو جو فریب کھانے اور زیادہ سے زیادہ وقت تک فریب میں مبتلا رہنے پر اس طرح اور اتنی خوشی سے آمادہ رہتی ہے جتنی کہ والدین کی قوم۔ یہی نہیں بلکہ

لطف اُس وقت آتا ہے جب اپنی اپنی اولاد کے فریب میں مبتلا والدین اس فریب کو اپنا اپنا کارنامہ بنا کر ایک دوسرے کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس بھید کا اُن کو احساس نہیں ہوتا کہ اولاد اپنے والدین کا کارنامہ ہوں یا نہیں والدین اپنی اولاد کا کارنامہ یقیناً ہوتے ہیں۔ اگر اولاد پیدا کرنا والدین کا فعلِ طبعی ہوتا ہے تو والدین کو درست کرتے رہنا اولاد کا فعلِ اخلاقی ہوتا ہے۔ یہاں اخلاق سے مراد اکثر اولاد کا وہ اخلاق ہوتا ہے جو والدین کے اخلاق کی خبر لیتا رہتا ہے!

میں مذہبی باتوں کا عالم نہیں ہوں، لیکن مجھے مذہبی روایات سے بڑی دلچسپی ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو نہ روایات سے بیر ہوگا نہ مجھ سے۔ اس لیے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اب جو روایات میں آپ کو سناؤں اُن کو آپ صحیح یا دلچسپ پائیں تو میری تعریف دوسروں سے کریں اور غلط یا غیر دلچسپ پائیں تو صرف مجھے آگاہ کردیں۔ اولاد یا والدین کا یہ شیوہ ہو یا نہیں شریفوں کا یہی شیوہ ہے!

ایک روایت تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ اولاد کی کثرت والدین کے لیے باعثِ مغفرت ہوتی ہے یعنی اولاد کی زیادہ تعداد مغفرت کی دعا کرے گی تو والدین کی بخشائش ہوجائے گی۔ اس کی توجیہ اعصابی امراض میں مبتلا بعض والدین یہ بھی کرتے ہیں کہ یہ اولاد کی دعائے مغفرت نہیں بلکہ والدین کے ساتھ اُن کا حسنِ سلوک ہے جو والدین کی بخشائش کا موجب ہوتا ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اگر پچھلے جنم میں آپ نے کسی پر مظالم توڑے تھے اور وہ آپ سے بدلہ نہ لے سکا تھا تو کسی نہ کسی جنم میں وہ اولاد کی صورت میں نمودار ہوگا اور آپ سے ایسی کسر لے گا کہ وہ سب کچھ کرے گا اور آپ کچھ نہ کرسکیں گے۔ یہ دونوں روایتیں بظاہر مختلف معلوم ہوتی ہیں، لیکن ان سے ایک بات ثابت ہے یعنی آپ کی نجات اولاد ہی سے وابستہ ہے رہا یہ کہ اولاد کی نجات کس سے وابستہ ہے وہ مجھے نہیں معلوم مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ بعض والدین بھی اپنی اولاد کے لیے کچھ کم عذاب نہیں ہوتے!

میں ظالم اور خودغرض والدین کو کسی رعایت کا مستحق نہیں سمجھتا جو اپنی اولاد کو رُلاتے ہیں میرے نزدیک اولاد کا والدین کو رُلانا اتنا بُرا نہیں ہے جتنا والدین کا اپنی اولاد کا رُلانا، اس لیے کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اولاد کو وجود میں لانے کی ذمہ داری والدین پر ہے خواہ اُن کا عمل اختیاری ہو خواہ

اضطراری۔ اس لیے والدین کا فرض ہے کہ وہ جس ہستی کو زندگی کے بھنور میں لاڈالنے کے ذمہ دار ہیں اُس کے لیے سختیاں جھیلیں نہ یہ کہ اس کو مصیبتوں میں پھنسائیں یا پھنسنے دیں بذاتِ خود میں اولاد سے مساویانہ حیثیت سے نپٹنا پسند کرتا ہوں یعنی عاقل اور بالغ ہونے پر اولاد ایمان داری سے یہ فیصلہ کرے کہ بحیثیت ایک فردِ آزاد کے کون کس کی خدمت خلوص اور خیراندیشی سے بجا لاتا ہے۔ خدمت اور خیراندیشی ایسی چیزیں نہیں ہیں جو کسی کی سمجھ میں آئیں یا جن کا مفہوم کہیں کچھ ہو اور کہیں کچھ۔ اُن کا کوئی معاوضہ نہیں، لیکن اُن کا احترام نہ کرنا انسانیت سے گزر جانا ہے جو انسانوں میں سب سے گھٹیا بات سمجھی جاتی ہے۔

ہندوستان میں آپ بہت سے ایسے بزرگوں سے واقف ہوں گے (میرے آپ کے علاوہ) جن کی نہ خوشی اپنی نہ غم اپنا۔ اُن کے رنج وراحت کا انحصار اُن بے شمار بچوں پر ہوتا ہے جن میں ہر عمر اور قد وقامت کے نمونے شامل ہوتے ہیں۔ جن کو یکے بعد دیگرے ایک قطار میں کھڑا کر دیا جائے تو اہرامِ مصر کے زینے نہ سہی ایک خاص قسم کی شاعری کے مصرے ضرور معلوم ہونے لگیں گے۔ اس ہجوم میں یہ بزرگ محض ذو اضعاف اقل بنے ہوئے نظر آئیں گے۔ مگر والدین ہونے کا فخر یا فریب نہ اُن کو توبہ کرنے پر مائل کرتا ہے، نہ جھجک سے باز رکھتا ہے۔ اُن کو اُن سارے بچوں کے نام سلسلہ وار یاد بھی نہ ہوں گے، لیکن اُن کی تعداد "چشمِ بد دور" کے ساتھ یاد رہے گی اور اُن کی تعداد کا ذکر یہ ہم چشموں میں اس طرح کریں گے گویا واقعی یہ ان "زمینوں" کو آسمان سے توڑ کر لائے ہیں!

جہاں اولاد اتنی اور ایسی ہو وہاں کے ہنگاموں اور حادثات کا پوچھنا کیا اور یہ حضرت جیسا کہ ایک اور بہت بڑے حضرت کہہ گئے ہیں ان ہنگاموں ہی کو گھر کی رونق سمجھتے ہیں، ان میں سے کوئی ملول ہے تو ان کو فکر ہے کہ دنیا کس آشوب میں مبتلا ہونے والی ہے۔ کوئی قہقہے لگا رہا ہے تو یہ پریشان کہ ضرور اس نے ہمسائی کی مرغی چرائی ہوگی وہ ہمسائی جس میں مرغی پالنے اور جھگڑا مول لینے کے علاوہ کوئی اور صلاحیت نہیں۔ کوئی انفلوئنزا یا ٹائیفائیڈ کی تواضع میں لگا ہوا ہے تو اُس کے لیے پھل دوائیں کھلونے فراہم کرنے کی فکر میں ہیں۔ کوئی گھر سے باہر پردیس میں علم کی پیاس بجھا رہا ہے تو اس فکر میں مبتلا ہیں کہ کسی موٹر یا محترمہ کی زد میں نہ آ گئے ہوں۔ اس کے حسرت بھرے

خطوط چلے آ رہے ہیں جو کسی مشتبہ کارنامے سے شروع ہوکر کسی یقینی فرمائش پر ختم ہوتا ہے۔ کسی کو یہ شکایت کہ اگر خدا کو انھیں پیدا کرنے پر اتنا اصرار ہی تھا تو والدین کے انتخاب میں خود ان کی رائے کیوں نہ لی۔ مثلاً خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے!۔۔۔ نعروں، فرمائشوں، منصوبوں اور شکایتوں کے اس ماگھ میلے میں ایک طرف سے ہنستی کھیلتی دھوم مچاتی بچی نے آکر گلے میں بانہیں ڈال دیں تو سارے غم ڈھل گئے اور یہ کسی ٹوتھ پیسٹ یا پاؤڈر کا اشتہار نظر آنے لگے۔

اولاد کے ہنسانے یا رُلانے کے عمل سے واقف ہونے کے لیے اس امر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اولاد یا والدین ہماری معاشرت کے کس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں بالعموم یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ جو والدین جتنے کھاتے پیتے اور ذی اقتدار ہوتے ہیں اتنی ہی اُن کی اولاد نالائق یا نامعقول ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مفلوک الحال والدین کی اولاد اکثر سعادت منداور وفا شعار ہوتی ہے۔ دولت اور اقتدار کا بڑا خطرہ یہ ہے کہ احتیاج جو انسان کو انسان سے ربط دیتی ہے اور ایک دوسرے سے قریب اور متوازن رکھتی ہے وہ باقی نہیں رہتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت منداور ذی اقتدار کی اولاد بیوی، دوست، اعزّا سب کسی نہ کسی حد تک اس سے مشتبہ رہتے ہیں اور ظاہر ہے کوئی شخص جو کسی سے مشتبہ ہو اُس کو ہنسانے کی فکر نہ کرے گا۔ انتقاماً رُلانے پر آمادہ ہو جائے تو تعجب کی کوئی بات نہیں۔

دوسری طرف حاجت مند کی اولاد ہوتی ہے جو اپنے بے مایہ والدین سے محبت نہ بھی کرے تو بھی اُس سے مشتبہ نہیں ہوسکتی۔ دونوں زندگی کو قائم رکھنے اور مبارک بنانے کے لیے ریاضت کرتے ہیں۔ یہ ریاضت اُن کے جسم و جان سے برائی اور بدی کے فضلوں کو طرح طرح سے دور کرتی رہتی ہے اور اس طرح جسم و جان کو تازہ اور توانا رکھتی ہے اور والدین و اولاد دونوں کو ایک دوسرے کا انعام بنا دیتی ہے!

میں تو کچھ ایسا سمجھتا ہوں کہ والدین کو اولاد کی طرف سے جو خوشی اولاد کے بچپن میں میسّر آجاتی ہے وہ والدین کے لیے کافی ہوتی ہے۔ سیانے ہونے پر اولاد کی توجہ بھی بنٹ جاتی ہے اور ذمہ داری بھی بڑھ جاتی ہے۔ شاید والدین کے مطالبے میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے اس لیے تعلقات اتنے خوش گوار یا ہموار نہیں رہتے جتنا والدین چاہتے ہیں۔ مگر اولاد کی بچپن کی معصومانہ

سرگرمیوں کا عمل و ردِّ عمل والدین کے لیے جس خوشی و سرخوشی کا موجب ہوتا ہے وہ والدین کی تمام عمر کے لیے کافی ہوتا ہے اور ہونا چاہیے یہ والدین کی زیادتی ہے کہ وہ دمِ واپسیں تک اسی قسم کی خوشی دیکھنا یا پانا چاہتے ہیں۔

اولاد کب ہنساتی ہے اور کب رُلاتی ہے یہ عمر کے اُن ڈھلتے ہوئے لمحوں کا راز ہے جب زندگی کے سائے گہرے ہوکر مستقبل کے مدّھم غیر واضح ورق پر اُمید و حسرت کے عجیب و غریب نقوش بکھیرنے لگتے ہیں ایسے نقوش جن کے سانچے میں صدیاں نسلیں بن جاتی ہیں اور وقت کی کبھی اور کہیں نہ ختم ہونے والی پہنائی ان آنے والی نسلوں کو ایک ایسے تار کی طرح پروتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جس کا ایک سرا ہماری اپنی ذات ہوتی ہے اور دوسرا ابد سے ہم کنار! شباب کی منزل سے گزر کر بھی نہ پورے ہونے والے حوصلوں کی جھلملاتی شمع کے لیے اولاد کا یہ تصوّر ایک فانوس بن جاتا ہے جس سے مستقبل کا دُھندلکا دیر تک منوّر، معطّر اور پُر اُمید نظر آتا رہتا ہے!

1۔ نشریہ 22/ اکتوبر 1946 (آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

2۔ مطبوعہ کانفرنس گزٹ، علی گڑھ 16/ نومبر 1946

3۔ سید الاخبار (ہفتہ وار) حیدرآباد (دکن) رمضان المبارک 1366 ہجری

●●●

چلمن

میرے ہی اب وجد کے افسانے میں مولوی معنوی نے ایک مثنوی کی ابتدا کی ہے جہاں وہ کہتے ہیں:

بشنو از نے چوں حکایت می کند

مجھے یہ نہیں معلوم کہ مولوی معنوی کے زمانے میں ہستی یا نیستی کے کس مرحلہ میں تھی ورنہ آپ یقین کریں 'نے' کو منہ لگانے کی بجائے وہ میری ہی آڑ پکڑتا۔ فانی نے صور و منصور و طور کو ایک ہی بات کے انداز بتائے ہیں۔ چلمن، محمل اور پردہ بھی ایک ہی چیز ہیں اس لیے جہاں تک میری نمائندگی کا تعلق ہے آپ واحد متکلم کے صیغہ سے مشتبہ نہ ہوں۔

ہندوستان کے ایک مرنجاں مرنج دیہات کے گوشہ میں پانی کے ایک گڑھے کے کنارے میرا محلہ آباد تھا جو کہیں نیستاں کے نام سے مشہور تھا اور کہیں پٹواری کے نام سے۔ بانس کا ہندوستان کے افسانہ ہائے حسن و محبت میں جو حصہ رہا ہے آپ جانتے ہوں گے، یہ میرے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ بچوں کے لیے ''میاں کی تچی'' بنی اور اس کا گھوڑا بھی جوانوں کے ہاتھ میں قوت، بوڑھوں کے لیے عصائے پیری، دولہا دلہن میرے ہی جھنڈے تلے زندگی بھر کا پیمانِ وفا باندھتے ہیں۔ سورماؤں کی فتح و شکست کا میں ہی اعلان کرتی ہوں۔ دلہن سسرال اور میکہ کی سیر میرے ہی وسیلہ سے کرتی ہے اور دنیا سے منہ موڑنے والوں کا آخری سفر میری ہی رفاقت میں

ہوتا ہے گہوارہ سے لے کر گور تک کی دوڑ بھاگ کا سہارا میں ہی ہوں اور اس درمیان میں انسان جو کچھ کرتا ہے وہ میری ہی آڑ میں کرتا ہے۔ زندگی میں چلمن یا پردے کا جو کرشمہ ہے وہ آپ جانتے ہوں گے۔

شاعر، صوفی، معلم، لیڈر، خفیہ پولیس اور ان کے دور اور نزدیک کے جتنے رشتہ دار ہیں سارے کے سارے اپنے اپنے اغراض کو سامنے رکھ کر سچ اور جھوٹ پر یا تو پردہ ڈالتے رہتے ہیں، یا ان پر سے اُٹھاتے رہتے ہیں۔ پردے کے پیچھے کا حال کسی کو نہیں معلوم خود پردے کو نہیں معلوم۔ ممکن ہے ایسا بھی ہو کہ پردہ ہی حقیقت ہو جس کا نمائندہ میں ہوں یا میں ہے۔

لیکن ذرا ٹھہریے۔ آپ اناؤنسر صاحب کی گفتنی سن چکے ہیں اور تھوڑی بہت ناگفتنی بھی مجھ خاکسار چلمن سے۔ تفریح کے ایسے معلوم نہیں کتنے پہلو نکلیں گے، لیکن میں ریڈیو کے استعمال کا معترف ہوں کہ اسے بولنے والے کا بھرم رکھنا خوب آتا ہے اور اس کی یہی خصوصیت ہے۔ اس نے مجھ جیسے چلمن صفت یا چلمن زدہ سے اس قدر قریب اور اسے اس قدر محبوب رکھتے ہیں۔ اس طرح کے پردے جس میں منصور کی زبان اور خدا کی آواز کو یکجا کیا جا سکے ہماری زندگی کا سب سے زیادہ دلچسپ عنوان ہوتے ہیں اور ان کے فریب سے ہم تمام عمر نہیں تھکتے۔ چلمن، جس کی دھوپ چھاؤں چھپا کر بھی دکھائی ہے دکھا کر بھی چھپائی ہے جو فانوس کی گردش سے ہر فرسودگی کو نیا پن بخشتی ہے اور ہر کہنگی کو تازگی اور جس میں ماضی کی لاش سے حال کی دلہن سجانے اور خاک کی صورتوں کو لالہ وگل میں نمایاں کرنے کی عجیب صلاحیت ہے۔ شاعر، وہ کوئی دیوانہ ہی تھا جس نے دنیا کو اسٹیج یا پردۂ تمثیل سے تشبیہ دی تھی جس میں ہر اداکار کو اپنے بجائے کوئی اور شخص بننا اور ظاہر کرنا پڑتا ہے اور جس کی تمام عمر اس داخلی اور خارجی زندگی کی چولیں بٹھانے یا داخل خارج میں گزر جاتی ہے اور بے چارہ تماشائی (ہم میں سے ایک دوسرے کا ہی نہیں اپنا بھی تماشائی ہے) یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ اصل کہاں ہے اور نقل کہاں۔ چلمن کی تیلیاں کہاں اور روئے نگار کہاں۔ ہر آواز کسی اور آواز کی گونج معلوم ہوتی ہے اور ہر نقش کسی اور نقش کا سایا۔ ہر زندگی کسی اور زندگی کا عکسِ گریزاں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ''کس رہ رود رماندہ کی صدائے دردناک ہے'' یا آوازِ رحیل کارواں'' کوئی سچ سچ نہیں کوئی جھوٹ جھوٹ نہیں۔

یہ سب مجھ مشکلک ہی کا مسلک نہیں زندگی کا وہ عجیب وغریب مسئلہ ہے جس نے ظاہر و باطن کو تانے بانے کی طرح باہم دگر کیا ہے۔ ان تاروں کو الگ الگ کرتے ہی وہ چیز بیت جاتی ہے جسے ایک فرد کی زندگی کہتے ہیں۔

آپ اس سے یہ نہ سمجھیں کہ میں چلمن کی پاسداری اس لیے کر رہا ہوں کہ انجمن چلمنانِ ہند نے مجھے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے یا کسی ایسی ویسی چلمن نے مجھے دعوتِ نمائندگی دی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ ہم میں ہر شخص چلمن ہے۔ ایسی چلمن جو پردہ پوشی بھی کرتی ہے اور پردہ دری بھی، اگر آپ مجھ چلمن کی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میرے بارے میں طرح طرح کی روایات مشہور ہیں۔ روایات بھی حسن وعشق، شعر وشاعری کی جن سے زیادہ دلچسپ اور ساتھ ہی مہمل روایات کوئی اور نہیں، روایات جو ٹھہریں۔ کہیں مجھے فریب نظر بتایا جاتا ہے اور کہیں جنت نظر۔ یہ دونوں کچھ ایسی مختلف بھی نہیں ہیں۔ جنت اور فریب میں کوئی نہ کوئی رشتہ بہرحال ہے۔ یوں بھی مشرق میں نظر ہمیشہ کسی چلمن کی متمنی یا متلاشی رہتی ہے اور جہاں کوئی چلمن نہیں ہوتی وہاں خودخیرگی کو چلمن بنانے میں حسن کو چھپانے یا چھپے کو حسن قرار دینے کا مرض ہے اس سے آپ واقف ہوں گے۔ یہ وہ مرض ہے جس سے نجات پانے کے بجائے حدوں یا حصار کا کام لیا جاتا ہے جس سے پس منظر اُجاگر ہوتا ہے اور تصویر کے نقش اُبھرتے بکھرتے ہیں۔ یہ بات اتنے یقین کے ساتھ آپ چلمن ہی کے منہ سے سن سکتے ہیں اور سن رہے ہیں حجاب نصف حسن ہی نہیں حسن کا ''نصف احسن'' بھی ہے!

یہ بات میں نے تجربہ کی بنا پر ہی کہی ہے۔ معلوم نہیں آپ کو یاد بھی رہا یا نہیں کہ یہ واحد متکلم اس وقت چلمن بنا ہوا ہے جس کو ریڈیو والے جو چاہیں کہیں ایک فارسی شاعر نے ''در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند'' قرار دیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم اس آئینہ کو آپ راز سمجھتے ہیں یا انکشاف! ہاں تو حجاب اور حسن والی بات ذاتی تجربہ پر یوں مبنی ہے کہ محمل سے میرا کاروبار ہمیشہ سے چلا آرہا ہے اور شاید ہمیشہ چلتا رہے گا۔ ''برقع کنعان'' ہو یا ''حُجلہ گاہِ نجد'' میری کارفرمائی مسلّم ہے۔ حسن اور حجاب نے آڑے وقت ایک دوسرے کی عزت وآبرو اس طرح رکھی اور بچائی ہے کہ میری عزت ہی کو محمل کی آبرو کہنے لگے ہیں۔

اس بات کو آپ یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اگر اتفاق یا مجبوری کی بنا پر میں نے شروع ہی میں اپنا نام یا فریضۂ چلمن نہ بتا دیا ہوتا تو شاید خود مجھے محمل سمجھ بیٹھنے میں بھی آپ کو کوئی تامل نہ ہوتا۔

البتہ اتنی بات اور یاد رکھیے کہ مخمل اور اس میں چھپنے والے کے وہ تمام راز جن سے افسانہ وشعر میں جان پڑتی ہے میرے اندر صرف جذبۂ تمسخر کو بیدار کرتے ہیں اور آپ مجھ چلمن کی اس ہنسی کو سمجھ ہی نہیں سکتے ہیں جس میں احساس وواقعیت کی تلخی بالکل اسی طرح چھلکتی ہے جیسے کھلونے بیچنے والا کسی بچے کو مٹی کے گھوڑے پر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ کر ہنستا ہے۔ اس وقت حسن والہام یا عشق وبوالہوس کو سمندر کے صدف اور گھونگے کی طرح ایک دوسرے میں خلط ملط دیکھ کر انسان سچ مچ ایک چھوٹا سا بچہ معلوم ہونے لگتا ہے جو ریت کے گھروندے بناتا ہے اور سیپ کو موتی سمجھتا ہے۔ چاند کے لیے ضد کرتا ہے اور مچلتا ہے جو دور ہے وہ اچھا جو پوشیدہ ہے وہ حسین جو مشکل ہے وہ پسند۔ اس پر آپ مجھے ہنستے دیکھیں یا نہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن اسی ہنسی کو مجھ سے منسوب کرتے وقت آپ خیال رکھیے گا کہ اس میں میرے ذاتی وہم وعناد کو کسی حد تک دخل ہے۔ میں اس وقت انجمن چلمنانِ ہند کی نمائندگی پر کمر بستہ ضرور ہوں، لیکن کچھ ضروری نہیں کہ میرا نظریہ میری انجمن کا نظریہ بھی ہو یا میری ہنسی اس کی بھی ہنسی ہو۔

مجھے ٹھیک علم نہیں کہ بحیثیت چلمن میرا جغرافیہ آپ کے ذہن میں کیا ہے یعنی آپ مجھے کسی ناگفتہ بہ دروازے پر بقدر ٹاٹ کے پردے کے نہایت مرنجاں مرنج انداز میں پڑا ہوا محسوس کرتے ہیں یا آپ نے خیال میں مجھے کسی فرانسیسی کھڑکی یا بالکونی پر اس نزاکت سے ڈال رکھا ہے کہ ہوائیں کوچہ گردوں کی نظروں سمیت مجھے جھنکتی ہوئی کون ومکاں کے پار ہوتی نظر آتی ہیں۔ مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ آپ کے ذہن میں اس ''روئے جاناں'' کا خاکہ ہے یا نہیں جس پر پڑ کر نظر کی یہ مخصوص نارنجی شعائیں بھی بیکار ہوتی نظر آئیں۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں اُس خوف زدہ شوہر کی معنوی نگاہیں دوڑ رہی ہوں جو گمراہ دروازے پر ٹھٹک کر اس خاکِ چلمن کو اس طرح اُٹھاتا ہے جس طرح پائے کو باں اور نازر ناں قسم کی گھروالی کو اپنی جان سونپ رہا ہو کہ ہے تو یہ خدا کی، لیکن امان تمہاری۔

ایک عام چلمن کے ساتھ یہ یا اس کے علاوہ اور جس قسم کے بھی تصوّرات آپ نے وابستہ کر رکھے ہوں فی الحال میرے بارے میں آپ کے تمام شبہات غلط ہیں گو مجھے یہ تسلیم کرنے میں عذر نہیں کہ میں ان تمام مراحل سے گزرا ہوں۔ یوں تو ایک حقیر وفقیر، نحیف ونزار چلمن کیا اور اس کی زندگی کیا، لیکن مجھ پر سب افتاد پڑ چکی ہے اور اب بھی پڑتی رہتی ہے ان مشاہدات وتجربات

کی کہانیاں سنانے لگوں تو آپ چلمن و محمل ہی نہیں، زندگی اور دشمن کے بھی دشمن ہو جائیں، لیکن مجھے افسانہ و شعر کا مواد فراہم کرنے میں زیادہ دلچسپی ہے خود افسانہ و شعر میرے بس کی بات نہیں اور ادب یا بے ادبی کسی بہانے بھی میں ان دونوں میں سے ایک کا بھی مرتکب نہ ہوا۔

معاف کیجیے گا مجھے خود احساس ہے کہ اس وقت افسانہ و شعر میں اُلجھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ افسانہ و شعر کے کوچے سے چلمن یا اس کے تذکرے کا گزر ہو تو یہ اُلجھاؤ یا بقول ترقی پسندی یہ ٹھکاؤ ناگزیر ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس اُلجھنے اور ٹھٹکنے کے دوران ہی میں، میں آپ کو اپنا محلِ وقوع بتانا شروع کردوں تو عرض یہ ہے کہ میرے پڑے ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں، لیکن آپ کے خیال کے مطابق کسی کھڑکی یا دروازہ پر نہیں بلکہ ایک کرسی پر جس میں یہ قابلِ رشک صلاحیت ہے کہ اس پر بیٹھتے ہی لوگ بولنا شروع کردیتے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا تعجب اگر مجھے وہ تمام مواقع ایک ایک کرکے یاد آنے لگیں جب مجھے بے بسی کے ساتھ کسی محمل یا حرم سرا کے دروازے پر پڑا دیکھ کر ہر گزرنے والا کچھ نہ کچھ کہہ ضرور گزرتا تھا۔

یہ بے بسی میرے لیے اس وقت اور بھی سوہانِ روح ہوتی جب کوئی گیا گزرا اتنا ہی گیا گزرا شعر میرے اوپر سر کردیتا اور میں اپنی تیلیاں یا اس کی گردن مروڑنے کے بجائے دہن لٹکے لٹکے بس ایک جھرجھری لے کر رہ جاتی اور میرے اس سرتاپا احتجاج کو محض ہوا کے جھونکے کی شرارت یا شوخی پر محمول کرکے قطعاً نظر انداز کردیا جاتا۔ ان ہی دنوں ایک مسخرے کا بھی ادھر سے گزر ہوا جس نے میرا سخت مذاق اُڑایا اور جو حرم سرا کی حفاظت کے لیے میری تیلیوں کو ناکارہ بتا کر تیغ و تفنگ قسم کی چیزیں رکھنے کا مشورہ دے گیا، خیر مسخروں کی بات کا بُرا ماننا کیا کون شاعر مسخرہ یا کون مسخرہ شاعر نہیں ہوتا یا کم از کم سمجھا نہیں جاتا، لیکن خیر سے وہاں حرم سرا میں بھی اس کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا اور یہ سوال اُٹھایا گیا کہ جو بازو آزمائے ہوئے ہیں انھیں ایسا مشورہ دینا کہاں تک حسنِ شعور یا حسنِ نیت پر مبنی ہوسکتا ہے۔

چنانچہ اس مسئلہ کو طے کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے فیصلہ کا انتظار ہے اس دوران میں عارضی طور پر لڑکیوں نے انگریزی پڑھنا شروع کردیا اور قوم جو فلاح کی راہ ڈھونڈھنے گئی تھی اب تک لاپتہ ہے۔ (نشریہ 22/نومبر 1946)

●●●

ایڈیٹوریل

''اس میں جہاں کہیں ایڈیٹوریل کا لفظ بخطِ نسخ درج ہے وہاں اس کے
آخری ٹکڑے ریل کا تلفظ بروزن تیل یا کھیل کیجیے۔'' رشید احمد صدیقی

ایڈیٹوریل تو بہت بعد کی چیز ہے، میں ان صاحب سے اُس وقت سے واقف ہوں جب ان کا نام اڈیٹوریل تھا! جب یہ پہلے پہل مجھے ایک اردو اخبار میں نظر آئے جس کا نام اور شباہت خالص عربی تھی، اُس زمانہ میں اردو پڑھ لینا وہ بھی اخبار کی اچھے گھرانے میں شادی اور معقول یافت کی قائم مقام محرری کے لیے کافی تھا! میں نے ان بزرگ سے جن کے یہاں یہ اخبار آتا تھا، اس کے معنی پوچھے تو انھوں نے بتایا کہ ''ایڈیٹوریل دراصل مرکب ہے ایڈیٹر اور ال[1] نمبر سے۔''

میں نے پوچھا کہ
''یہ ال نمبر کیا ہے؟''
تو بولے۔
''دیکھتے نہیں اخبار کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے ال نمبر۔''

L. No. 1

میں نے کہا۔

''تو پھر؟''

فرمایا کہ

''ایسا اخبار جس میں ایڈیٹر اور ال نمبر دونوں شامل ہوں۔''

میں نے کہا۔

''میری سمجھ میں تو اب تک کچھ نہ آیا۔''

تو اُکتا کر اور قدرے ڈپٹ کر فرمایا۔

''اس کے معنی یہ ہوئے کہ نمبری ایڈیٹر!''

تو جناب ایڈیٹوریل کا میرا پہلا تخیل نمبری کا ایڈیٹر تھا!

طالب علمی کا ابتدائی دور تھا۔ میرا سابقہ اردو اخبار کے ایک ایڈیٹر سے ہوا جن کی سج دھج دیکھ کر مجھے بے اختیار میر انیس کی چھپی ہوئی شبیہ یاد آ جاتی تھی۔ ان سے شہر کا چھوٹا بڑا سب ڈرتا تھا۔ اُسی زمانہ میں ایک کانفرنس ہوئی۔ جس میں قومی نظمیں سنائی گئیں۔ اور ایسے ایسے لوگ جمع ہوئے جن کو دیکھ کر میرے اوسان خطا ہوتے تھے، اور جو پولیس والوں کو دیکھ کر خود حواس باختہ ہو جاتے اور اس طور سے کورنش بجالاتے کہ مجھے ایک گونہ تسلی سی محسوس ہونے لگتی! ایک دن میرے مخدوم ایڈیٹر صاحب تشریف لائے اور بولے۔

''چلو تم کو کانفرنس کی سیر کرالاؤں۔ اجلاس شروع ہو تو تم بس یہ کرنا کہ سبھوں کی تقریر لکھتے جانا اور جو شعر پڑھیں ان کو خاص طور پر یاد رکھنا۔''

میں نے کہا۔

''شعر کو یا شعر پڑھنے والے کو۔''

انھوں نے کہا۔

''دونوں کو۔''

میں نے عرض کیا۔

''یہ تو مشکل معلوم ہوتا ہے۔''

بولے۔

''خیر شعر کاغذ کے گوشے پر لکھ لینا کسی نہ کسی مسخرے کے سر منڈھ دیا جائے گا!''

ہم دونوں پنڈال میں داخل ہوئے۔ ابھی جلسہ شروع نہیں ہوا تھا کہ ممدوح مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''دیکھو جی! وہ جو مونچھے رکھے ہوئے کامدار جوتا ٹوپی پہنے نظر آتا ہے، اس کے بارے میں ضرور کچھ لکھنا۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیا؟''

بولے۔

''ایسا کچھ لکھ دینا کہ صورت سے بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔''

میں نے کہا۔

''اور جو شعر پڑھنے لگ جائے تو؟''

تھوڑی دیر سکوت میں رہ کر بولے۔

''پھر کچھ مت لکھنا۔ کوئی بالکل ہی گیا گزرا ہوگا اور ہاں دیکھو وہ کوتوال صاحب نظر آرہے ہیں، ان کے بارے میں لکھنا کہ جب سے وہ شہر میں آگئے ہیں سارے بدمعاش قوم کی حالت سے متاثر معلوم ہوتے ہیں اور قوم کسی سے متاثر نہیں رہی! اور وہ قنات کے قریب فلاں رئیس کے ساتھ جو عورت نظر آرہی ہے اُسے جانتے ہو؟''

میں نے کہا۔

''جی نہیں۔''

بولے۔

''وہ شتابن ہیں شہر میں ان کی بڑی دھوم ہے ان کے بارے میں کوئی پھڑکتا ہوا شعر لکھ کر یہ لکھ دینا کہ ان کی ٹھکری پر سارا پنڈال گونجنے اور جھومنے لگتا تھا۔''

میں نے کہا۔

''کیا ان کا گانا بھی ہوگا۔''

بولے۔

''نہیں گانا تو نہیں ہوگا، لیکن ایسے مجمعوں میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب کیا ہونے لگے، اس لیے کہ کوتوال صاحب اور شتابن دونوں موجود ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ انھیں کے کرایہ کے مکان میں، میں واقع ہوں اور میرا پریس بھی! اچھا میں چلا بس خدا حافظ۔''

میں نے کہا۔

''آپ ٹھہر کیوں نہیں جاتے ابھی جلسہ شروع نہیں ہوا۔''

کہنے لگے۔

''بس جو باتیں میں نے بتا دی ہیں وہ لکھ لانا اگر مجھے کچھ اور یاد آ گئیں تو جب تم مسودہ لے کر میرے پاس آؤ گے تو بتادوں گا اور ہاں جلسہ میں نعرے لگنے لگیں تو شتابن کے قریب رہنا اور پٹائی شروع ہو جائے تو کوتوال صاحب کے قریب نہ جانا۔''

ایڈیٹر صاحب واقعات اور خود میرے ساتھ جو سلوک کر رہے تھے وہ مجھے کچھ ساز گار ہوتے نظر نہ آتے تھے۔ میں نے کہا۔

''جناب والا آپ نے جلسہ شروع ہونے سے پہلے ساری باتیں بتا دیں۔ بفرض محال کوئی نئی بات وقوع میں آئی تو میں کیا کروں گا۔''

بولے۔

تسلی رکھو کوئی نئی بات پیش نہ آئے گی۔ بات تو سب سے پہلے ایڈیٹر کے ذہن میں آتی ہے۔ باقی اور باتیں یا تو سرے سے پیش نہیں آتیں یا پھر ان کو پیش نہ آنا چاہیے تھا ایڈیٹری کوئی معمولی کام ہے! وہ ایڈیٹر ہی کیا جو ہر کارروائی سے پہلے سے واقف نہ ہو، اور کارروائی کہتے کسے ہیں۔ تم کو معلوم ہے؟''

میں نے کہا۔

''مجھے معلوم تو ہے، لیکن بتانے میں ذرا دیر لگے گی۔''

بولے۔

''پولیس کی کارروائی سے واقف ہو۔''

میں نے کہا۔

''جی ہاں واقف ہوں۔''

بولے۔

''اس کو کارروائی کہتے ہیں۔یعنی وہ باتیں جو یا تو سرے سے وقوع میں نہیں آئیں یا وقوع میں آنا ہی چاہتی تھیں تو اس طرح آنا چاہیے تھا! اچھا اب دیر ہورہی ہے تم یہ لو دو آنے اس کی ریوڑی خرید کر کھالینا۔''

اتنے میں ایک خوانچہ والا نظر آگیا اسے ڈپٹ کر بلایا۔ وہ ایڈیٹر صاحب کو دیکھ کر کانپنے لگا۔ اس سے ایک آنے کی مونگ پھلی اور ایک آنے کی ریوڑی مجھے دلوادی اور پیسے بھی خود ہی رکھ لیے۔ خوانچہ والا ہاتھ جوڑتا دعائیں دیتا بھاگ نکلا تھا کہ ایڈیٹر صاحب نے خوانچہ پر سے ایک امرود اُچک لیا جسے کھاتے اِدھر اُدھر گھومتے گھورتے پنڈال سے نکل گئے! یہاں میں اتنا اور عرض کردینا چاہتا ہوں کہ ایڈیٹر صاحب نے پنڈال میں بیٹھے بیٹھے جن بے شمار لوگوں سے میرا غائبانہ تعارف کرایا اُن کی شان میں کوئی نہ کوئی لفظ یا فقرہ ایسا ضرور استعمال کرتے تھے جو جانبین کے کسی بڑے ہی نازک یا ناگفتہ بہ موجودہ یا آئندہ تعلقات کا ترجمان ہوتا!

جلسہ ہوا مجھ سے اُلٹا سیدھا جو کچھ بن پڑا لکھ کر ایڈیٹر صاحب کے ہاں پہنچا تو وہ کتابت کا سارا سامان لیے ہوئے ایک چوکی پر متمکن نظر آئے، جس کے ایک پائے کی ناپ دوسرے پایوں سے کسی حادثہ یا بر بنائے سن وسال کم ہوگئی تھی جس کو اینٹوں سے پورا کیا گیا تھا۔ مسوّدے کا ایک ایک لفظ بچے معنے متن کے ساتھ میرے مواجہ میں پڑھا پھر بولے۔

''معلوم تو ٹھیک ہی ہوتا ہے، لیکن کوئی بات رہ رہ کر کھٹکتی ہے۔''

میں نے کہا۔

''وہ کیا؟''

تو پیشانی کو چٹکی میں لے کر مراقبہ میں چلے گئے اور پھر اُچھل پڑے کہنے لگے۔

''جبھی تو کہتا تھا کہ کچھ خالی خالی سا لگتا ہے۔''

پھر بڑے فاتحانہ انداز میں بولے۔

''دیکھو کہیں کوئی عربی نہیں لکھی۔''

میں نے کہا۔

''وہ مجھے آتی نہیں۔''

بولے۔

''آتی کس کو ہے؟ آتی ہو تو لکھنے کی کیا ضرورت! اچھا یہ تو بتاؤ تم کو عربی کی کوئی دعا یا فقرہ یاد ہے۔''

میں نے کہا۔

''یاد تو ہے لیکن ان کے معنی نہیں معلوم۔''

اُکتا کر بولے۔

''سناؤ''

تو میں نے کہا۔

مثلاً: ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللہ یا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ''

بولے۔

''بالکل ٹھیک اور تم نے یاد بھی خوب ہی دلایا یہ تو مجھے بھی آتی تھیں۔''

میں نے کہا۔

''ان کو مضمون میں کہاں جگہ دی جائے۔''

بولے۔

''کسی ایک کو مضمون کے شروع میں لکھ دو اور دوسری کو آخری میں!''

میں چلا آیا۔

''تین چار گھنٹے بعد گیا تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ایڈیٹر صاحب کے بجائے ایک پہلوان نظر آئے۔ کسے ہوئے بازو پر سرخ رنگ کا ایک تعویذ، سرخ ہی لنگوٹ خوب پھنسا اور کسا ہوا، بدن پر تیل کی مالش۔ میں نے غور کیا تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے ایڈیٹوریل دراصل یہ تھا! مجھے آتے دیکھا تو ایسے آمادہ نظر آئے جیسے ان سے میری کشتی بدی ہوئی تھی۔ دو تین بیٹھکیں لگائیں، اور تالی بجا کر

اُچھل گئے اور چھاپے کے ایک پتھر کو دونوں چٹکیوں سے اس طرح اُٹھا کر دیکھنے لگے جیسے ہم آپ کوئی تو س اُٹھا لیتے ہیں۔''

اب ایڈیٹر صاحب تھے اور ان کا ایڈیٹوریل دوسرے دن کانفرنس میں بانیانِ کانفرنس ایڈیٹر صاحب کا جلوس اس شان کے ساتھ لائے جیسے کہ وہی جنابِ صدر تھے! اور بات بھی یہی تھی، صدر صاحب راتوں رات کہیں روپوش ہو گئے تھے اور ایڈیٹوریل موجود!

ایڈیٹر یا ایڈیٹوریل کا یہ کارنامہ تو اسی ارضِ ناپائدار سے تعلق رکھتا ہے جس سے تعلق جتانے کے ہم آپ بھی کچھ کم گنہ گار نہیں اس سلسلے میں عالمِ بالا کا ایک حادثہ بھی قابلِ غور ہے اسے بیان تو میں ضرور کر رہا ہوں، لیکن راوی کوئی اور ہے اور پھر یوں بھی عذاب ثواب میں اپنی گردن پر کیوں لیتا پھروں تو جن بزرگ کا تذکرہ ہے وہ کچھ ایڈیٹری ہی کے سلسلے میں اس دنیا میں خاصے نیک نام تھے۔ جب ان کے اس دنیا سے اُس دنیا کو انتقالِ پُر ملال کی خبر مشہور ہوئی تو جنت اور جہنم دونوں نے پناہ مانگی، اور ان کی نہ یہاں پُرسش ہوئی اور نہ وہاں یہ ذرا دیر کھڑے سوچتے رہے کہ اب کیا ہو پھر ان کے جی میں جانے کیا آئی جنت اور جہنم دونوں کے بیچ میں اپنا دفتر کھول کر ایڈیٹوریل کا کاروبار شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قبل اس کے کہ ان کا اخبار مقبول ملائک ہو انہیں دوزخ اور بہشت دونوں طرف سے تشریف آوری اور قدم رنجہ فرمائی کا دعوت نامہ وصول ہو گیا!

مجھ پر ایک دَور وہ بھی گزرا ہے جب میں خدا سے زیادہ اخبار کا قائل تھا اور اخبار سے زیادہ ایڈیٹر اور ایڈیٹوریل کا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب اخبار کے پیچھے ایڈیٹر بک جاتا تھا یا پھر جیل بھیج دیا جاتا تھا، اور ایڈیٹر کے پیچھے اس کی بیوی بچے فاقے کرتے اور قوم کے چندہ سے اُن کا کفن دفن کیا جاتا۔ اپنی زندگی کا ابتدائی دور مجھے کبھی اس لیے اور اس طرح نہیں یاد آتا کہ وہ سپاٹ، بے رنگ یا ساکت رہا ہو بلکہ اس کی ساری دلکشی مجھے تو اس تحیّر آمیز زُود یقینی کی وجہ سے محسوس ہوتی ہے جس میں زندگی کا تصوّر یکسر احترام تھا، اور اس کا مستقبل محض حوصلوں کی تکمیل کا نام۔ بچپن کا یہ تصوّر اب تک میرے لیے عظمت واحترام کا معیار بنا ہوا ہے، اور اب بھی مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ دنیا کی عظیم ترین شخصیتیں جب کبھی عظیم ترین کارناموں یا حوصلوں کے قریب ہوتی ہیں تو ان کے خوابوں کی

اس بہشت میں اُس تحیّر آمیز زُود یقینی اور قابلِ رشک اُمید آفرینی کی جھلک نظر آتی ہے جو بچپن کی اساس بھی ہے اور اُس کی پرواز بھی!

خیر یہ تو کچھ یوں ہی بچوں جیسی بات ہوئی جس میں بہک گیا اور کیوں نہ بہکوں الہلال، کامریڈ اور ہمدرد کی گود میں کھیلنا مجھے بالکل اس طرح یاد ہے جیسے کسی اچھے اور اچھے سے زیادہ یہ کہ کسی پُرحوصلہ اُستاد کی پُرشفقت آغوش میں وہ ایتھنس (Athens) تھا جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "برسوں تک ایتھنس کی صورت پرکلیز (Pericles) کی صورت تھی" وہ پرکلیز یونان کا مدبّر اور مقنن تھا۔ میرا پرکلیز وہ جذبہ تھا جو ان اخباروں اور ان کے اڈیٹوریل کی روح و رواں ہوتا۔ مستقبل کے سارے خواب اسی جذبے میں ڈھلتے اور انھیں حوصلوں سے سنورتے جاتے تھے۔

ان اخباروں میں خبریں کم ہوتیں اور اشتہار دینے کا رواج بھی انگریزی تعلیم کی طرح ذرا خال خال ہی تھا۔ چنانچہ تمام اخبار ایک طرح کا اڈیٹوریل ہی ہوتا اور اس کی خبریں تک بس ایسی معلوم ہوتیں جیسے مولوی نذیر احمد کے ناولوں میں کوئی قصہ یا شیخ سعدی کی شاعری میں حکایت یا قواعد کی کتابوں میں تعریف کے بعد مثال۔ یعنی اڈیٹوریل خبروں کا نہیں بلکہ خبریں خود اڈیٹوریل کی پابند تھیں۔ اس میں بدنیتی کا اتنا دخل نہیں تھا جتنا مقصد کی اہمیت اور اس کے خلوص کا قوموں کی زندگی میں، ایسے مواقع کم ہی آئے جب ساری قوم ایک ہی طرح سوچنے سمجھنے لگے ایسا سیدھے راستے پر ضرور لگ جاتی ہے۔ اس قوم نے یہ کھیل بار بار کھیلا ہے اس میں وہ ہاری بھی ہے اور جیتی بھی! لیکن یہ بازی جس بساط پر کھیلی گئی وہ اگر بجائے خود اخبار نہیں تو اسے اخبار سے بہت گہرا تعلق ضرور رہا ہے۔ اس واقعہ کو محض اتفاق پر محمول کر کے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کھیل کے سب سے نمایاں کھلاڑی صرف لیڈر ہی نہیں اڈیٹر بھی تھے!

اڈیٹری محض ترتیب ہی نہیں رہنمائی بھی ہے چنانچہ اچھے رہنما کے لیے جن شرائط کا پورا ہونا لازمی ہے ان کا اطلاق پوری طرح سے اڈیٹر پر بھی ہوتا ہے، اچھا اڈیٹوریل پوری قوم کی محض آواز ہی نہیں، اُس کے اجتماعی شعور کی بلند و پستی کا بھی اظہار ہوتا ہے اُس میں قوم کے اربابِ حل و عقد کی ژرف بینی بھی جھلکتی ہے اور اس کے ولولوں اور عزائم کی روح بھی!

یہ وحدتِ فکر قوموں کو ہر وقت نصیب نہیں ہوتی یہ بات بُری نہیں تو کچھ بہت اچھی بھی نہیں، جیسے جیسے سیاسی وحدت ختم ہوتی گئی قوم کا قوام اور نہج بھی بن بگڑ کر کچھ کا کچھ ہو گیا۔ اخبار کی حیثیت اور اس کے نصب العین کا بنیادی تصور تو وہی رہا —یعنی اپنی بڑائی اور دوسروں کی رسوائی — لیکن کچھ اس ذہنی انتشار کی وجہ سے اور کچھ بڑی تیزی سے بدلتے ہوئے خارجی و سیاسی حالات کی بنا پر اخبار اور ایڈیٹوریل دونوں کے ڈانڈے اشتہارات یا یوں سمجھئے کہ 'اشتہارات' سے مل گئے!

چنانچہ اخبار نویسی کی ساری دیسی یا بدیسی روایات سے قطع نظر ہمارے ہاں اخبار عبارت ہے دو چیزوں سے — اکثر اشتہارات ورنہ ایڈیٹوریل اور بیش تر تو یہ تفریق کرنا بھی کسی ایڈیٹر ہی کے بس کی بات ہوتی ہے کہ اس ایڈیٹوریل میں کس حد تک اشتہارات و مشتہرین کا زور شامل ہے یا اس اشتہار میں کہاں تک ایڈیٹر کی نام آوری اور اخبار کی کاربراری کا پہلو مضمر ہے یہ رشتہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ جسے خبر کہتے ہیں اُس کا پرچہ ترکیب استعمال بھی یہی ہے کہ انھیں دو چیزوں کو ایک خاص تناسب سے، جسے اخبار کی پالیسی کہتے ہیں، ملاتے چلے جایئے اور شروع بیچ اور آخر میں چند صدروں، کانفرنسوں، دھرم شالوں اور مسجد مندر یا قوم و ملک قسم کی چیزوں کا تذکرہ بھی کر دیجیے ایڈیٹوریل تیار ہو گیا!

لیکن یہاں پہنچ کر ایک بات یک بہ یک میرے ذہن میں آئی کہ اخباروں میں ایڈیٹوریل کی کہانی آپ کو کسی ایڈیٹر ہی کی زبانی سننا چاہیے تھا۔ یہاں تو بقول خود نہ آپ اخبار نہ میں ایڈیٹر، میرا تو ایک پشت سے ہے پیشۂ آبا معلّمی! میں کیا جانوں ایڈیٹوریل ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ویسا کیوں نہیں ہوتا۔ اس میں ایڈیٹر کی نیت کو کتنا دخل ہوتا ہے اور اس کے علم و عقل یا انصاف کو کتنا۔ وہ کس حد تک قوم اور ملک کی ترجمانی و رہنمائی کے سلسلہ میں جہاد بر قلم بستہ رہتا ہے اور کہاں تک فساد فی سبیل القوم کے ذریعہ اور واسطہ سے اس فکر میں رہتا ہے کہ قوم میں فساد ہو تو اپنی کچھ سبیل نکلے اور انجام کار نہ فساد کا کہیں موقع چھوڑتا ہے اور نہ قوم کے لیے کوئی سبیل!

(نشریہ: 31ر دسمبر 1946 مطبوعہ: کانفرنس گزٹ، علی گڑھ 16ر جنوری 1947)

●●●

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

آنکھوں کے جہاں اور بہت سے فتور ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ وہ سویرے کھلے!
میری آنکھوں میں یہ بڑا پرانا فتور ہے! وہ ہمیشہ سویرے کھلتی ہے، اور ہمیشہ کسی فتور پر پڑتی ہے۔
مثلاً میں نے ہمیشہ یہ پایا کہ جن کو میں سوتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا وہ جاگ رہے ہیں اور جن کو بیدار دیکھنا
پسند کرتا تھا وہ سو رہے ہیں۔

سویرے اُٹھنے والوں میں بہت سی خوبیاں ہوں گی، مگر مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ
سویرے اُٹھ کر لوگ آبادی کے باہر چہل قدمی یا پوقدی کر رہے ہوں یا خواہ مخواہ غسل فرمانے لگیں،
میرے مکان سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک وسیع باغ ہے اور اس سے آگے بڑھ کر ریلوے
اسٹیشن۔ سفر کے سلسلے میں یا کسی ڈاکٹر کو بلانے کے لیے اکثر صبح سویرے مجھے اس باغ یا اس کے
پہلو کی سڑک سے گزرنا پڑتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت کوفت ہوتی ہے کہ ایسے اچھے باغ میں ساری
بستی کے گئے گزرے پنشن یافتہ، لنگڑے، اندھے، بوڑھے، اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہوں۔ جن کے
پیٹ نکلے ہوئے ہیں، چندیا صاف ہے، آنکھ پر ٹھیکرے سے بھی زیادہ موٹی بھدّی عینک چڑھی
ہوئی ہے، نکر پہنے ہوئے ہیں اور پاؤں میں کینوس کا میلا جوتا ہے۔ ایسے لٹکتے جھکتے باغ میں ان
لوگوں کو دیکھ کر میرے تحتِ شعور میں کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے میرے شجرۂ نسب میں کہیں
نہ کہیں کوئی نہ کوئی قتلِ عمد کا مرتکب ضرور گزرا ہے۔

اس منظر سے آنکھ بچا کر نکل جانا چاہیے تو سامنے اسٹیشن سے یکّے تانگے آتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اُس وقت میرے قلب میں ٹھوکے سے لگنے لگتے ہیں کہ ان میں میرے حصہ کا کوئی نہ کوئی مہمان ضرور ہوگا جس کے پاس نہ تانگے والے کو دینے کے لیے پیسے ہوں گے، نہ بستر ہوگا، اور نہ لوٹا، تولیا، صابن، منجن۔ یہ بیمار بھی ضرور ہوگا، اور مجھے کھانے اتنے اور ایسے مہیا کرنے پڑیں گے جس کے اہتمام میں بیوی اور باورچی دونوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

میں سویرے اُٹھتا ہوں تو مجھے کچھ ایسا وسوسہ رہتا ہے کہ رات یا تو میرے گھر میں چوری ہوئی ہے یا میرے سب سے اچھے گلاب کو راتوں رات دیمکوں نے ٹھکانے لگا دیا، یا پھر بیوی بچوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور ایسا ہوگا جسے رات میں کسی کیڑے مکوڑے نے کہیں کاٹ کھایا ہوگا، بالخصوص چہرہ کے نازک حصوں کے آس پاس اور وہ صبح کچھ ایسے تیور اور حلیہ سے میرے سامنے آئے گا جیسے وہ کیڑا نہیں تو مکوڑا میں ہی تھا۔

صبح سویرے اُٹھ کر میں اُن ضرورتوں سے بہت جلد فارغ ہو جاتا ہوں جن کی نہ کوئی ماں دریافت ہو سکی ہے نہ اولاد۔ ورنہ اس زمانے میں جب نہ ماں کی کمی ہے نہ اولاد کی، کوئی نہ کوئی ایسی کل یا مشین ضرور ایجاد ہو جاتی جو کچھ اور نہیں تو ایک لازمی ضرورت کو دوسری لایعنی ضرورت سے پورا کر دیتی۔ یہ بات میں نے محض اُس کہاوت کو آپ کے ذہن نشین کرنے کے لیے کہی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے! اس کے بتانے کی کوئی ایسی ضرورت نہ تھی، لیکن آپ تو جانتے ہیں میں بے ضرورت بات کرنے اور کہنے کا بُرا نا گنہ گار ہوں!

ایک دن سویرے وہی پیش آیا جس کا مجھے اکثر وسوسہ رہتا ہے۔ یعنی چوری ہو گئی تھی اور آپ یقین فرمائیں یہ محض اتفاق تھا کہ یہ چوری کسی اور کے گھر ہوئی تھی۔ چوری سے ہمیشہ نقصان پہنچتا ہے بشرطیکہ آپ خود چور نہ ہوں، لیکن خود مجھے مال کے جانے کا اتنا غم نہیں ہوتا جتنا اس سلسلے میں مجھے اپنے احمق ہونے کا احساس ہوتا ہے اور یہ احساس اُس وقت تک کم نہیں ہوتا جب تک میں پولیس، عدالت، احباب، اعزا، کے سامنے پورے طور پر رُسوا نہیں ہو لیتا۔ غور تو فرمائیے ہر شخص دل میں یہ خیال کرے اور دل ہی دل میں ہنسے یا مغموم ہو کہ رشید صاحب کو دیکھیے اور چوری کو دیکھیے۔ جہاں جائیے میری رُسوائی پہلے سے پہنچ چکی ہے کہ انہی کے ہاں چوری ہوئی ہے،

اس کے بعد یہ بتانا شروع کیجیے کہ چور نے مجھے کس درجہ بے وقوف سمجھا اور پایا! یہاں تک کہ میں نے بعض دفعہ یہ ارادہ کرلیا کہ میں گڑگڑا کر لوگوں سے درخواست کروں کہ خود میں نے اپنے گھر میں چوری کی ہے اور خدا کے لیے مجھے کم سے کم اتنے دنوں کے لیے جیل خانے بھیج دیا جائے جب تک میرے جاننے پہچاننے والے اللہ کو پیارے نہ ہو جائیں!

آج تعطیل کا دن تھا اس لیے چھوٹے بڑے لڑکے اس فکر میں صبح سویرے ہی سے گھر سے نکلے تھے کہ چھ دن لکھائی پڑھائی کی جس مصیبت میں وہ مبتلا تھے اُس کا انتقام اُن لوگوں سے لیں گے جنھوں نے اُن کی مصیبت میں ساتھ نہیں دیا تھا۔ اس وقت مجھے یہ تو یاد نہیں کہ میں بیٹھا ہوا کس مسئلہ پر سوچ رہا تھا البتہ یہ یقین ہے کہ میرے ذہن میں اس قسم کی بات آرہی ہوگی کہ اگر کہیں اور کی بجائے یہ جنگ ہندوستان میں چھڑی ہوتی تو مجھے وکٹوریہ کراس ملتا یا پھانسی، یا اگر مرنے کے بعد مجھے پھر دنیا میں بھیج دیا جائے تو میں عقدِ ثانی کروں گا یا نہیں۔ اتنے میں مکان کے بیرونی حصے سے اندر آنے کا جو راستہ ہے اُس میں غیر معمولی شور وغل اور بھگدڑ سنائی دی۔ معاً میرے دل میں یہ آیا کہ میں جو کچھ سوچ رہا تھا ان میں سے کوئی نہ کوئی واقعہ اگر پیش آنہیں چکا ہے تو آنے والا ہے۔ چنانچہ دل میں ابھی ارادہ ہی کررہا تھا کہ مجھے اپنے تصورات کی بے راہ روی سے توبہ کرکے خدا سے معافی مانگنی چاہیے کہ کیا دیکھتا ہوں، دولڑکے کپڑوں کی ایک بھاری گٹھڑی اس طور پر اُٹھائے چلے آرہے ہیں جیسے کسی شکار کو اگلی پچھلی ٹانگوں سے لاد کر شکاری لاتے ہیں۔

گٹھڑی میرے سامنے لاکر ڈال دی گئی۔ معلوم ہوا، مکان سے قریب ہی جو نالا ہے اُس میں یہ کپڑے بکھرے ہوئے ملے۔ سارا گھر سمٹ کر مالِ غنیمت کے گرد اکٹھا ہوگیا۔ ان میں ہر قماش کے چھوٹے بڑے شامل تھے۔ اردو، ہندی، ہندستانی، رومن، رسم الخط، ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی، زندگی برائے بندگی اور بندگی برائے زندگی۔ ہر مسلک و مشرب یا چھپ تختی کی پوری نمائندگی تھی۔ ہر شخص اپنا ایک خیال پیش کرتا تھا اور دوسرا اُسے رد کردیتا تھا۔ کچھ ایسے تھے جو اُس پر ہنستے تھے، کچھ چراغ پا ہوتے تھے اور کچھ رونے والوں کی صورت بناتے تھے۔

آپ کی سہولت کی خاطر میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ کپڑے سارے کے سارے زنانہ اور روزمرّہ کے استعمال کے تھے۔ سوا چند پردوں اور میز پوش کے، اور بیش تر ایسے تھے جن کو اس

حادثہ سے کچھ ہی پہلے دھوبی نے مالک کے حوالے کیے تھے۔ چند پوٹلیاں ایک آدھ کاغذ اور دو چار اسی طرح کی اور مرنجاں مرنج چیزیں تھیں۔

سب سے پہلے میں نے یہ حکم دیا کہ میں ان تمام کپڑوں کو ہوم ڈیفنس ایکٹ میں لیتا ہوں کوئی شخص کپڑوں کو چھو نہیں سکتا اور نہ ایک سے زیادہ ایک وقت میں کوئی بدل سکتا ہے اور سب سے پہلے میں بولوں گا۔ میرے بول یہ تھے کہ:

''مجھے بتایا جائے کہ کہیں ہمارے ہاں تو چوری نہیں ہوئی ہے!''

میرے اس اہم استفسار یا اعلان پر کوئی مسخرہ اپنی جگہ سے نہ ہٹا، بعض نے البتہ چھت کی سمت، میز کے نیچے اور لوٹے کے اندر صرف گردن کو کھینچ تان کر دیکھ لیا۔ پھر بولا:

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ کپڑے ہمارے ہوں اور چوری دوسرے کے ہاں ہوئی ہو۔''

تیسرے نے کہا۔

''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چوری کہیں نہ ہوئی، لیکن کپڑے ہمارے ہوں۔''

اس پر ایک خاتون نے جو اپنی کرتوتوں سے اس خلفشار کے خلاف احتجاج فرما رہی تھیں اور جن کے سرہانے شور قیامت کے بھی جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

''بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لیے''، قسم کا نعرہ لگایا اور کہا۔

''خبردار جو کسی نے چون و چرا کی۔ ہمارے ہاں برابر چوری ہوتی رہی اور کسی نے ایک چیتھڑا بھی نہیں واپس کیا، ہم کیوں واپس کریں۔''

ایک طرف سے آواز آئی۔

''بے شک بے شک اور چوں کہ یہ معلوم نہیں کہ ہمارے ہاں آئندہ چوری نہ ہوگی اس لیے حفظِ ماتقدم کا بھی تقاضا یہی ہے کہ کپڑے جانے نہ پائیں۔'' میں نے کسی قدر غور و تامل کے بعد کہا کہ:

''شاید کسی دھوبی کے ہاں چوری ہوئی ہو اس لیے ممکن ہے کہ ہمارے وہ سارے کپڑے مل جائیں جن کے بارے میں دھوبی سے ہمارے تعلقات مدتوں سے مشتبہ یا ناخوش گوار چلے آتے ہیں۔''

میرے اس نظریہ کی حاضرین نے کچھ اس انہماک واحترام سے پذیرائی کی کہ مجھے اسے فوراً واپس لینا پڑا، لیکن اس احتیاط کی بنا پر کہ مقبول تحریک کو یک بہ یک ملتوی کردینے سے قوم میں بددلی اور مایوسی پھیل جانے کا قوی امکان ہوتا ہے میں نے تفتیش کا رُخ پلٹ دیا۔

میں نے کہا کہ:

''آپ صاحبان کی اُمیدوں پر پانی نہ پھیروں گا، لیکن میں چاہتا ہوں کہ حق کی تلاش جاری رکھوں، اور ان کپڑوں کے مالک اور چور دونوں کو نظرانداز کردوں۔ اس لیے کہ جب تک ہمارے ذہنوں پر ملکیت اور چوری کا تصرف رہے گا دنیا ہر پچیس سال کے بعد کسی نہ کسی صلح کے آشوب میں مبتلا ہوتی رہے گی۔ دیکھیے یہ سارے کپڑے زنانے ہیں اور ان میں کوئی کپڑا ایسا نہیں ہے جو کنٹرول سے ملا ہو اس سے صاف ظاہر ہے کہ زنانے کپڑوں پر کسی کا کنٹرول نہیں، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کپڑے جن خاتون کے ہیں اُن کا شوہر نہیں ہے یا شوہر کپڑے نہ پہنتا ہو یا جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ عورت مرد کا اور مرد عورت کا لباس ہے شوہر اور بیوی کے کپڑے ایک ہی ہوں۔''

محترم خاتون نے فرمایا۔

''مجھے پہلے کیوں نہ بتایا اب تو میں ان کپڑوں کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے گھر میں دیکھنا گوارا نہیں کرسکتی۔''

میں نے کہا:

''صبر کرد بے سوچے سمجھے جلد جلد نتائج استنباط کرنے سے اعصاب پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے تو بات یہاں تک مسلّم ہے، کہ شوہر کوئی نہیں، اور کپڑے رات میں چوری ہوئے اس سے میری ناقص رائے میں صاف یہ بات آتی ہے کہ یا تو شوہر چور ہے یا شوہر چوری ہوگیا!''

اتنے میں حاضرین میں سے کسی نے ایک طرف کاغذ کا ایک پرزہ کھینچ لیا۔ میں نے اسے فوراً اپنے قبضہ میں کیا اور پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ کوئی ڈاکٹری نسخہ تھا اور کسی لیڈی ڈاکٹر نے لکھا تھا، وہ یوں کہ کپڑے زنانے ہوں تو نسخہ بھی زنانہ ہوگا البتہ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس پر جو کچھ لکھا تھا وہ مرض کا نام تھا یا مریضہ کا۔ غور کرنے کے بعد یہ بات ذہن میں آئی کہ ممکن ہے اس پُرزہ کا تعلق اُس چور سے ہو جس نے چوری کی تھی اس لیے کہ یہ کچھ بعید از قیاس نہ تھا کہ اس نے

کسی کپڑے کی جیب تلاشی لینے میں غلطی کی ہو اور سہواً اپنی ہی جیب سے یہ پُرزہ نکال لیا ہو اور بے خیالی میں کپڑوں میں ڈال گیا ہو۔ اس نظریہ یا وسوسہ کی ماتحت پُرزہ پر نظر ڈالی گئی تو کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے اس پر نقشِ سلیمانی کے طلسماتی طغرے بنے ہوئے ہیں۔ میں نے کچھ تو احترام کے باعث نیز کچھ دور کی باتیں سوچ کر یہ پُرزہ اپنی جیب میں ڈال لیا۔

اس کے بعد میں نے کہا:

''اب اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ کپڑے کہاں اور کس سال میں ملے، اس سے ممکن ہے یہ پتہ چل سکے کہ ان کپڑوں کا زمان و مکان سے کیا رشتہ ہے۔ اسی رشتہ میں چور اور مالکِ مکان دونوں یقیناً کہیں نہ کہیں منسلک مل جائیں گے۔''

معلوم ہوا کہ گھر سے ذرا فاصلے پر جو پختہ نالا ہے اُس میں یہ کپڑے بکھرے ہوئے ملے۔ میں نے کہا:

''اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ چور مال لے کر چلا اور اندھیرے میں نالے میں گر پڑا فوراً سورج نکل آیا اور تم سب پہنچ گئے۔''

ایک نے کہا:

''پھر گٹھڑی بندھی ہوئی، کپڑوں کے بکھرے ہونے کے کیا معنی؟''

میں نے کہا:

''نالا گہرا اور ڈھلواں ہے۔ ممکن ہے گرنے میں چور نے گٹھڑی کا اور گٹھڑی نے چور کا سہارا پکڑا ہو۔ گٹھڑی کھل گئی اور چور بھاگ گیا ہو۔''

میری اس توضیح سے مطمئن نہ ہو کر ایک نے کہا کہ:

''اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ چور بھی گٹھڑی میں بندھا ہو۔''

میں نے کہا:

''بظاہر اس کے مان لینے میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی البتہ پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ایک نہیں دو چور تھے، ایک شرح معین دوسرا شکمی اور دوسرا پہلے کو گٹھڑی سمیت اپنے سر پر اُٹھائے ہوئے تھا۔''

حاضرین میں سے ایک نے کہا۔

''یہ سب تو ہوا، لیکن اگر پولیس والے آ گئے اور اُنھوں نے یہ مال ہمارے ہاں پایا تو ہم سب کو گرفتار کر لیں گے کہ یا تو ہم نے چوری کی یا چوری کے مال کا کاروبار کرتے ہیں۔''

میں چونک پڑا اور یہ سوچنے لگا کہ یہ کپڑے پولیس والوں کے حوالے کر دیے جائیں یا ان کو اُسی نالے میں پھنکوا دیا جائے جہاں سے یہ برآمد ہوئے تھے۔ پولیس کے حوالے کرنے میں یہ اندیشہ تھا کہ وہ مال پا جانے کے بعد چور کی طرف سے مطمئن ہو جاتے اور شاید ان کپڑوں کے مالک یا مالکہ کو بھی نظر انداز کر کے اخلاقاً میرے چال چلن کی اُلجھنوں میں پڑ جاتے۔ ایسی حالت میں یہ بھی ممکن نہ تھا کہ خود ہمارے ہاں کے کپڑوں کو حراست میں لے لیتے۔ ظاہر ہے میں اپنے ہاں کے کسی کپڑے کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکتا تھا کہ وہ کپڑے میرے ہی ہیں۔ نالے میں پھنکوانے میں یہ اندیشہ تھا کہ ممکن ہے خود چور آس پاس منڈلا رہا ہو، اور وہ ہم کو چور قرار دے کر گرفتار کرا لے۔

میں نے فی الفور اعلان کیا کہ:

''سب لوگ خاموش ہو جائیں۔ میں خود تفتیش کرنے نکلتا ہوں یا تو چور ہی مل جائے گا یا وہ جس کے ہاں چوری ہوئی تھی۔ البتہ اس کا خیال رکھا جائے کہ سارا واقعہ آسیبی معلوم ہوتا ہے ایسا نہ ہو کہ ان میں سے کوئی کپڑا ہمارے کپڑوں میں اُڑ کر جا ملے یا ہمارے ہاں کا کوئی کپڑا ہم سے ٹوٹ کر ان میں جا ملے!''

گھر سے نکل کر محلّہ میں کچھ دور گیا تھا کہ ایک اندھے زمیں دوز کنوئیں کے اردگرد محلّہ کے سارے چھوٹے بڑے آستینیں چڑھائے آنکھیں نکالے سینہ تانے پس و پیش سے ہنکارتے پھنکارتے نظر آئے۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ رات کا چور پکڑ لیا گیا ہے۔ بڑا شاطر معلوم ہوتا ہے کہ نالے سے کنوئیں تک زمین دوز راستہ بنائے ہوئے ہے۔ کنوئیں کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک پروفیسر صاحب کی کسی سانپ سے دوڑ بدی تھی، ابتدا میں پروفیسر صاحب آگے تھے، لیکن کچھ دیر کے بعد سانپ آگے نکل گیا، سامنے اندھا کنواں تھا وہ تو اس میں جا گرا اور پروفیسر صاحب پر ہارنے کا کچھ ایسا صدمہ ہوا کہ کنوئیں کے حاشیہ پر پہنچ کر بے ہوش ہو گئے۔ برادری کے سارے

چھوٹے بڑے پروفیسر اور ان کے حوالی موالی جمع ہو گئے تھے، سانپ کو کنوئیں میں مار ڈالنے یا اس کو باہر نکال کر ٹھکانے لگا دینے کا مسئلہ تھا۔

کچھ لوگ کنوئیں میں سانپ کو طرح طرح سے چیلنج دے رہے تھے اور کچھ اس فکر میں تھے کہ اگر پروفیسر صاحب کو سانپ نے کاٹ کھایا تھا تو مقام ماؤف کہاں تھا۔ بعض اس پر مصر تھے کہ جگہ تو بعد کو معلوم ہوتی رہے گی احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ کہیں سے شگاف دے کر لال دوا بھری جائے۔ احتیاط یا عوام کا یہ تقاضا دیکھ کر پروفیسر صاحب بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اب سانپ کی باری آئی، اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ سانپ کو بھی پروفیسر صاحب سے کوئی گزند نہیں پہنچی تھی قوم نے سانپ کے اعزاز میں باجے بجائے اشتعال انگیز تقریریں کی، نعرے لگائے، اینٹ پتھر برسائے، لیکن سانپ جہاں کا تہاں رہا مجمع البتہ بڑھنے لگا۔

ایک صاحب نے کہا۔

''اس کو زہر دے دیا جائے۔''

یہ ترکیب سب نے پسند کی اور سوچا یہ جانے لگا کہ زہر دیا کیوں کر جائے۔ بالآخر طے یہ پایا کہ زہر مینڈک کو دیا جائے، مینڈک مچھلی مارنے کے کانٹے میں پھنسا کر ڈوری سے نیچے کیا جائے۔ سانپ مینڈک کے ساتھ زہر کھائے گا اور مر جائے گا۔ اس اسکیم کو پورا کرنے کے لیے کچھ لوگ اِدھر اُدھر بھاگے اور تھوڑی دیر میں واپس آ گئے، دریافت کرنے پر کہ زہر کہاں سے حاصل کیا جائے اور کون ساز ہر ہو، ایک صاحب ایک مینڈک بھی پکڑ لائے، لیکن اس مینڈک کو دیکھ کر لوگوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ یہ مینڈک خود سانپ کو ہضم کر جائے گا۔ بالآخر ایک صاحب گھر جا کر ایک گھڑا اُٹھا لائے اور اس کو ایک رسّی سے کنوئیں میں اُتارا گیا۔ پری کو شیشے میں اُتارنے کے جتنے جتن کیے گئے اُن سے کہیں زیادہ سانپ کو گھڑے میں رونق افروز ہونے کے لیے کیے گئے۔ بالآخر کامیابی ہوئی رسّی دھیرے دھیرے کھینچی جانے لگی، دو چار ہاتھ لب بام رہ گیا تھا کہ سانپ نے اپنا منہ نکالا اور حاضرین کا تپاک پھن نکال کر ایسی پھنکار سے کیا کہ قوم کے ہاتھ سے رسّی چھوٹ گئی اور سارا اثاثہ کنوئیں کے اندر پہنچ گیا لڑکوں نے تالیاں بجائیں بزرگوں نے خفت مٹانے کے لیے بچوں کے کان اینٹھے، کمیٹی آف ایکشن کا نئے سرے سے اجلاس ہوا۔ بحث شروع ہوئی، کسی نے کہا:

''کنوئیں کو پاٹ دیا جائے۔''

کسی نے فرمایا:

''کنوئیں میں آگ لگا دی جائے۔''

ایک نے کہا:

''کنوئیں کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جائے۔''

سب کے سامنے مشکل یہ تھی کہ سانپ نکالا جائے تو مارا کیسے جائے گا اور اگر وہ بھاگ گیا تو محلّے میں کسی کی جان محفوظ نہ رہے گی۔ ایک صاحب نے بندوق سے مار ڈالنے کی تجویز پیش کی جو فوراً منظور کی گئی، بندوق لائی گئی، اور ہر طرح کے کارتوس آزمائے گئے، لیکن سانپ ہر آزمائش میں زندہ رہا۔ بالآخر گھڑے والی ترکیب پھر عمل میں لائی گئی اور طے یہ پایا کہ جب گھڑا اُوپر آجائے تو ایک لمبے ڈنڈے سے اُسے بالا بالا کنوئیں سے باہر دور تک معلّق پہنچایا جائے اور وہاں ڈنڈا اسکواڈ تعینات ہو، گھڑا رکھ دیا جائے اور بہ یک وقت ڈنڈوں سے حملہ کر کے موذی کو جہنم رسید کر دیا جائے۔

یہی کیا گیا، اسکیم پورے طور پر کامیاب ہوئی، گھڑا سطحِ زمین سے کچھ اونچا ہی تھا کہ درجنوں ڈنڈے گھڑے پر پڑے، مجمع سے آواز بلند ہوئی ''وہ گیا۔'' سانپ ایک طرف بے تحاشا بھاگتا چلا جاتا تھا، اور ڈنڈا اسکواڈ ایک دوسرے کو ابتدائی طبی امداد فرسٹ ایڈ پہنچا رہا تھا۔ سامنے سے ایک بڑے ہی سوکھے ساکھے جہان سے بیزار ایک مولانا تشریف لا رہے تھے، لوگوں نے شور مچایا۔

''مولانا بھاگو بھاگو سانپ، سانپ،'' مولانا کو ذرا دیر میں خبر ہوئی دیکھا تو سانپ اُن سے کترا کر بھاگا جا رہا تھا۔ مولانا نے فوراً ہی پاؤں سے پنجابی جوتا اُتارا اور لپک کر دو ہاتھ رسید کیے سانپ ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے بعد سارا مجمع ٹوٹ پڑا، سورماؤں نے مرے ہوئے سانپ کا بھُرتا بنا ڈالا اور مولانا کی تعریف شروع کی، مولانا بالکل متاثر نہ ہوئے، معلوم ہوا کہ رات کو تراویح پڑھنے گئے تھے، گھر میں کوئی نہ تھا چوری ہو گئی۔ سنا ہے چوری کے کپڑے کسی صاحب نے اپنے قبضے میں کر لیے ہیں اُن کی تلاش میں نکلے ہیں، اب میں بھاگا اور بھاگتا چلا گیا۔

(نشریہ۔ دسمبر 1946، مطبوعہ: ساقی، دہلی۔ جنوری 1947) ●●●

کیا کیا نہ کیا — تعلیم کی خاطر

تعلیم و تعلّم میرا پیشہ ہی نہیں میرا شیوہ بھی رہا ہے۔ میں نے یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہی ہے بلکہ ایک ذرا ہچکچاہٹ کے ساتھ کہی ہے، اور آپ سے کیا پردہ، میں کچھ ایسا سمجھتا ہوں کہ فخر کی باتوں کا ایک عام اور عجیب قاعدہ یہ ہے کہ ہچکچاہٹ اس کے جلو میں چلتی ہے، اور ایسے دبے پاؤں چلتی ہے کہ دوسروں کو اس کی چاپ سنائی نہیں دیتی، لیکن جس کے ساتھ چلتی ہے وہ محسوس کرتا رہتا ہے کہ اس کے قدم ہموار اور ہلکے نہیں پڑ رہے ہیں! فخر کی باتیں ایسی نہ ہوتیں تو لوگ اُن پر فخر کرنا قابلِ فخر نہ سمجھتے۔ تشکّک اور یقین آفرینی کی یہی اُلٹ پھیر تو ہے جس نے بڑی بے تکلفی سے علم کا کاروبار کرنے یا اُس میں پھنسنے والوں کی راہ کو ہمیشہ اپنی جاگیر سمجھا، اور اس میں دخل در معقولات کو اپنا حق ہی نہیں اپنا فرض بھی جانا۔ دنیا میں فنونِ لطیفہ کی کمی نہیں، لیکن اگر کوئی لطف بہ یک وقت فن بھی ہے اور تفنن بھی تو یقیناً وہی نہ جاننے اور معلوم کرنے کی باہمی رسّا کشی جو رضا کارانہ سپردگی کو فاتحانہ سرخوشی سے ہم کنار کرنے اور رکھنے سے کبھی نہیں تھکتی!

اس سپردگی اور سرخوشی کو میں نے اپنی گذشتہ زندگی کے بے انتہا ارزاں مگر ساتھ ہی ساتھ معصوم و مخلص نقوش میں کچھ اس طرح کھویا اور پایا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا میں اس وقت یہ داستان کہاں سے شروع کروں؟ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہاں بظاہر ''ماحول'' کی کوئی بات نہ تھی یا یوں کہیے کہ جن معنوں میں اور جس طرح آج کل ''ماحول'' کا چہرہ باندھتے ہیں

اس طرح اور ان معنوں میں ماحول کا وہاں گزر نہ تھا۔ اُس وقت اہمیت زندگی کی نہیں زندہ رہ سکنے کے وسائل کے تلاش کی تھی۔ ایسے براہ راست وسائل جو قوت کو لایموت کی نفی بنا سکیں اور بس۔ میں اسے کوئی بہت انوکھا تجربہ تو نہیں کہہ سکتا پھر بھی میں نے اپنے سامنے معاشرت اور معاشرت سے زیادہ معیشت کا ایک خاص ڈھانچہ یا کاروبار ضرور دیکھا جس کے طفیل فرد کے ہاتھوں یہ صبح و شام کچھ اتنا سنبھالے سنوارے نہیں جاتے جتنا یہ خود فرد کو سنورتے بدلتے گزر جانے پر بڑے انفعالی انداز سے مجبور کر دیتے ہیں۔ صبح و شام کا یہ دھارا یا دو آبہ نہایت خاموش اور بے ضرر ہو کر بھی قطروں کا نہ خود احترام کرتا ہے اور نہ ان کو اتنی مہلت دیتا ہے کہ وہ اپنے احترام کے بارے میں کچھ سوچ سکیں!

بہر حال تنگ ظرفی منصور سے قطع نظر، قطرہ کا جو میرا ذاتی تصوّر ہے وہ اگر دریا کا نہیں تو سوتی کا ضرور ہے! دریا دوسرے کا ہو تو موتی میں اپنا اور اپنے ہی لیے رکھنا چاہتا ہوں مجبوری اور مختاری نے اپنا حل یا تعبیر مجھے یہی بتائی ہے۔ سوتی دریا سے بے گانہ ہو کر تو نہیں، لیکن اُس سے منہ موڑ کر صدف کے آغوش میں لہر لہر کو ٹوٹا زندگی کی جدو جہد یا جدو جہد میں زندگی کا انجام اور انعام دونوں سمجھتا ہے۔ یہ جستجو مجھے تعلیم کے طفیل نصیب ہوئی یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ تعلیم کی لگن ہی کی صورت تھی۔ کچھ یہ سوچ سمجھ کر کہ آغوشِ صدف آغوشِ عافیت ہی نہیں ہے بلکہ آغوشِ وداع بھی ہے، اور کچھ یہ کہ جو بات ذہن میں کبھی کبھی مبہم اور موہوم سی پیدا ہوتی ہے، اُسے مہم کی شکل کیوں نہ دے دی جائے، میں نے اندھیرے میں ایک چھلانگ لگا دی۔ اندھیرے میں چھلانگ لگانے کا جو مزا ہے، آپ میں سے کوئی نہ کوئی ضرور ایسا ہوگا جو خوب جانتا ہوگا!!

میں گھر سے نکلا تو ایسے میں جب نہ گھر کو میرے چھٹنے کا غم تھا نہ مجھے گھر کے چھٹنے کا ہم دونوں ایک دوسرے کو قابلِ رحم ضرور سمجھتے تھے اور ایک دوسرے سے بے نیاز بھی! حقوق و فرائض، اُمید و مایوسی سے کچھ اس طرح گڈمڈ ہو گئے تھے کہ الگ الگ اُن کی صورت ٹھیک سے پہچانی نہ جاتی تھی۔ مجھے گھر کی مدد کی ضرورت تھی یا گھر کو میری۔ یہ ایک مسئلہ کی صورت میں بھی میرے سامنے آتا تھا اور ایک مہم کی صورت میں بھی! طفلی کی ترنگ اور بڑھاپے کی سوجھ بوجھ میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ بڑھاپے میں معمولی سے معمولی مسئلہ بھی مہم کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور بچپن میں

بڑی سے بڑی مہم معمولی سی ترنگ بن کر رہ جاتی ہے۔ میں گھر سے نکلا تو تھوڑی دیر کے لیے یہ بات دل میں آئی کہ میں گھر والوں کے آسرے کو اپنی ہوس یا حوصلہ سے کس بے دردی سے کچل رہا ہوں، لیکن میں نے دل کو یہ سبز باغ دکھایا کہ ماں باپ تو جس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں کر ہی لیں گے۔ یہ لوگ بڑے عبادت گزار ہیں، اور گھر کے دھندوں میں دل و جان سے منہمک رہتے ہیں۔ ان پر کوئی آفت نہیں آسکتی اور آئے گی بھی تو ان کے سامنے اُس کی پیش نہ جائے گی! اس لیے ان کو اُن کے خدا پر یا اُن کے دھندوں میں چھوڑ دیا جائے تو کوئی ہرج واقع نہ ہوگا اور میں چل دیا۔!

معاف کیجیے گا، غالباً میں یہاں ضرورت سے کچھ زیادہ ذاتی ہونے لگا ہوں، یعنی کرنے نہ کرنے کے سلسلہ میں مَیں نے اب تک تعلیم سے زیادہ خود اپنی خاطر کو ملحوظ رکھا ہے۔ آپ منتظر ہوں گے کہ تعلیم کے سلسلہ میں جن اصحاب، جن حادثات اور جن قربانیوں سے میں دوچار ہوا اُن کی تفصیل آپ کو سناؤں۔ اوّل الذکر دونوں کے بارے میں تو میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ میں خود طے نہیں کر سکا ہوں کہ جن اصحاب یا حادثات کے بارے میں مجھے کچھ کہنا چاہیے اُن میں کون سے اصحاب حادثات تھے اور کون سے حادثے آں جناب! رہی قربانی تو مجھے اس کی خاطر کوئی ایسی بات نہیں کرنی پڑی جسے صحیح معنوں میں قربانی کہا جا سکے۔ اس لفظ میں مجھے کچھ مظلومیت کچھ احساسِ ایذا کچھ داد پانے کی تمنا اور نہ ملنے کی حسرت کا خیال آجاتا ہے جیسے کسی اچھی تصویر پر کوئی دھبہ آجائے وہ دھبہ نہیں جو بھولے سے پڑ جائے بلکہ ضبط و اعتماد کی وہ کمی یا کمزوری جو رنگوں سے امتزاج کا کام نہیں لے سکتی تو ہولی کھیلنے لگتی ہے۔

میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اُس میں مانٹی سوری اور جان ڈیوی ابھی انسان ہی تھے اصول نہ بن سکے تھے۔ ان دونوں کو الگ الگ سمجھنے سے ممکن ہے آپ انکار کردیں، لیکن آخر اصول کا غیر شخصی ہونا اور شخص کا ہر اصول میں استثنا تلاش کر لینا کچھ نہ کچھ اہمیت تو رکھتا ہی ہے یہ میں نے اس لیے کہا کہ لوگ اصول کو جلد یا بہ دیر کسی نہ کسی موقع یا مصیبت میں مان ہی لیتے ہیں، لیکن شخص کو بخشنے یا اُس کے قائل ہونے میں ہمیشہ کسرِ نفسی سے کام لیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کسر اپنی اور نفس دوسرے کا! ورنہ اپنے نفس کو تو کسر و انکسار کا موقع شاذ ہی

دیا جاتا ہے! اور یہ سب کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے تعلیم حاصل کرنے میں سختی ضرور اُٹھائی ہے، لیکن یہ اب تک طے نہ کر سکا کہ یہ سختی پیسہ کی کمی کے سبب سے تھی یا ''جذبہ بے اختیار شوق'' کے باعث!

میں نے تعلیم جس طرح اور جس حد تک پائی اس کی تفصیل دینے سے میں نے ہمیشہ گریز کیا اس لیے نہیں کہ اس نشہ میں نشاط کم اور تلخی زیادہ ہے یا اس کے برعکس بلکہ جب سے مجھے تعلیم کی خاطر کچھ نہ کچھ کرنے یا کر گزرنے کا خیال پیدا ہوا اور میں کبھی اپنے خیال اور حوصلے کو ایک دوسرے سے تمیز نہ کر سکا اُس وقت سے مجھے یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ میں کنواں کھودنے اور پانی پینے کے عمل میں زیادہ فصل دینے کا متحمل نہ ہو سکا۔ میں نے تو چھوٹے موٹے چشموں ہی سے سیراب ہو کر تشنگی کو پالیا اور اس سلسلہ میں سمندر کی اصل و کائنات بھی سامنے آ گئی میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی باتیں سمجھ لیتا تھا، بڑی باتوں سے چھوٹی باتیں میری سمجھ میں کبھی نہ آئیں۔ شاید اسی سبب سے میں نے منہ کے چھوٹے ہونے کو بات کو بڑے ہونے میں کبھی سدِّ راہ نہ سمجھا!

میری تعلیم کی ابتدا تو علی گڑھ میں نہیں ہوئی، لیکن آج کے موضوعِ گفتگو یعنی ''تعلیم کی خاطر کیا کیا نہ کیا'' کا سب سے سیدھا اور مختصر جواب مجھ سے پوچھا جائے تو میں صرف علی گڑھ، کہہ کر خاموش اور مطمئن ہو جاؤں گا۔ یہاں ایک بات کہنے کو جی تو نہیں چاہتا، لیکن کہنا اس لیے پڑ رہا ہے کہ اُس کے ساتھ جو دوسری بات بتانا چاہتا ہوں وہ کسی اور طرح سے بتائی نہیں جا سکتی۔ یعنی میں نے علی گڑھ میں اپنی تعلیم کا زمانہ اُس فراغت سے نہیں گزارا جس فراغت سے بظاہر علی گڑھ کا وہ زمانہ گزرتا نظر آتا تھا، لیکن علی گڑھ میں مجھے فضا ایسی ملی کہ میں نے سختیوں کو جھیلنا مصیبت یا توہین نہیں سمجھا بلکہ اُن مصیبتوں کو چھپانے اور اُن سے عہدہ برآ ہونے کو ایک طرح کی اپنی ذاتی فتح محسوس کرتا رہا، اور مجھ میں وہ بیزاری، مایوسی اور زہر ناکی پیدا نہ ہوئی جو افلاس و کس مپرسی میں عموماً نوجوانوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ بذاتِ خود میں نے افلاس و مصیبت کو سوسائٹی، حکومت یا مذہب کی ناکامی یا نالائقی قرار دینے کے بجائے محض اپنا ذاتی واقعہ یا حادثہ سمجھا ہو جسے اپنی ذاتی کوششوں ہی سے دور کرنا مناسب تھا!

اُس زمانہ کو بیتے مدت ہوئی۔ اب سوچتا ہوں تو یہ خیال بھی آجاتا ہے کہ ممکن ہے میرا عقیدہ صحیح نہ رہا ہو، لیکن بات کوئی ہو میں نے اپنے مرض کا علاج کر ہی ڈالا۔ اور صرف مرض کے سمجھنے یا اُس کی تشہیر میں اپنے کو نہیں گنوایا!

میں کالج میں ایسے بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا، جو کچی بارک کے نام سے مشہور تھا۔ اس عمارت کی حیثیت و ہیئت کا اندازہ صرف وہ شخص کرسکتا ہے جس نے نہ صرف اُسے دیکھا ہو بلکہ اس میں رہا بھی ہو۔ آج کل کسی تعلیم گاہ میں ایسی عمارت نظر آجائے تو عورتیں غش کھا جائیں، طالب علم نعرے لگانے لگیں، اور اقوام متحدہ میں پھوٹ پڑ جائے۔ معلوم نہیں کس انجینئر نے اُس کا نقشہ بنایا تھا اور کس درویش نے اُس پر کچھ پڑھ کر پھونک دیا تھا کہ ہر موسم میں اُس کے کمرے اور برآمدے کا درجۂ حرارت بالکل وہی ہوتا تھا جو باہر کھلے میدان کا ہوتا۔ کوڑے کرکٹ کے ہر طرح کے نمونے جو باہر دور دور مل سکتے تھے وہ اُس کے کمروں اور برآمدوں میں رونق افروز رہتے! کواڑ بند رکھیے یا مقفل کیجیے باہر کی چیز اندر اور اندر کی باہر بغیر کسی تکلف کے آتی جاتی رہتی۔ آپ نے کیسی ہی احتیاط سے مرغی پر ہاتھ صاف کیا ہو، کچی بارک کے ہر کمرہ میں اس کے پر، داد خواہ نظر آئیں گے۔ اس طور پر چور پکڑ لیا جاتا۔ چنانچہ مرغی ذبح کوئی کرتا، حلال دوسرے ہی کرتے بارش کا پہلا قطرہ براہِ راست آپ کی چارپائی پر گرتا اور اگر آپ کی عادت سونے میں سانس منہ سے لینے کی ہوتی تو یہ دریتیم وہیں نازل ہوتا اور پکارتا:

از خواب گراں خیز [1]

میں نے چار سال تک اسی کچی بارک کے ایک ہی کمرہ میں ایک ہی سمت ایک ہی مرکز اور ایک ہی چارپائی پر گزارے! میں جس قسم کے مضامین لکھنے سے متصف یا متہم ہوں اس کی ابتدا اسی کچی بارک سے ہوئی۔ یعنی میں نے پہلا مضمون "گل منزل" کے عنوان سے اسی کچی بارک پر لکھا۔ کچی بارک کا یہ نام میرا ہی دیا ہوا ہے۔ اب کچی بارک اور گل منزل دونوں کی جگہ اللہ کا نام ہے!

کالج کے ڈائننگ ہال کا کھانا کالج کا سب سے عجیب و دلچسپ حادثہ تھا۔ جس کی لذت، مقدار، بو، رنگت اور نوعیت میں گذشتہ 75 سال سے کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ

---

1 گہری نیند سے بیدار ہو جاؤ!

ہر شخص کے مزاج، صحت، سیرت، عمر، پیشے اور حلیہ پر اس کا اثر یکساں رہا اور اب بھی ہے ایک بار اس پر اسٹرائک ہوا کہ کھانا خراب ہے، کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ دوسری بار اس پر اسٹرائک ہوا کہ خراب تر کیوں نہیں ہوتا، اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ تیسری بار بھوک ہڑتال کی گئی تو لوگوں کی بھوک غائب ہوگئی۔ تمام سائنس داں اس کا بھید پانے سے معذور ہو گئے تو ایٹم بم بنانے لگے!

کھانا کھانے کے لیے ڈائننگ ہال میں ہر شخص کو کالے ٹرکش کوٹ، سپید پاجامے، ترکی ٹوپی، انگریزی جوتا اور موزہ پہن کر جانا پڑتا تھا۔ ایک دن میں ٹینس کے کپڑے میں جا پہنچا تو مانیٹر نے دروازہ پر مجھے ایسے بُرے اور کڑے تیوروں سے گھورا کہ میں بغیر کسی چوں وچرا کے واپس آیا اور یونیفارم پہن کر پہنچا تو ڈائننگ ہال ختم ہو چکا تھا۔ وہ رات میں نے فاقہ سے گزاری اور لطف یہ کہ مانیٹر میرا سب سے غبی ہم سبق تھا جو ہر روز ایک خاص مضمون میں مدد لینے میرے پاس آیا کرتا اور خوشامد کیا کرتا!!

میرا سابقہ بعض ایسے پروفیسروں سے تھا کہ اگر وہ آج ہوتے تو لڑکے یا تو اُن کو مار ڈالتے یا وہ کسی دن اپنے کمرہ میں خود بخود مردہ پائے جاتے۔ اُن میں ایک ایسے تھے جن کا مقولہ تھا کہ رٹے بغیر کوئی علم نہیں آتا میرا حافظہ ہمیشہ سے نیاز مند رہا۔ وہ مجھ پر اسی لیے خاص طور پر مہربان رہتے تھے کہ وہ جب مجھ سے منہ زبانی، کچھ سننا چاہتے تو میرے ہاں 'زبانِ بے زبانی' کے سوا کچھ اور نہ ہوتا۔ میں نے کلاس میں آنا چھوڑا تو انھوں نے میرے کمرہ پر آنا شروع کیا۔ اب میرے لیے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ میں رٹنا شروع کردوں اس رٹنے میں مجھے سب سے بڑی خرابی یہ نظر آئی کہ رٹتا میں کچھ اور تھا اور یاد کچھ اور ہوتا۔

مجھے سب سے زیادہ نفرت واقعات کے سنہ ولادت یاد رکھنے سے تھی، اس کے بعد نقشہ بنانے سے۔ واقعات یاد کرتا تو تاریخ بھول جاتا، اور تاریخ یاد کرتا تو واقعات فراموش ہو جاتے! اور دونوں یاد ہوتے تو امتحان کے پرچے میں وہ سوال بھول جاتا جس کے یہ جواب ہوتے۔ نقشہ بنانے کی میں نے بڑی مشق کی، لیکن ہوتا یہ کہ ہندوستان کا نقشہ بناتا تو اُس پر افریقہ کا گمان ہوتا اور افریقہ کا بناتا تو ہندوستان کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا پھر ان نقشوں میں مقامات متعین کرنے میں مجھے جو دقت پیش آتی وہ ناگفتہ بہ۔ پروفیسر صاحب یونان وروما کی قدیم تاریخ

پڑھاتے تھے اور اُسی زمانہ کا نقشہ بنواتے تھے مجھے ناموں کا صحیح تلفظ بھی نہ آتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بنے ہوئے خاکے میں، مجھ سے بعض مقامات درج کرنے کی فرمائش کرتے۔ میں عرض کرتا کہ آپ جو نام بتارہے ہیں وہ مقامات تو ہو نہیں سکتے امراض ہو سکتے ہیں اور امراض کو مقام سے کیا سروکار!

ایک دوسرے پروفیسر منطق کے تھے۔ وہ بھی اپنی تمام تر کوشش رَٹانے پر مرکوز رکھتے! بار بار یہ کہتے تھے کہ دنیا کا ہر بڑا آدمی رَٹنے ہی سے بڑا آدمی ہوا ہے۔ اُن کی منطق یہ ہوتی کہ ہر بڑا آدمی Genius ہوتا ہے! جینیس وہ ہے جس میں محنت کرنے کی بے پایاں استعداد ہو، رٹنے میں بے پایاں محنت کرنی ہوتی ہے اس لیے رَٹنے سے آدمی بڑا بن جاتا ہے۔ کلاس میں میرے غبی ہونے سے وہ مجھ سے خفا رہنے لگے، اور جب وہ مجھ سے خفا رہنے لگے تو میں بھی اُن سے بے باک ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن اُنھوں نے مجھے کلاس سے باہر نکال دیا میں نے بھی کلاس جانا چھوڑ دیا۔ ایک دن انھوں نے مجھے ایک جنازہ کے ساتھ جاتے ہوئے پکڑ لیا، اور بولے، ''تم کلاس میں کیوں نہیں آتے؟''

میں نے کہا۔

''میں نے منطق چھوڑ دی میں رَٹ بالکل نہیں سکتا۔''

پوچھا۔

''اور کون سا مضمون لیا؟''

میں نے کہا۔ ''نمازِ جنازہ''

پروفیسر صاحب نے اس پر کچھ ایسی باتیں کیں یا کہیں کہ میں کچھ سمجھ نہ سکا کہ اُن کے میرے آئندہ تعلقات کیسے رہیں گے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ ''تم کل کھانا میرے ساتھ کھاؤ'' ——— میں راضی ہو گیا اور یہ منطق مجھے آج تک نہیں بھولی!!

(مطبوعہ: (1) کانفرنس گزٹ۔ 16/مارچ 1947۔ (2) نشریہ۔ 17/فروری 1947)

●●●

چلمن

ابھی آپ اناؤنسر صاحب کی ''گفتنی'' سن رہے تھے۔ اب اس خاکسار چلمن کے منہ سے کچھ ''ناگفتنی'' سنیے۔ خاکسار چلمن کے منہ سے کچھ ناگفتنی بول ہیں:

''محمل میں جو چھپتے ہیں، چھپتے نہیں محمل سے''

معاف کیجیے گا، قبل اس کے کہ آپ احتجاج کریں، محمل یا اس میں چھپنے والوں کے معاملات یا کاروبار میں مخل ہونے پر میں خود معذرت خواہ ہونے کا ارادہ کر رہا ہوں، لیکن اپنی اس حسنِ نیت کی داد بھی چاہتا ہوں۔ ذرا سوچیے میں کتنی آسانی سے ''محمل'' کی بجائے اس مصرعے کو یوں کر سکتا تھا:

''چلمن میں جو چھپتے ہیں، چھپتے نہیں چلمن سے۔''

اور آپ اس بے ایمانی یا بدمعاملگی کو معلوم کرنا تو درکنار، اس کی موزونیت پر اُلٹے سر دُھنتے کیوں کہ آپ کا حافظہ جیسا کچھ ہے، بظاہر ہے!

آپ خفا نہ ہوں، یہ میں نے محض تفریحاً کہا ہے۔ چلمن سے تفریح کے ایسے جانے کتنے پہلو نکلیں گے اور جب میں چلمن بننے پر آمادہ ہو رہا ہوں، تو آپ سے تفریح لینے کا یہ حق تو مجھے بہر حال ملنا چاہیے ورنہ یوں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کے بارے میں میری رائے بہت اچھی نہ ہوتی تو میں آپ کے ریڈیو سیٹ کو اس طرح چلمن بنانے پر کبھی نہ تیار ہوتا جس کے لیے کہا گیا ہے:

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں[1]

ریڈیو کی یہ چلمنی حیثیت تو آپ بھی مانیں گے، یہ دوسری بات ہے کہ اس سے لگ کر بیٹھنے کا اطلاق مجھ سے زیادہ آپ ہی کے اوپر ہوتا ہو۔

ریڈیو کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اسے بولنے والے کا پردہ یا بھرم رکھنا خوب آتا ہے اور اس کی یہی خصوصیت اسے مجھ جیسے چلمن صفت سے اس قدر قریب اور اسے اتنا محبوب رکھتی ہے۔ اس طرح کے پردے جس میں منصور کی زبان اور خدا کی آواز کو یکجا کیا جا سکے۔ ہماری زندگی کے سب سے زیادہ دلچسپ عنوان ہوتے ہیں اور ان کا فریب کھاتے ہم عمر بھر نہیں تھکتے۔ چلمن جس کی دھوپ چھاؤں چھپا کر بھی دکھاتی ہے اور دکھا کر بھی چھپاتی ہے! جو "فانوس کی گردش" سے ہر ضرب دل کو نیا پن بخشتی اور ہر کہنگی کو تازگی، جس میں ماضی کی لاش سے حال کی دلہن سجانے اور خاک کی صورتوں کو لالہ وگل میں نمایاں کرنے کی عجیب صلاحیت ہے۔

شاید وہ کوئی دیوانہ تھا جس نے دنیا کو اسٹیج یا پردۂ تمثیل سے تشبیہ دی تھی جس میں ہر اداکار کو اپنے بجائے کوئی اور شخص بننا اور ظاہر کرنا پڑتا ہے اور تمام عمر اس داخلی و خارجی زندگی کی چولیں بٹھانے کی فرصت نہیں ملتی اور بے چارہ تماشائی (ہم میں سے ہر ایک دوسروں کا ہی نہیں اپنا بھی تماشائی ہے) یہ فیصلہ ہی نہیں کر پاتا کہ اصل کہاں ہے اور نقل کہاں، تمثیل کہاں ہے اور واقعہ کہاں، چلمن کی تیلیاں کہاں اور روئے نگار کہاں۔ ہر آواز کسی اور آواز کی گونج معلوم ہوتی ہے، ہر نقش کسی اور نقش کا سایہ، ہر زندگی کسی اور زندگی کا عکس، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ "کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک" ہے یا "آوازِ رحیلِ کارواں"! "کوئی سچ سچ نہیں، کوئی جھوٹ جھوٹ نہیں" یہ کسی مخصوص تشکک ہی کا مسلک نہیں زندگی کا وہ عجیب وغریب مسئلہ ہے جس نے ظاہر و باطن کو تانے بانے کی طرح پرو دیا ہے اور ان تاروں کو الگ کرتے ہی وہ چیز بیت جاتی ہے جسے ایک فرد کی زندگی کہتے ہیں۔

---

[1]

آپ اس سے یہ نہ سمجھیں کہ میں چلمن کی پاس داری اس لیے کر رہا ہوں کہ انجمن چلمنانِ ہند نے مجھے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے، یا کسی ایسی ویسی چلمن نے میری نظروں کو دعوتِ نمائندگی دی ہے۔ یہ شبہ تو شروع ہی سے تھا کہ "محمل میں جو چھپتے ہیں، چھپتے نہیں محمل سے" کا اعلان کرتے سن کر آپ چند در چند غلط فہمیوں کا شکار ہو جائیں گے مثلاً یہ کہ اس سلسلہ میں میں نے کون سے "درونِ پردہ"، قسم کے راز طشت از بام کرنے کی ٹھانی ہے۔ ممکن ہے آپ یہ بھی سوچ رہے ہوں کہ محمل سے میرے تعلقات کیسے کچھ تھے اور اب ان کی کیا نوعیت ہے جو گھر کا بھیدی سمجھ کر مجھے اس لنکا کے ڈھانے پر مامور کیا گیا ہے، یا یہ کہ آخر چلمن بننے کی مجھ میں کون سی ایسی نشانی یا صلاحیت تھی کہ باوجود یک بینی و دوگوش کے مجھے ہمہ بینی و گوش کی سعادت نصیب ہوئی یا کرائی گئی ہے!

ان معاملات کی تفصیل تو رہنے ہی دیجیے، اور سر دست صرف اس بات پر یقین کیجیے کہ اپنے کو چلمن سمجھنے یا کہلانے کا حق یا خبط ہر اُس شخص کو ہے جس کی نہ اللہ دے نہ بندہ لے قسم کی بیوی، حسن اور پردے کی کشاکش میں دوستوں کی توجہ اور دلچسپی کا سبب بن جاتی ہے۔ آپ ایسے بہت سے شوہروں سے واقف ہوں گے (یہاں آپ اپنے کو نظر انداز کر سکتے ہیں) جو آپ کی دوستی کا دم بھرنے کے پردے میں اپنی بیوی کے حسن اور سگھڑاپے یا ان کے بے پناہ جذبۂ خلوص، دوست پروری کا اس دل و جان سے تذکرہ کریں کہ آپ بس قائل ہوتے ہوتے بچیں، اور اس کی حقیقت اس وقت کھلتی ہے جب...... لیکن ذرا ٹھہریے۔ آگے سب کچھ پردۂ اخفا میں ہے۔ میں اس وقت چلمن کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دینے میں کوتاہی کر رہا تھا۔ ورنہ سوچئے تو اگر حقیقت کا ٹھیک ٹھیک اور مکمل طور پر انکشاف آپ پر ہو جائے تو چلمن کا فائدہ ہی کیا! اس کا تو جواز اور مصرف دونوں بس یہی ہے کہ حقیقت پر افسانے کا رنگ چڑھا دیا جائے اور ابہام کو تخیل میں رنگ و رعنائی پیدا کرنے کا موقع دیا جا سکے!

یہ آخری بات میں نے ذرا جلدی میں کہی ہے اس لیے اس کے صحیح ہونے کے کافی امکانات ہیں۔ اگر آپ چلمن کی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں ("بغور" کا خاص طور سے لحاظ رکھیے۔ بغیر اس کے چلمن اور درونِ چلمن کا مطالعہ آپ کر ہی نہیں سکتے۔) تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے بارے میں طرح طرح کی روایات مشہور یا غیر مشہور ہیں، اور روایات بھی حسن و عشق اور

شعر وشاعری کی جن سے زیادہ دلچسپ اور ساتھ ہی مہمل روایات دنیا میں نہیں ہوتیں۔ اسے فریب نظر بھی کہا جاتا ہے اور جنت نظر بھی اور میں یہ مان بھی لوں کہ یہ دونوں باتیں ایسی زیادہ مختلف نہیں۔ یعنی جنت اور فریب میں قطع نظر یوں بھی مشرق میں ''نظر'' ہمیشہ کسی چلمن کی متمنی یا متلاشی رہتی ہے اور جہاں کوئی حجاب نہیں رہ جاتا وہاں خود اپنی خیرگی کو چلمن بنا ڈالنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی۔ یہاں خود حسن کو چھپنے چھپانے کا جو پرانا مرض ہے اس سے آپ بخوبی واقف ہوں گے، لیکن یہ مرض ویسا ہی ہے جیسے لیڈر کو خطرات قوم کا یا عورتوں کو شرمانے کا یعنی مرض ہو کر بھی اس سے اس جدول یا حصار کا کام لیا جاتا ہے جس سے پس منظر اجاگر ہوتا ہے اور تصویر کے رنگ ونقش اُبھرتے اور نکھرتے ہیں۔ یہ بات اتنے تیقن کے ساتھ آپ صرف چلمن ہی کے منہ سے سن سکتے تھے اور سن رہے ہیں کہ حجاب نصف حسن ہی نہیں، حسن کا نصف احسن بھی ہے!

یہ بات بھی میں نے تجربے ہی کی بنا پر کہی ہے (آپ کو یاد ہو کہ نہ یاد ہو، اس خاکسار کو ابھی چند منٹ پہلے چلمن کے نام سے متھسما دیا گیا ہے) ہاں تو حجاب اور حسن والی بات ذاتی تجربے پر یوں مبنی ہے کہ مخمل سے میرا کاروبار ہمیشہ سے چلا آیا ہے اور شاید ہمیشہ ہی چلا جائے گا۔ اگر مخمل حسن کی آرام گاہ ہے تو بحیثیت چلمن میرے عشق کی آماج گاہ ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں ہم دونوں نے آڑے وقتوں میں ایک دوسرے کی عزت وآبرو کچھ اس طرح رکھی اور بچائی ہے کہ میری عزت ہی کو مخمل کی آبرو کہنے لگے ہیں۔ اس بات کو آپ یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اگر اتفاق سے میں نے اپنا نام چلمن شروع ہی میں آپ کو نہ بتا دیا ہوتا تو شاید مجھے خود مخمل سمجھ بیٹھنے میں بھی اب کوئی تامّل نہ ہوتا! مخمل اور اس میں چھپنے والوں کے وہ تمام راز جن سے افسانہ وشعر میں جان پڑتی ہے میرے اندر صرف جذبۂ تسخر پیدا کرتے ہیں اور آپ ایک چلمن کی اس ہستی کو سمجھ ہی نہیں سکتے جس میں احساسِ واقعیت کی تلخی بالکل اس طرح جھلکتی ہے جیسے کھلونے بیچنے والا کسی بچے کو مٹی کے گھوڑے پر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ کر ہنستا ہے، اس وقت حسن اور ابہام یا عشق اور بوالہوسی کو ایک دوسرے سے سمندر کے صدف اور گھونگے کی طرح منہ بند دیکھ کر انسان سچ مچ ایک چھوٹا سا بچہ معلوم ہونے لگتا ہے جو ریت کے گھروندے بناتا ہے اور سیپ کو موتی سمجھتا ہے اور چاند کے لیے ضد کرتا ہے مچلتا ہے، جو دور ہے وہ اچھا، جو پوشیدہ ہے وہ حسین، جو مشکل ہے وہ پسند۔

اس پر آپ مجھے ہنستے دیکھیں یا سنیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن اس ہنسی کو مجھ سے منسوب کرتے وقت اس کا خیال رکھیے گا کہ اس میں میرے ذاتی وہم و عناد کو کس حد تک دخل ہے۔ میں اس وقت چلمنانِ ہند کی نمائندگی پر کمر بستہ ضرور ہوں، لیکن کچھ ضروری نہیں کہ میرا نظریہ میری انجمن کا بھی نظریہ ہو، یا میری ہنسی اس کی بھی ہنسی ہو!

مجھے ٹھیک علم نہیں کہ بحیثیت چلمن میرا جغرافیہ آپ کے ذہن میں کیا ہے۔ یعنی آپ مجھے کسی ناگفتہ بہ دروازے پر بقدر ٹاٹ کے پردے کے نہایت مرنجاں مرنج انداز میں پڑا ہوا محسوس کرتے ہیں، یا آپ کے خیال میں مجھے کسی فرانسیسی کھڑکی یا بالکونی پر اس نزاکت کے ساتھ ڈال رکھا گیا ہے کہ ہوائیں کوچۂ گردوں کی نظروں سمیت مجھے جھکتی ہوئی کون و مکاں کے پار ہوتی نظر آتی ہیں پھر یہ بھی خبر نہیں کہ آپ کے ذہن میں اس ''روئے جاناں'' کا خاکہ ہے یا نہیں جس پر پڑ کر نظر کی یہ مخصوص تاریخی شعاعیں بھی بے کار ہوتی نظر آئیں۔ یا ممکن ہے آپ کے ذہن میں اُس خوف زدہ شوہر کی محجوب نگاہ دوڑ رہی ہو جو گھر کے دروازہ پر ٹھٹک کر اس خاکسار چلمن کو اس طرح اٹھاتا ہے جیسے اُفتاں و خیزاں قسم کی گھر والی کو اپنی جان سونپ رہا ہو کہ ہے تو یہ خدا کی، لیکن امان تمہاری!

ایک عام چلمن کے ساتھ یہ، یا اس کے علاوہ اور جس قسم کے بھی تصورات آپ نے وابستہ کر رکھے ہوں، فی الحال میرے بارے میں آپ کے یہ تمام شبہات غلط ہیں۔ گو مجھے یہ تسلیم کرنے میں عذر نہیں کہ واقف میں ان تمام مراحل سے ہوں! یوں تو ایک حقیر فقیر چلمن کیا اور اس کی زندگی کیا، لیکن مجھ پر یہ سب افتاد پڑ چکی ہے اور اب بھی پڑتی رہتی ہے۔ ان مشاہدات و تجربات کی کہانیاں سنانے لگوں تو آپ چلمن و محمل ہی نہیں، زندگی اور حسن کے بھی ازلی دشمن ہو جائیں، لیکن مجھے افسانہ و شعر کا مواد فراہم کرنے میں زیادہ دلچسپی ہے خود افسانہ و شعر میرے بس کی بات نہیں اور ادب یا بے ادبی کسی بہانے بھی میں ان دونوں میں سے ایک کا بھی مرتکب نہیں ہوا!

معاف کیجیے گا، مجھے خود احساس ہے کہ اس قدر افسانہ و شعر میں الجھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں کہ افسانہ و شعر کے کوچے سے چلمن یا اس کے تذکرے کا گزر ہو تو یہ الجھاؤ یا بقول ترقی پسندی یہ ''ٹھکاؤ'' تقریباً ناگزیر ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس اُلجھنے ٹھٹکنے کے

دوران ہی میں آپ کو اپنا محلِ وقوع بتانا شروع کردوں، تو عرض یہ ہے کہ میرے پڑے ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں، لیکن آپ کے خیال کے مطابق کسی کھڑکی یا دروازے پر نہیں بلکہ ایک کری پر جس میں یہ قابلِ رشک صلاحیت ہے کہ اس پر بیٹھتے ہی لوگ بولنا شروع کردیتے ہیں ایسی صورت میں یا تعجب کی بات ہے اگر مجھے وہ تمام مواقع ایک ایک کرکے یاد آنے لگیں جب مجھے بے بسی کے ساتھ کسی محمل یا حرم سرا کے دروازے پر پڑا دیکھ کر ہر گزرنے والا کچھ نہ کچھ کہہ ضرور گزرتا تھا!

یہ بے بسی اس وقت میرے لیے اور بھی سوہانِ روح ہوتی جب کوئی گیا گزرا اتنا ہی گیا گزرا شعر میرے اوپر سر کردیتا اور میں اپنی تیلیاں یا اس کی گردن توڑنے مروڑنے کے بجائے وہیں لٹکے لٹکے بس ایک جُھر جُھری لے کر رہ جاتا اور میرے سرتاپا احتجاج کو محض ہوا کے جھونکے کی شرارت یا شوخی پر محمول کرکے قطعاً نظر انداز کردیا جاتا۔ انھیں دنوں ایک مسخرے کا بھی ادھر سے گزر ہوا جس نے میرا سخت مذاق اڑایا اور جو حرم سرا کی حفاظت کے لیے میری تیلیوں کو ناکارہ بتا کر تیغ و تفنگ قسم کی چیزیں رکھنے کا مشورہ دے گیا۔ خیر مسخروں کو تو چھوڑیے اُن کی بات کا بُرا ماننا ہی کیا۔ کون شاعر مسخرہ نہیں ہوتا یا کم از کم سمجھا نہیں جاتا، لیکن خیر سے وہاں حرم سرا میں بھی اس کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا اور یہ سوال اٹھایا گیا کہ جو بازو آزمائے ہوئے ہیں انھیں ایسا مشورہ دینا کہاں تک حسنِ شعور یا حسنِ نیت پر مبنی ہوسکتا ہے! چنانچہ اس مسئلے کو طے کرنے کے لیے ایک کمیٹی بٹھائی گئی جس کے فیصلے کا انتظار ہے اس دوران میں عارضی طور پر لڑکیوں نے انگریزی پڑھنی شروع کردی ہے اور قوم جو فلاح کی راہ ڈھونڈنے گئی تھی اب تک لاپتہ ہے!

چلمن اور پسِ چلمن کے اسرار و رموز یہیں ختم نہیں ہوجاتے بلکہ اصل میں تو وہ ابھی شروع بھی نہیں ہوئے، لیکن دقت یہ ہے کہ عاشق لاکھ صبر طلب ہو تمنا کی بے تابی سے مفر نہیں، وقت کے ختم ہونے سے بھی۔

نشریہ: 25/اپریل 1947

●●●

جھوٹ بولنا

شاید جھوٹ بولنا نہ اتنا بُرا ہے نہ سچ بولنا اتنا اچھا جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ لوگ جو مجھ سے کم دنیادار اور زیادہ دین دار ہوں اور مجھے فی البدیہہ دوزخی نہ قرار دے دیں۔ جھوٹ سچ پر جتنی جھوٹی سچی روایتیں ملتی ہیں وہ ان کے مصنفین کی امن پسندی کی دلیل ہیں دور اندیشی کی نہیں۔ مثلاً یہی کہاوت کہ سانچ کو آنچ نہیں یا صبر کڑوا ہوتا ہے، لیکن اس کا پھل میٹھا! سانچ کو آنچ نہیں کا مقولہ ممکن ہے صحیح ہو انجام یقیناً اچھا نہیں۔ سچے کو آنچ سے یقیناً نقصان پہنچتا ہے جس کو نہیں پہنچتا وہ سچ سرکاری گواہ ہوتا ہے۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے لیکن ذیابیطس ہو تو مٹھاس پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔ یوں بھی صبر کا پھل اتنی دیر میں جا کر پکتا اور میٹھا ہوتا ہے کہ اکثر صبر کرنے والا نہیں بلکہ اس کے ورثا اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں! یہ بات میں جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں، لیکن آپ بھی کیا کریں آپ غالباً اُن لوگوں میں ہیں جو بقول شخصے سن کر ہنس پڑتے ہیں اس لیے کہ اسے جھوٹ سمجھتے ہیں تو، مجھے بتانا یہ ہے کہ تمام دن سچ بول کر میں نے کیا پایا۔ اناج، آپ پہلے ہی سے جانتے ہیں مہنگا ہے۔ رہا سچ بولنا وہ سستا ہو یا نہ ہو پڑتا مہنگا ہی ہے۔ ان دنوں جو چیز سستی ہے وہ مہنگائی ہے۔ میں نے رات ارادہ کر لیا تھا کہ صبح اُٹھتے ہی سچ بولنا شروع کر دوں گا مجھے اس کا اندازہ نہ تھا کہ میں نے خلافِ معمول کسی نیک کام کرنے کا اتنا مستحکم ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ تمام رات ایسے خواب دیکھتا رہا جیسے میں نے تمام عمر صرف جرائم قابلِ دست اندازیِ پولیس کے ارتکاب میں بسر کی تھی۔

اس سے آپ یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ میں نے خواب میں جرائم کا ارتکاب کیا۔ میں تو اُن بدنصیبوں میں ہوں جو خواب میں بھی کوئی جرم کریں تو خواب ہی میں نہیں بلکہ بیداری میں سزا پائیں! اور بیداری میں کوئی نیک کام کریں تو رات کو سونا حرام ہو جائے۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ حالتِ خواب میں جہاں تہاں جھوٹ میں سچ یا سچ میں جھوٹ ملاتا رہوں تو کچھ ایسا ہرج واقع نہ ہوگا آنے والے دن کے لیے رات میں کوئی نیک ارادہ کرلیا جائے تو اس طرح کے وسوسے یا ولولے دل میں اکثر بیدار ہوتے رہتے ہیں۔

معلوم نہیں، جھوٹ سچ کے اس آمیزہ میں کس کا تناسب کتنا اور کس طرح گھٹ بڑھ جاتا تھا کہ سوتے میں رہ رہ کر چونک پڑتا تھا۔ آس پاس والے یہ سمجھتے رہے کہ میں نے کھانا ہضم کرنے کی کوئی نئی ورزش دریافت کرلی تھی یا مچھروں پر جوجتسو قسم کا کوئی داؤ آزمارہا تھا!

چوں کہ رات سچ بولنے کا ارادہ کر چکا تھا اس لیے صبح معمول سے کچھ پہلے ہی بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا جسے میں نے اپنے ارادہ کے لیے ایک مبارک شگون سمجھا، لیکن یہ معلوم کرکے کہ مجھ سے پہلے محلّہ کا کتا جاگ چکا ہے۔ تھوڑی سی خفت محسوس ہوئی اور کچھ ڈر بھی معلوم ہوا کہ کہیں اس کتے کا بھی وہی ارادہ نہ ہو جو میرا تھا یعنی سچ بولنے کا ارادہ! لیکن میں نے غالباً ڈر ہی کے سبب سے ہمت کا دامن نہ چھوڑا اور چوں کہ دامن پر کوئی ضرب نہ آئی اس لیے یہ سوال اُٹھانا بیکار ہوگا کہ ہمت کا وہ دامن آگے کا تھا یا پیچھے کا!

دل نے کہا یہ رات بھر بھونکتا بکتا رہا ہے صبح ہوتے ہی سچ کیوں بولنے لگا۔ سچ بغیر ارادہ یا مزدوری کے کون بول سکا ہے۔ یہ ٹھہرا کتا۔ پھر خیال آیا ممکن ہے دھوبی کا کتا ہو جس سے نہ کوئی گھر پر محفوظ رہتا ہے نہ گھاٹ پر۔ کیا تعجب جھوٹ موٹ بھونکتے ہوئے سچ مچ کاٹ لے۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کتے کے بارے میں میرا گمان غلط تھا۔ دراصل وہ غریب کاٹنے کے لیے نہیں بھونک رہا تھا بلکہ کاٹے جانے سے بچ جانے پر شکرانہ ادا کر رہا تھا۔

بات یہ تھی کہ محلّہ کی سب سے جھگڑالو عورت گھر سے کوڑا لے کر نکلی۔ دوسری طرف یہ غریب رات بھر کی غزل خوانی سے فارغ ہوکر فکرِ معاش میں غرق فاقہ سے پیٹ پر پتھر کے بجائے اپنی دم باندھے ہوئے ہمسائی کے دروازہ کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ عورت نے جو کچھ

ٹوکرے میں تھا یا جو کچھ ناگفتنی زبان پر آئی اُن پر خالی کردیا۔اب پوزیشن یہ تھی کہ عورت جلی کٹی سے ان کا کلیجہ چھلنی کررہی تھی اور یہ آبرو جانے ،لیکن جان بچ جانے پر دور کھڑے مدّھم سروں میں نظم معرّا سنا رہے تھے۔

میں ابھی سوچ میں تھا کہ ان دونوں میں جھوٹ کون بول رہا تھا اور سچ کون کہ مجھ پر ان دونوں کی بیچ کی ایک حقیقت منکشف ہوئی یعنی جب ایک طرف کتا ہو اور دوسری طرف جھگڑالو عورت تو سچائی کے پھیر میں پڑنے سے کہیں بہتر ہے کہ سلامتی کی آڑ پکڑے یعنی بھاگ کھڑا ہو۔

ممکن ہے میرے اس نظریے سے آپ کو اتفاق نہ ہو، ایسا ہے تو میرے نظریے کے بجائے میرے تجربہ پر خود غور فرمایئے۔ تعلیم عموماً دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو وہ جو بچپن سے باضابطہ شروع ہوتی ہے اور بے ضابطہ تمام عمر جاری رہتی ہے مثلاً کنڈرگارٹن سے شروع ہو کر یونیورسٹی ہوتی ہوئی جیل خانہ یا اہلِ خانہ پر ختم ہوگی۔دوسری وہ جو عاقل، بالغ اور مفلس ہونے پر تعلیمِ بالغاں کے سلسلہ میں مدارسِ شبینہ سے شروع ہو کر وظائف شبینہ یا نانِ شبینہ پر ختم ہو جاتی ہے۔تلاشِ حق کی میری تعلیم مدارسِ شبینہ میں ہوئی تھی اس کا کورس ابھی پورا نہ ہوا تھا کہ اعلانِ حق کا مرحلہ پیش آ گیا۔ظاہر ہے تلاشِ حق کی تکمیل نہ ہوئی ہو اور اعلانِ حق کا بیچ آن پڑے تو کسی نہ کسی ٹریجڈی کا ظہور میں آنا لازمی ہے۔لیکن نانِ شبینہ اور مدارسِ شبینہ دونوں نے مجھے یہ بتایا تھا کہ ٹریجڈی کا توڑ صرف ٹریجڈی ہے یعنی سچائی اور سلامتی کے درمیان انتخاب کرنا ہو تو سلامتی میں سچائی تلاش کرنا چاہیے۔اس تلاش میں کوئی اور فائدہ ہو یا نہ ہو سلامتی بہرحال اپنی جگہ پر رہتی ہے!

رمضان کا مہینہ تھا۔ خیال آیا کہ دنیا روزہ داروں سے خالی ہو جائے تو ہو جائے بدتمیزوں سے خالی ہونے سے رہی۔روزہ کا سوال ضرور اُٹھے گا تو وہ جواب کیسے دیا جائے گا جو ہر روز دیا جاتا۔ جب سچ ہی بولنا ٹھہرا تو ناشتہ کر لینے میں کیا مضائقہ دروازے پر کسی نے آواز دی روزہ میں سچ بولنے اور جھگڑا مول لینے کا حوصلہ بڑھ جاتا تھا،لیکن ناشتہ کر لینے کے بعد سچ بولنے سے قطع نظر، جھگڑا مول لینے کا حوصلہ کہاں سے لاتا۔تن بہ تقدیر دروازہ پر آیا۔یہاں جو صاحب نظر آئے وہ ایسے تھے جن سے جھگڑا مول لینے کے لیے روزہ دار ہونے کی بالکل ضرورت نہ تھی!

ملتے ہی بولے: ''اور کہیے روزے کیسے ہو رہے ہیں!''

اس پر وہ اس طور سے ہنسے جیسے انھوں نے مجھے جھوٹ بولتے پکڑ لیا ہو، لیکن معاف بھی کر دیا ہو پھر۔ بولے:

''خدا مجھے معاف کرے جب سے احباب کے اصرار پر تیسرا عقد کیا اور پائیریا کے اعزاز میں میرے دانت نکلوا دیے روزہ رکھنے سے معذور ہو گیا۔''

پھر بولے: ''دراصل میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ رمضان شریف میں آپ میرے کلام کے مجموعہ پر اطمینان سے مقدمہ تحریر فرمائیں گے۔''

میں نے کہا: ''جناب معلوم نہیں کس عالم میں تھا کہ یہ کہہ گیا کہ رمضان میں اطمینان نصیب رہتا ہے وہ بھی کسی مجموعۂ کلام پر مقدمہ لکھنے کا اطمینان۔''

وہ پھر اُسی انداز کی ہنسی ہنسے جس کا میں اوپر تذکرہ کر آیا ہوں گو وہاں میں یہ بتانے سے باز رہا تھا کہ اس طرح کی ہنسی مجھے بدتمیزی پر اُکساتی ہے باوجود اس کے کہ میں بدتمیزی سے زیادہ ناقابلِ عفو گناہ کسی اور بات کو نہیں سمجھتا! میں نے کہا:

''دیکھیے حضرت اب تک یہ ہوتا تھا کہ روزہ جاڑے میں پڑتا تھا یا گرمی میں یہ کسے معلوم تھا کہ مہنگائی میں پڑے گا۔ جب کھانے پینے اور تجہیز و تکفین کی خبریں اس درجہ گراں ہو جائیں گی۔ رہا آپ کے کلام پر مقدمہ لکھنے کا معاملہ اس کے بارے میں میری ناچیز رائے یہ ہے کہ خدانخواستہ دنیا پر کبھی ایسا وقت آیا جب شعرا کا کلام بھی بلیک مارکیٹ میں بکنے لگے گا تو صرف آپ کا کلام ایسا ہو گا جو شعر و شاعری اور بلیک مارکیٹ دونوں کا قلع قمع کر دے گا۔''

موصوف چلے گئے، لیکن مجھے کچھ ایسی نظر سے دیکھتے گئے کہ میں بعض توہمات کو سچ سمجھنے لگا، مثلاً یہ جو مشہور ہے کہ سانپ کو مارو تو اس کی آنکھ کو کچل دو اس لیے کہ مارنے والے کا نقشہ سانپ کی آنکھ میں مرتسم ہو جاتا ہے اور سانپ کے ورثا مادّہ یا نر اس نقشہ سے مارنے والے کا پتہ لگا کر انتقام لیتے ہیں۔ مجھے کچھ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے میری یا میرے دوست کی آنکھ یا دونوں کی آنکھوں میں اس قسم کا حلیہ ضرور نقش ہو چکا ہے اور ہم میں سے کسی ایک کے مرنے پر دوسرا انتقام لیے بغیر نہ رہے گا۔

میں مکان سے باہر نکل گیا۔ اس لیے کہ جب سچ بولنا لازم کر لیا جائے تو گھر والوں سے کسی قدر رفاصلہ پر رہنا بہتر ہے۔ دفعتاً قریب سے آواز آئی: ''السلام علیکم''

میں بغیر ارادہ کے چیخ پڑا۔ اس طرح کی حرکت سچ بولنے کا ارادہ کرنے سے پہلے مجھ سے سرزد نہیں ہوئی تھی۔ ہر طرف سے لوگ دوڑ پڑے۔ بات یہ تھی کہ میری چیخ سے سلام علیکم والے سائیکل سوار زمین پر آ رہے تھے وہ بھی اس طور پر کہ کوئی غور سے نہ دیکھے تو یہ معلوم ہو کہ مدتوں بعد آج سائیکل کو اس کا موقع ملا تھا وہ ان پر سوار ہو جائے۔ واقعہ یہ تھا کہ یہ صاحب میری جان کے لاگو ہو گئے تھے۔ ان کے اچانک اور متواتر سلام کرتے رہنے سے میرا اٹھنا بیٹھنا، ہنسنا بولنا، چغلی کھانا، بھیک مانگنا سب حرام ہو چکا تھا۔

معلوم نہیں کس نے ان کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ جب تک یہ اس خاکسار کو سلام سے مشرف کرتے رہیں گے اس مہنگائی اور بڑھاپے میں برابر اولاد سے سرفراز ہوتے رہیں گے۔ حالاں کہ اتنی سی بات ہر شخص جانتا ہے کہ مہنگائی اور بڑھاپے میں یوں بھی اولاد زیادہ پیدا ہوتی ہے جس طرح لڑائی کے زمانے میں ہوائی حملوں سے بچنے کے لیے پناہ گاہیں بنا دی گئی تھیں۔ سائرن ہوا اور لوگ ان میں جا چھپے، میں بھی ان صاحب کی بھنک پاتے ہی جلد سے جلد کہیں روپوش ہو جاتا اور آل کلیر[1] کا اعلان سن کر دنیا کے دھندے میں لگ جاتا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں سائیکل پر جا رہا تھا۔ دفعتاً یہ نظر آ گئے۔ مجھ پر کچھ اس طرح کی سراسیمگی طاری ہوئی کہ میں نے سائیکل داہنی جانب موڑ دی ادھر سے آ رہی تھیں کچھ لڑکیاں اور ان کے ساتھ بوڑھیاں۔ سائیکل کو دھچکا لگا اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے ساری بوڑھیاں میری سائیکل پر آگے پیچھے اور ایک آدھ خود مجھ پر بیٹھ گئیں ہوں۔ (نامکمل)

(نشریہ: 18 / اگست 1948)

●●●

---

1. All clear

قسمیں کھانا

''آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں!'' اور ''کپڑے کے عوض بدلتی تھی رنگ''! یہ حال تھا بکاولی کا اور لکھنؤ کے شعرا کا۔ گل بکاولی کے قصے یا اندر سبھا کے کھیل سے کون واقف نہ ہوگا۔ یہ بہت دنوں کی بات ہے جب نہ بکاولی کی کمی تھی نہ شعرا کی ان دونوں کی کمی آج بھی نہیں ہے صرف کھانے پینے اور کپڑے کی کمی ہے۔ ایمان داری کی بھی، کھانے پینے اور پہننے میں دلی، لکھنؤ والوں نے جہاں طرح طرح کی ایجادیں کی تھیں، وہاں زبان میں بھی عجیب عجیب گل کھلائے تھے۔ کھانے پینے اور پہننے کے یہ انداز اُسی زمانے اور زبان کے چٹخارے ہیں۔ آنسو پینا اور قسمیں کھانا آج بھی ہے، فرق صرف اتنا البتہ آ گیا ہے کہ اب آنسو، بہائے جاتے ہیں قسمیں توڑی جاتی ہیں اور کپڑے کا مصرف پہننا بدلنا نہیں صرف بکنا رہ گیا ہے۔

مجھے معلوم نہیں قسم کس کی ایجاد ہے۔ شہادت البتہ اس کو عدالت میں نصیب ہوئی شعرا کا خیال ہے یہ حسنِ کلام ہے۔ فریقین مقدمہ اسے عدالتی چورن قرار دیتے ہیں۔ حکما اسے اعصاب کی کمزوری بتاتے ہیں۔ مولوی کے نزدیک یہ مذہبی خضاب ہے۔ عشاق کا اعتراف شکست ہے اور یکّہ بانوں اور عورتوں کا اعلانِ جنگ اردو تنقید نگاروں نے اس کی تعبیر فرائڈ کے نظریہ سے کی ہے۔ یعنی یہ نفس کا کالا چور ہے جو قسم کھا کر باہر نکل آتا ہے۔

قومی خدمات کی مانند قسمیں بھی بے شمار ہوتی ہیں بے معنی بھی۔ دلّی کے شاہزادے آخر آخر میں جب تاج رہا تھا نہ تخت نہ ناموس ونسب، تاج وتخت کی قسم کھایا کرتے تھے۔ لوگ ہنستے تھے۔ اب لوگ اپنے اپنے اکابر ومشاہیر کی قسمیں کھاتے ہیں تو شرفا روتے ہیں جن کی حرمت وعظمت کی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ انھیں کے نام پر بے گناہوں وبے بسوں کو خاک وخون میں ملاتے ہیں، فخر کرتے ہیں اور آسودگی پاتے ہیں!

محبت، عقیدت، نفرت، غصہ، جوش، سرخوشی، حماقت، بے ہودگی غرض نفسِ انسانی کی کوئی سرگرمی ایسی نہیں ہے جس کا مظاہرہ گالی بکنے یا قسم کھانے سے نہ کیا جاتا ہو۔ قسم اور گالی میں اکثر بہت کم فرق رہ جاتا ہے:

''وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے''

جاہل اور گنوار جوش میں آتا ہے، تو گالی کے بغیر نہیں رہتا۔ کبھی گالی کے بھیس میں قسم کھاتا ہے اور کبھی قسم نہیں کھاتا گالی دیتا ہے، اس طبقے کو نہ الفاظ پر قدرت ہوتی ہے نہ جذبات پر اس لیے گالی بکنا یا قسمیں کھانا ان کا تکیۂ کلام بن جاتا ہے اور جاہل یا گنوار ہی پر موقوف نہیں جذبات پر قدرت نہ ہو تو قسمیں کھائے یا لات، دونوں برابر!

بڑی دلچسپ یا عبرت انگیز وہ قسمیں ہوتی ہیں جہاں سچ بولنے اور وفادار رہنے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایوانِ عدالت یا ایوانِ حکومت جہاں قسمیں تو کھائی جاتی ہیں، ''آرائش خم کاکل'' کے سلسلے میں اور ''اندیشہ ہائے دور دراز'' کو چھوڑ دیا جاتا ہے ہم پر، آپ پر۔ یہ قسمیں جھوٹ کے خلاف ڈی ڈی ٹی نہیں ہوتیں جتنی ہمارے آپ کے دشمنوں کے نام وی پی!

جن دوستوں کو عدالت میں قسم کھانے کی سعادت نصیب ہوئی ہے ان سے پوچھیے قسم کی ان کے نزدیک کیا وقعت ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا سیانا یا دانا ہو جو عدالت میں جھوٹ بولنے سے باز رہا یا بچ گیا ہو۔ عدالتوں میں فریقین کو سچ یا جھوٹ کی اتنی نہیں پڑی ہوتی جتنی مقدمہ جیتنے کی۔ پھر قانون جہاں سچائی کو منکشف کرنے کی کوشش کرتا ہے وہاں جھوٹ اور فریب کی آڑ بھی بنتا ہے۔ ترقی وتہذیب کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ ہم کتنی قسمیں کھاتے ہیں، لیکن اس کی پاداش سے محفوظ رہتے ہیں۔ فریقین قسم کھا کر سچ یا جھوٹ بولتے ہیں۔ عدالت قسم ہی کھا کر سچ کو جھوٹ یا

جھوٹ کو سچ مانتی ہے۔ وکیل قسم کھا کر روپے وصول کرتے ہیں اور ہم آپ خاک پھانک کر جہاں کے تہاں رہ جاتے ہیں۔ عدالتی یا حکومتی قسم جتنی اخلاقی یا رسمی ہوتی ہے اتنی واقعی نہیں ہوتی۔ قسم دھوئیں یا دھوکے کی ٹٹی ہے جو بھاگنے اور حملہ کرنے دونوں میں مفید ہوتی ہے!

کچھ اپنی اولاد کی قسم کھاتے ہیں۔ بعض جو امراضِ قبیحہ میں مبتلا ہوتے ہیں، جوانی کی قسم کھاتے ہیں۔ آپ میرے سر یا جان کی قسم کھاتے ہیں۔ میں آپ کے سر یا جان کی قسم کھاتا ہوں۔ ظاہر ہے نہ آپ اتنے بے وقوف ہیں نہ میں اس درجہ لاوارث کہ اپنے سر یا جان کو مصرعہ طرح بنائیں گے یا بنانے دیں گے۔ اس طرح کی قسموں میں ظاہر ہے قسم کو اتنا دخل نہیں ہوتا جتنا مجھے یا آپ کو اپنے خلوص یا بے تکلفی کا اعلان یا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ بعض اس لیے قسم کھاتے ہیں کہ کھانے کو کچھ اور نصیب نہیں ہوتا۔ رہا بار کھانا اس کے لیے قسم کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی موقع محل کی یا عادت یا کمزوری کی!

مجھے اکثر ایک دوست یاد آتے ہیں جن کے سپرد قبرستان کا اہتمام ہے جامع مسجد کا بھی، گورکنوں اور موذنوں کا بھی جو ہمیشہ ہم رکاب رہتے ہیں۔ جدھر سے جب بھی نکلتے ہیں لوگ سکتے میں آجاتے ہیں۔ یعنی نماز کا وقت آگیا، نماز پنج گانہ یا نماز جنازہ انھیں گورکنوں اور موذنوں میں وہ بدنصیب ہوتے ہیں جن کو انھوں نے سود پر روپے دے رکھے ہیں۔ یہ سب یا تو ان کے پاؤں دباتے ہیں یا اپنی بیویوں کو ان کے مشورہ سے طلاق دیتے ہیں۔ ضلع میں شاید ہی کوئی عدالت ایسی ہو جہاں ان دوست کے یا خود انھیں پر مقدمے نہ دائر ہوں۔ یہ اپنے مقدمہ کی پیروی میں قرآن کی آیات خود پڑھتے ہیں اور چشتز یا جان بحق انگریزوں کی خوشنودی کی چھٹیاں ہم سے آپ سے پڑھواتے ہیں۔ شاید ہی کوئی عدالت ایسی ہو، جس نے ان کے خلاف فیصلہ نہ صادر کیا ہو یا فیصلہ دینے سے پہلے ورنہ بعد میں ان کی شان میں کچھ بے تکلفانہ غیر عدالتی کلمات نہ کہے ہوں!

ان عدالتوں کے جتنے حاکم مر گئے، برخاست یا تبدیل ہوئے یا پنشن پا گئے وہ سب ان کے قول کے مطابق محض اس لیے کہ انھوں نے ان کے خلاف فیصلے دیے۔ یہ کوئی کام کرنے میں یا اسے بگاڑتے ہیں۔ خیرات مانگتے، وعظ دیتے، بے ایمانی کرتے یا بیوی کو پیٹتے ہیں تو ہمیشہ ''پناہ رب کی'' کہہ کر کرتے ہیں، لیکن کسی کو اب تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ رب نے کب اور کہاں

ان کو یا ان کے شکار کو پناہ دی۔ البتہ یہ سب جانتے ہیں کہ خود رب کو ان سے کبھی پناہ نہ ملی۔ ان کو قرآن شریف کی تمام قسمیں اردو میں یاد ہیں، اور قرآن شریف ہی میں جہاں جہاں جہنم کی بشارت دی گئی ہے اس کا توڑ وہ اسی "پناہ رب کی" سے کرتے رہتے ہیں!

قرض دے کر رقعہ لکھواتے ہیں تو سود کا نرخ اسی "پناہ رب" کی دھمکی سے اونچے سے اونچا رکھتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے: "مولوی صاحب کوئی تعویذ لکھ دیجیے، بچے نہیں جیتے۔"

"بچے نہیں جیتے!"

جواب دیں گے۔

"پناہ رب کی دو سفید مرغ لاؤ اس کے خون سے لکھی جائے گی۔"

کسی نے فرمائش کی۔

"مولوی صاحب گھر والی سے نہیں بنتی۔"

فرمائیں گے۔

"پناہ رب کی طلاق کی دھمکی دو۔ اور سو جائے تو سرہانے یٰسین شریف پڑھو۔ ایک خوان لڈو کا اور ایک تھان لٹھے کا لاؤ۔"

طالب علم نے کہا۔

"دعا کیجیے امتحان میں پاس ہو جاؤں۔"

ارشاد ہوگا۔

"پناہ رب کی ایک قلم تراش چاقو اور ایک ریشمی عمامہ لاؤ ممتحن کو ہموار کر دیا جائے گا۔"

پولیس کے سپاہی نے کہا۔

"مولوی صاحب بتایا جاتا ہے کہ آپ نقدی اور زیور دگنے کر دیتے ہیں۔"

گھبرا کر بولے۔

"پناہ رب کی! حضور میں آپ سے باہر نہیں ہوں میں تو چوگنی خدمت کے لیے تیار ہوں! پناہ رب کی!"

ایک دوسرے صاحب صرف قرآن کی قسمیں کھاتے ہیں۔ آپ کہیں گے۔

''کنٹرول ٹوٹ گیا۔''

کہیں گے۔

''قسم قرآن کی بہت اچھا ہوا۔''

کنٹرول پھر سے نافذ کیا جائے گا۔

''قسم قرآن کی تلاشی تو نہ ہوگی؟''

ان دنوں ہنگامے کا اندیشہ ہے!

''قسم قرآن کی اب کیا ہوگا؟''

آج کل موسم خراب ہے۔

''قسم قرآن کی قسمت ہی خراب ہے۔''

ہر جگہ طغیانی آرہی ہے۔

''قسم قرآن کی باورچی خانہ تک پہنچنا دوبھر ہوگیا ہے۔''

آج کل جابجا ہیضے کی شکایت ہے۔

''قسم قرآن کی کھانے کا لطف جاتا رہا۔''

آپ دلّی کب جارہے ہیں؟

''قسم قرآن کی ابھی بالکل کچھ ٹھیک نہیں۔''

بیگم صاحبہ کا مزاج کیسا ہے؟

''قسم قرآن کی کچھ بھی تو نہیں ہے۔''

اُس دن آپ موٹر پر کہاں جارہے تھے؟

''قسم قرآن کی کہیں نہیں!''

سنا ہے آپ کو کلکٹر صاحب نے یاد کیا ہے۔

''قسم قرآن کی مرگیا!!''

ہمارے ایک شاعر نے ایک قصیدہ میں بڑی دل کش قسمیں کھائی ہیں، فکر و خیال کی نزاکت اور لطافت کو ہمارے شاعروں نے کس خوبی اور رچے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے اور

اسے ہمارے علمی وتہذیبی ورثہ کا دنیا کے علوم وتہذیب میں کیا وزن ووقار ہے اس کا اندازہ کیجیے۔ صرف تھوڑی سی مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

''قسم ہے تیرے لطف و مرحمت کی جس کا ایک نمونہ بہشت ہے اور قسم ہے تیرے جودوبخشش کی جس کی ادنیٰ نمک چشی بحرِ ذخار کونصیب ہوئی۔''

''تیری ان نعمتوں کی قسم جہاں تک اندازے کی رسائی نہیں۔ تیری مدح کی قسم جہاں تک پہنچنے میں اندیشہ معذور رہتا ہے۔''

''حضرت موسیٰ کے شوقِ دید کی محرومی کی قسم جو ذوقِ دید کے لیے مژدہ ہے۔ آسودگان شکوہ طرازی کی غم فروشی کی قسم اور پژمردگان شکر گزاری کی تازہ روئی کی قسم۔ کمزور صحتوں کے بازوئے پُرنفع کی رنج کشی کی قسم اور خواجگانِ کبار کی چین ابروئے بے وجہ کی قسم ناگواری نزع و ناگزیریٔ مرگ کی قسم اور بے مداریِ عمر و بے وفائی یار کی قسم!''

''صبوحی کشاں صبح کی نوائے نائونوش کی قسم اور ہوش مند کی کاوشِ طبعِ دقیق کی قسم۔ اس جھوٹ کی قسم جس سے فرہاد نے شہادت پائی، اور اس ترانے کی قسم جس سے حضور کو سرفرازیِ دار نصیب ہوئی۔ برقعِ مہ کنعاں کی قسم جو تمام تر حسن و جمال تھا اور قسم حجلہ گاہ زلیخا کی جو تمام تر یوسف زار تھا۔ اس شاخ کی قسم جسے کنعان کا گوہر فروش مصر لے گیا اور مصر کا بازار حسن سے لبریز ہو کر چھلک گیا۔ اس نازِ حسن کی قسم خلوت میں نقاب پوش ہوتا ہے اور اُس رازِ حسن کی قسم جو بازاروں میں رُسوا پھرتا ہے خواہش کی ذلت اور قناعت کی آبرو کی قسم، اور تائب کے توبہ و پشیمانی کی قسم۔ تنگ نائے گریباں اور وسعتِ داماں کی قسم کفش کی خاکساری اور دستار کی نخوت کی قسم۔'' ذرا یہ قسم بھی ملاحظہ ہو:

''اس نیم قطرۂ شراب کی قسم جو محبوب کے لب پر شراب پی لینے کے بعد آویزاں رہ جاتا ہے۔'' قسموں کا یہ انداز اگلے وقتوں کا ہے جب روس کے ادبی شعور پر لوگ زیادہ فریفتہ نہ تھے اب جب کہ اس کے ادبی شعور اور اس سے زیادہ اس کی سیاسی بے ادبی سے ہم سب کی روح اہتزاز کرتی ہے: بہ جلوہ ریزی بارہ و پُرفشانی شمع، تو ظاہر ہے شمعوں کی پرداخت بھی بدلنی پڑے گی۔ عجلت میں چند خاکے ذہن میں آئے وہ پیش کر دیتا ہوں۔

''قسم ہے تاریخ کی جو اپنے آپ کو کبھی نہیں دُہراتی اور قسم ہے مورّخوں کی جو ہمیشہ اپنے آپ کو دُہراتے رہتے ہیں۔ قسم ہے انسانیت کے ان تقاضوں کی جن کو کوئی نہیں پوچھتا اور قسم ہے شیطنت کے ان مطالبات کی جن کو سبھی پوجتے ہیں:

قسم ہے سرمایے کی لعنت کی
اور قسم ہے مزدور کی شامت کی
قسم ہے شاعر کی نیت کی
اور قسم ہے نظم کی وسعت کی
قسم ہے جاگیریت کے تعفّن کی
اور قسم ہے اشتراکیت کے تعفّن کی
قسم ہے چھوٹی حکومتوں کے نقاروں کی
اور قسم ہے بڑی حکومتوں کے چوب کی

قسم ہے اس لاشعور کی جس کی سیرے فرشتوں کو خبر نہیں، اور قسم ہے اس نیم شور کی جن سے میری تو قیر آدھی رہ گئی، اور قسم ہے اس تقریر کی جو کچھ یوں ہی سی ہو کر رہ گئی!''

(نشریہ: اکتوبر 1948، مطبوعہ: نیا ہندوستانی، بمبئی، 24/ستمبر 1948)

●●●

جھگڑالو

عادت سے مجبور جھگڑالو ہی نہیں ہوتے بہت کچھ اور بھی ہوتے ہیں یہ بھی جھگڑے کی بات ہے، لیکن میں بھی کیا کروں عادت سے مجبور ہوں۔ جھگڑنے کے لیے عادت کی کچھ اتنی ضرورت نہیں۔ کھانے کے لیے بھوک کی کیا ضرورت ہوئی۔ دونوں کے لیے صرف موقع کی ضرورت ہے، اور موقع نکال لینا کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ آدمی کی یہی تو بڑی جیت ہے کہ وہ جب چاہے جہاں چاہے موقع نکال لیتا ہے۔

بعض تو یوں جھگڑتے ہیں کہ ہاضمہ میں فتور ہو گیا ہے جب غذا جزو بدن نہ ہوتی ہو تو تحمل جزو مزاج کیوں کر ہو۔ بعض لوگ جھگڑتے ہی اس لیے ہیں کہ کھانا ہضم ہو۔ یہ تو نہیں معلوم کہ اس ورزش سے کھانا ہضم ہوتا ہے یا نہیں۔ البتہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ ایسے حضرات دیکھے گئے ہیں جن کے جھگڑنے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ ناواقف یہ سمجھ لے کہ جو کچھ ہضم ہو چکا تھا وہ پھر سے ہرا ہو رہا ہے۔

بعض اس لیے جھگڑتے ہیں کہ نیت میں فتور ہوتا ہے۔ کہتے کچھ ہیں، کرتا کچھ اور چاہتے ہیں۔ اپنا نفع دیکھتے ہیں دوسرے کا نقصان خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ ایک اور ایک دو کو کچھ نہ مانیں گے جب تک ایک اور ایک کے معنی دو روٹی کے نہ ہوں۔ آپ کہیں گے یہ کہاوت تو بھوکے پر صادق آتی ہے جھگڑالو پر نہیں۔ میں بغیر جھگڑے کے یہ عرض کروں گا کہ بھوکے کی نیت کب بخیر ہوتی ہے!

کچھ اس لیے جھگڑتے ہیں کہ عقل میں فتور ہوتا ہے۔ یہ بات سمجھتے نہیں مار کھانے پر تیار رہتے ہیں۔ عقل کی کمی کو جھگڑے یا رو پڑنے سے پوری کرنا چاہتے ہیں۔ عورتیں اس فن میں طاق ہوتی ہیں اور اس میں شک نہیں اُن کے یہ حربے کبھی خطا نہیں کرتے اس لیے ایسے مواقع پر مرد عقل کے ہاتھوں لاچار ہوتا ہے۔ اکثر شاعری کے ہاتھوں بھی حادثے کو دو ہی طرح سے دعوت دی جاتی ہے۔ آیت پڑھ کر یا شعر پڑھ کر۔ البتہ ہمارا آپ کا حال یہ ہے کہ ہم شعر پڑھ کر مار کھاتے ہیں اور آیت پڑھ کر صبر کر لیتے ہیں!

مجھے اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد ہے، ریاضی میں صفر تھا۔ عبارتی سوال مجھے جتنا دلچسپ معلوم ہوتا تھا اتنا ہی اس کے حل کرنے میں کورا تھا چھوٹے بڑے، ہمسائے، راہ چلتے، نئے شوہر، پنشن یافتہ ماسٹر بھی اپنے اپنے طور پر حساب سمجھانے کی کوشش کرتے۔ میں اُن سے جھگڑتا تھا اور خفت یا خفگی سے رونا آتا تو اُس کے چھپانے کی جتنی کوشش کرتا اگر اتنی کوشش آج کروں تو مارشل پلین اور بلیک مارکیٹ یا بلیک میل (Black Mail) میں آپ کوئی امتیاز نہ کر سکیں۔ مجھے یہ چیز بڑی ناگوار گزرتی تھی کہ سوال کا جواب پہلے سے کیوں فرض کر لیا جائے۔ میرے دل میں معلوم نہیں کیوں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ فرض کیا نہیں اور مارے گئے نہیں! جہاں ایک بات مانی پھر مقالاتِ افلاطون کے سوا چارہ نہیں! سمجھانے یا سمجھنے کے دوران میں حسب معمول میں نے کوئی اوریجنل بات کہی نہیں کہ سمجھانے والا ہنسا، بگڑا یا مجھ پر ترس کھانے لگا اور یہ تینوں باتیں مجھے زہر معلوم ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے میں عادت سے مجبور نہ تھا، لیکن جھگڑنے میں کسی سے پیچھے نہ تھا!

یہی حال نیت کے فتور کا ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ لیڈر بنیں۔ روٹی کمائیں اور جیل نہ جائیں اور تبلیغ کرتے ہیں اس کی کہ دوسرے فاقے کریں، مار کھائیں اور جیل جائیں۔ یہ کبھی نہ چاہیں گے کہ جھگڑا ختم کیا جائے اس لیے کہ جھگڑا ختم ہوتے ہی اُن کا پُرسانِ حال کوئی نہ ہوگا۔ افراد نے ذاتی نفع کی خاطر جماعت اور ملک کو اکثر غارت کیا ہے۔ آپ یہاں بھی دیکھیں گے بالآخر یہی معلوم ہوگا کہ کوئی ایک شخص ہے جو اپنے نفس کی خاطر معاملہ کو رُو براہ نہیں ہونے دیتا۔ جو لوگ ہاضمہ کے فتور میں مبتلا ہیں اُن کو میں سب سے مخلص جھگڑنے والا سمجھتا ہوں اور اُن کی بڑی قدر کرتا ہوں اس لیے کہ وہ جھگڑتے ہیں محض جھگڑے کی خاطر، اس میں نفع نقصان، دنیا آخرت،

زید بکر، کسی کی قید نہیں۔ آرٹ برائے آرٹ ہمارے لیے اب مقبول رہا ہو یا نہیں، لیکن جھگڑا برائے جھگڑا کی عظمت کا میں ہمیشہ سے قائل رہا!

میرے ایک دوست ہیں، اور یقیناً آپ کا بھی کوئی دوست ایسا ہی ہوگا جو بغیر جھگڑے سلام بھی نہ کرتا ہو، لیکن میرے اور آپ کے دوست میں ایک نمایاں فرق ہے۔ میرے دوست کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ آپ اُن سے اتفاق کریں تو یہ اور زیادہ چراغ پا ہوں گے اُن کا خیال ہے کہ جب اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی تو اقلیدس کی لکیر کیسے سیدھی ہوسکتی ہے۔

فرض کر لیجیے یہ کیمونسٹ ہیں اور اس مان لینے میں مضائقہ ہی کیا ہے، آخر دنیا میں فرضی کیمونسٹ ہوتے ہی ہوں گے۔ اب اگر آپ کیمونزم کے خلاف کچھ کہیں تو سوا مار ڈالنے کے یہ آپ کے ساتھ ہر قسم کا سلوک کریں گے۔ مار ڈالنے کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف بحث کرنے کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ یہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اس لیے جھگڑا بھی ختم نہیں ہوتا۔ ان دوست کا ہاضمہ اور حافظہ دونوں عجیب وغریب ہے اور جھگڑے یہ پیدا کرتے ہیں ان دونوں کے عجیب وغریب استعمال ہی سے، یعنی ہاضمہ کا کام حافظہ سے لیتے ہیں اور حافظہ کا ہاضمے سے! مثلاً دعوتوں میں یہ یاد رکھتے ہیں کہ کون سی چیز گھر پر کھانے کو نہیں ملتی اور بحث میں یہ بھول جاتے ہیں کہ کہاں اتفاق ہوسکتا ہے۔

کیمونزم پر یہ پختہ یقین رکھتے ہیں، لیکن خود کیمونسٹوں سے ہر مسئلہ پر جھگڑتے ہیں اُسی بحث میں اگر کوئی شخص خود جھگڑنے میں اُن سے متفق ہو جائے تو اُس سے جھگڑنے لگیں گے۔ خدائی قانون سے اختلاف کریں گے اس لیے کہ یہ خود خدا نہیں۔ انسان کے بنائے ہوئے قوانین کی مخالفت کریں گے اس لیے کہ یہ خود انسان ہیں۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنی تعریف اور بڑائی کرنے کے لیے پیدا کیا، پھر معلوم نہیں کون سی مصلحت دیکھی کہ شیطان کو پیدا کر دیا۔ یہاں شیطان و یزداں کی بحث میں پڑنے سے نہ کوئی حاصل نہ اس کا کوئی موقع البتہ میرے دل میں یہ بات آئی ہے کہ فرشتہ اور شیطان دونوں کو پیدا کرنے کے بعد مشیّتِ الٰہی نے کوئی کمی کہیں ضرور دیکھی اور ہمارے دوست کو پیدا کر دیا۔ عالمِ طبعی کا نظام مثبت و منفی قوتوں کی

ہمہ گیر و ہمہ وقت کشاکش سے قائم رہتا ہے۔ اُن میں توازن قائم ہوا نہیں اور عالم کا شیرازہ بکھرا نہیں۔ دونوں تو تیں کبھی بھی آپس میں ساز باز کر کے دنیا کا سارا کھیل بگاڑ سکتی تھیں۔ اس خطرے کی روک تھام کے لیے ہمارے دوست وجود میں آ گئے۔ یہ نہ مثبت ہیں نہ منفی بلکہ دونوں کے لیے خطرہ اور خطرہ بھی ایسا جس سے بڑا کوئی دوسرا خطرہ ہو نہیں سکتا، یعنی نوسینس! شعر و ادب کے بھی جھگڑالو ہوتے ہیں۔ آپ نے انیس کا مشہور شعر سنا ہوگا:

غلط یہ لفظ، وہ مضموں خلاف، بندش سُست

ہنر عجیب ملا ہے یہ عیب چینوں کو

ہمارے دوست کو بہترین شعرا کے بہترین کلام میں بھی نقص نظر آ جاتا ہے۔ مثلاً الف گرتا ہے، ی دبتی ہے، یہاں الف جلی ہے وہاں خفی۔ شتر گربگی ہے، وہ کتا خصی۔ اُن کا زمانہ خود اُن سے اور یہ خود زمانہ سے اُکتا کر ختم ہو گئے، لیکن اس طرح کے جھگڑے اور جھگڑالو اب بھی موجود ہیں۔ چنانچہ صورت حال یہ ہے کہ نظم ہو یا نثر، افسانہ ہو یا تنقید، جھگڑے چلے ہی جاتے ہیں۔ اب جھگڑا اس پر ہے کہ آرٹ برائے آرٹ ہے یا برائے زندگی۔ پہلے الف کا گرنا اور ی کا دبنا یا خفی و جلی کا جھگڑا تھا۔ اب اس کا کہ بورژوا ہے یا پرولتاری، جنسیت ہے یا فراریت لاشعور ہے یا تحت شعور، روحانیت ہے یا حقیقت، انقلاب ہے یا التماس، خون ہے یا صفرا!

اس دنیا میں جھگڑنے سے زیادہ آسان مشغلہ ہمارے آپ کے لیے شاید ہی کوئی اور ہو اور اس فن میں عورتوں اور ایڈیٹروں سے شاید ہی کوئی اور بازی لے گیا ہو۔ اس بنا پر عورتوں سے گھر کے اندر اور ایڈیٹروں سے گھر کے باہر کی دنیا نورٌ علیٰ نور ہوتی ہے یہ بتانا تو آسان ہے، لیکن اس کا مان لینا مشکل کہ جنت میں شیطان نے عورت کو بہکایا یا عورت نے شیطان کو۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ مرد اور شیطان دونوں وہاں سے نکالے گئے۔ بہکانے اور جھگڑنے میں فرق ضرور ہے، لیکن دراصل بہکانے اور جھگڑا کرنے میں صرف مقدم اور موخر کا فرق ہے بہکانے میں جھگڑے کی نیت یقیناً پوشیدہ ہوتی ہے۔ عورت اور شیطان اس جرم میں جنت سے نکالے گئے اور اس دنیا میں آئے۔ بہت سے ایسے ہیں جو شیطان اور عورت ہی کے واسطے سے اس دنیا کو جنت سے کچھ کم نہیں سمجھتے!

گھر میں عورت اور گھر سے باہر ایڈیٹر طرح طرح سے جھگڑتے ہیں۔ عورت کروڑپتی ہی کی بیوی کیوں نہ ہو، اُس کی شکایت کرے گی کہ اُسے پیسے میسّر نہیں۔ ظاہر ہے اُس کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے، لیکن وہ شوہر سے جھگڑے گی اس لیے کہ وہ دولت پیدا کرنے کے علاوہ دوسروں کی بیویوں کو کیوں نہیں مار ڈالتا۔ وہ نوکر سے اس لیے جھگڑے گی کہ نوکر تو صرف نوکر ہوتے ہیں، تنخواہ یا معاوضہ سے کیا سروکار۔ یہ کھاتے پیتے سوتے جاگتے کیوں ہیں۔ وہ دوسروں کی بیویوں سے جھگڑے گی۔ اس لیے کہ وہ جانتی ہے کہ خود اُن کے بارے میں جیسی رائے رکھتی ہے اُس سے کہیں زیادہ تند و تاریک رائے دوسری عورتیں اُس کے بارے میں رکھتی ہیں وہ خدا سے جھگڑا مول لے گی اس لیے کہ خدا کا تعلق دنیا کی عورتوں سے کیوں ہے!

ایڈیٹروں کی کرامات کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک ایڈیٹر صاحب نے انتقال فرمایا۔ یہاں یہ عرض کردینا مناسب ہوگا کہ جس روایت کا میں تذکرہ کرنے والا ہوں وہ بیان کی ہوئی تو ہے ایک ایڈیٹر صاحب کے ہم پیشہ کی، لیکن دوسری یعنی اُن کا انتقال فرمانا ایک ایسی ایجنسی سے ہے، جس کا کوئی تعلق پہلی سے نہیں ہے۔ مرحوم ایڈیٹر صاحب کی روح جنت کے دروازہ پر پہنچی تو داروغۂ جنت نے اُن کی پذیرائی کرنے سے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ جنت میں ایڈیٹر کا کام نہیں۔ وہاں سے روح جہنم کے دروازہ پر آئی۔ مالکِ دوزخ نے بھی اُن کو قبول کرنے سے انکار کیا کہ جہنم کسی ایڈیٹر کی متحمل نہیں ہوسکتی۔

ایڈیٹر صاحب کی روح نے بغیر کسی تکلف کے جنت اور دوزخ کے درمیان اپنا آفس کھول دیا! نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن ان کو دو دعوتی کارڈ وصول ہوئے۔ ایک جنت سے دوسرا جہنم سے!

دوسرا قصہ اسی دنیا کا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک بستی میں دو اخبارات تھے ایک کا نام بچھو تھا اور دوسرے کا نام بھالا۔ تھوڑے ہی دنوں میں بستی میں کہرام مچ گیا۔ نہ کسی کی جان کی خیر تھی نہ مال کی نہ آبرو کی۔ آخر میں ایک شریف آدمی نے بڑی جدوجہد کے بعد دونوں اخباروں کے ایڈیٹروں کو مدعو کیا تاکہ وہ صلح کرلیں اور بستی کے لوگ حیاتِ مستعار کے کچھ دن امن و عافیت سے بسر کرلیں۔

بچھو کے مدیرِ مسئول صاحب تشریف لائے جو ہر حیثیت سے اسمِ بامُسمّٰی تھے اب تلاش شروع ہوئی کہ بھالا کے سمپادک کہاں تشریف رکھتے ہیں، بڑی دیر کی جستجو اور دوڑ دھوپ کے بعد بچھو صاحب نے ظاہر فرمایا کہ موصوف ہی بھالا کے بھی ایڈیٹر تھے۔

اس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس سعادت مند فرقہ کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جھگڑنا اکثر غم وغصہ یا حماقت کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ محض ایک مشغلۂ زندگی کے طور پر جیسے شعر کہنا، خضاب لگانا یا افیون کھانا۔ ایک زمانہ میں میرا قیام ایک ایسے محلّہ میں تھا، جہاں دو پڑوسیوں میں مکان کی تقسیم کا جھگڑا تھا۔ یہ جھگڑا ہر منزل سے گزر کر عدالت تک پہنچا اور مکان دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، لیکن جھگڑے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سورج ڈوبتے ہی ڈیوائڈ لائن کے اِدھر اُدھر دو بڈھے دکھائی دیتے پہلے ایک آیا۔ ایک ہاتھ میں بڑا سا رومال، دوسرے میں حقہ، دوسرے صاحب بھی فوراً نمودار ہوئے۔ ایک ہاتھ میں رومال دوسرے میں بیڑ۔ دونوں نے اپنے اپنے رومالوں سے بیٹھنے کی جگہ صاف کی۔ ایک نے اللہ کا نام لیا اور بیٹھ گیا۔ دوسرے نے نزلہ کو گالی دی اور بیٹھ گیا۔ ایک نے کہا ''آداب بجالاتا ہوں میرن صاحب''، دوسرے نے کہا ''مجرا عرض ہے منجھو صاحب''۔ اس کے بعد حجت شروع ہوئی۔ 15 منٹ تک میرن صاحب بے نقط سناتے رہے اور منجھو صاحب خاموش سنتے رہے اور حقہ پیتے رہے اس کے بعد منجھو صاحب نے حقہ میرن صاحب کے اور میرن صاحب نے بیڑ منجھو صاحب کے حوالے کی جن کو دونوں نے فرشی سلام کے ساتھ قبول کیا اور دوسرے 15 منٹ تک منجھو صاحب میرن صاحب کو صلواتیں سناتے رہے اور میرن صاحب خاموش سنتے رہے اور حقہ پیتے رہے دو گھنٹے مسلسل میر صاحبان جھگڑتے رہے اور حقہ اور بیڑ باری باری بدلتے رہے، حقہ جل جاتا تو نوکر دوسرا حقہ لاکر رکھ دیتا اور پہلا حقہ اُٹھالے جاتا یہ ناممکن تھا کہ جب ایک گل فشانی کر رہا ہو تو دوسرا حقہ چھوڑ کر جواب دے۔ یہاں تک کہ وقت ختم ہو جاتا اور میر صاحبان ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو جاتے۔

(مطبوعہ: علی گڑھ میگزین، 49-1948، نگار لکھنؤ، مارچ 1949)

●●●

زندگی کی پریشانیاں

چغلی

اس شعر کے سننے کے بعد معلوم نہیں کتنے وسوسے میرے بارے میں آپ کے دل میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ شعر پڑھ کر گفتگو شروع کرنا بھلے مانس یا بھلے چنگے کا کام نہیں، شعر کتنا ہی اچھا ہو اگر اُسے کوئی نالائق پڑھ دے یا بے موقع پڑھے اور ریڈیو پر نہ بھی پڑھے جب بھی پڑھنے والے کو زدوکوب کرنے کی ایک عجیب اور اچھوتی سی اُمنگ دل میں پیدا ہوتی ہے، لیکن میں نے یہ شعر دراصل اس لیے پیش کیا ہے کہ آپ مجھے مخلص سمجھیں۔ آج کی گفتگو کا جو موضوع ہے وہ میرے ذہن یا زندگی میں موجود ہے یا نہیں، دیکھ لیجیے اس شعر میں صاف موجود ہے یعنی "پریشانی"۔

دوسرے یہ کہ اس شعر میں جو لفظ اُن آیا ہے حاشا اُن سے میرے تعلقات شاعرانہ یا شعری یا خانگی قسم کے بالکل نہیں ہیں۔ تیسرے یہ کہ "کیا کہتے ہیں" اس میں کہنے والا میں بالکل نہیں ہوں۔ یہ مجھ پر تہمت ہوگی۔ میرے حصے میں تو صرف سننے کا عذاب آیا ہے۔ چوتھے یہ کہ آپ یہ نہ دیکھئے کہ میں نے شعر کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے بلکہ یہ دیکھئے کہ اس شخص کا میرے ساتھ کیا سلوک ہے جو اس شعر میں آیا ہے۔

ان بزرگ کا تخلص یا تکیۂ کلام "اجی وہ تو" ہے۔ آپ کچھ کہنے والے ہوں گے یہ اپنے اس تکیۂ کلام سے آپ کو آگے بڑھنے سے روک دیں گے اور پیچھے ہٹنے کے قابل نہیں رکھیں گے۔

آپ صرف دانت پیس کر رہ جائیں گے بشرطیکہ وہ مصنوعی نہ ہوں یا دانت کٹکٹا کر رہ جائیں گے اگر وہ مصنوعی ہونے کے ساتھ ڈھیلے بھی ہوئے۔ اس ''اجی وہ تو'' کہنے کا انھوں نے ایک اسٹائل بنا رکھا ہے۔ آپ کوئی سوال کریں وہ انھیں تینوں الفاظ کے مختلف سُروں کے اُتار چڑھاؤ سے جواب دینے کا اہتمام کریں گے لہجے میں حسب موقع اور ضرورت تصوف، تہوّر یا تفریح کا رنگ و آہنگ ہوگا۔ اس ''اجی وہ تو'' کو اب آپ مختلف لہجوں سے پڑھیے اور حسب خواہش کسی ایک یا دو پر زور دیجیے۔ موصوف کے جواب یا نیت کی بے شمار نوعیتیں آپ کے سامنے آئیں گی، صرف وہی بات نہیں آئے گی جو صحیح یا معقول ہوگی۔ مثلاً آپ یہ دریافت کریں کہ لیلیٰ عورت تھی یا مرد تو اُن کے تکیۂ کلام کے اُتار چڑھاؤ سے آپ یہ نتائج اخذ کر سکیں گے۔ (1) میں سوال کرنے سے باز آجاؤں ورنہ لیلیٰ کے رشتے دار مجھے مار ڈالیں گے۔ (2) لیلیٰ کیونسٹ ہے (3) لیلیٰ کے خطوط قاضی عبدالغفار کی ایک تصنیف ہے (4) لیلیٰ ایک علامت ہے اردو شاعری میں یا علامت ہے اردو شاعری کی (5) لیلیٰ مارشل پلان میں تصوف کی تلاش ہے (6) آئیس کریم کی ایک قسم ہے جو انجمن اقوام متحدہ میں تیار ہوتی ہے، لیکن پیش نہیں کی جاتی وغیرہ۔

یہاں پہنچ کر مجھے یہ یاد آیا کہ آج کا موضوع تقریر مجھ سے بدک گیا ہے یعنی مجھے ''اجی وہ تو'' کے ایک خاص شغل مثلاً چغلی سے آپ کو شناسا کرانا ہے۔ بقول ایک صاحب کے ''گویا کہ'' میرے حصے میں چغلی آئی ہے۔ تو دراصل بات یہ ہے کہ چغلی نہ میری عادت ہے نہ بھاوت، زیادہ سے زیادہ یہ میری قسمت ہو سکتی ہے جو آج کے لیے ریڈیو نے مجھے ارزانی فرمائی ہے۔

معلوم نہیں آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ بعض ایسے ہیں اور بعض کہتے ہیں سبھی ایسے ہیں جن کے دونوں کاندھوں پر دو فرشتے بیٹھے رہتے ہیں۔ داہنی سمت کا فرشتہ ہماری نیکیاں اور بائیں سمت کا ہمارے گناہ لکھتا جاتا ہے۔ قیامت کے دن ہمارے لیے جنت و جہنم کا فیصلہ انھیں تحریروں کی بنا پر ہوگا۔ اب تک یہ نہیں معلوم ہو سکا ہے کہ فرشتے داہنی سے بائیں جانب لکھتے ہیں یا بائیں سے داہنی جانب۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ گناہ کا فرشتہ داہنی جانب سے لکھتا ہے یا نیکی کا فرشتہ۔ ممکن ہے فرشتے دونوں رسم خط سے واقف ہوں اور جب معاملہ فرشتوں کا ٹھہرا تو یہ بھی ناممکن نہیں کہ رسم خط کوئی ہو لکھتے ایک ہی طرف سے ہوں۔ یہ بات اچنبھے کی ہو تو ہو، لیکن اس میں بھی کوئی کلام

نہیں کہ ہم میں سے بعض کے اعمال بھی کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ اسی طرح لکھے جا سکتے ہیں۔ مگر اس وقت چاہے میں جتنا بدقسمت ہوں انصاف کا دامن چھوڑنے کے لیے تیار نہیں (بعض اسے بھی بدقسمتی ہی کا ایک سبب قرار دیتے ہیں) چنانچہ میں یہ بات کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ اربابِ ریڈیو اور فرشتوں میں ایک فرق بھی ہے۔ ریڈیو کا حال یہ ہے کہ لکھتے ہم ہیں نشر وہ کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس درجہ ہم نفس ہوں کہ ہم لکھتے بھی وہی ہوں جو وہ نشر کرنا چاہتے ہوں۔ فرشتوں کا حال یہ ہے کہ وہ لکھتے جاتے ہیں نشر بالکل نہیں کرتے، صرف حشر میں نشر کریں گے۔ جو کچھ وہ لکھتے ہیں اُس کی خبر کسی کو نہیں ہوتی بقول شخصے فرشتوں کو بھی نہیں۔ غالب کو اس طرح کے کاروبار سے ایک مرتبہ شکایت ہوگئی تھی۔ ہم فرشتوں کے لکھے پر ناحق پکڑے جاتے ہیں اس لیے کہ دمِ تحریر ہمارا کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔ وہ اسے خفیہ خبر رسانی یا چغلی سے تعبیر کرتے تھے۔

غالب کے زمانے کے بعد ہمارے ذہن و اخلاق میں کچھ اس طرح کی غیر جانب داری آگئی ہے کہ ہم نے اس طریقۂ کار کو مان لیا ہے اور ہم نے ان فرشتوں کو وہی حیثیت دے دی ہے جو اقوامِ متحدہ کے آبزرورز کی ہوتی ہے۔ آبزرورز کا ترجمہ اس وقت جلدی میں میرے ذہن سے اُڑ گیا، لیکن اس خلا کو پُر کرنے کے لیے اقبال کا ایک مصرعہ ذہن میں آگیا۔ مثلاً:

"آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں۔"

مجھے یقین ہے کہ آبزرورز قطعاً غیر جانب دار ہوتے ہیں اور جو کچھ دیکھتے یا دیکھ پائے یا دیکھ پاتے ہیں وہی رپورٹ کرتے ہیں حالاں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری اس نوع میں جس کو انسان کہتے ہیں ایسے حضرات موجود ہیں اور معلوم نہیں کتنے اور آنے والے ہیں، جن سے فرشتوں جیسے معصوموں کا عہدہ برآ ہونا تو درکنار شیطان کا انجام بھی اُمید افزا نہیں معلوم ہوتا، لیکن ہم شیطان کے ساتھ انصاف کریں یا نہیں فرشتوں کے ساتھ اخلاق برتنے پر مجبور ہیں۔ فرشتوں میں ایک کمال یہ رکھا گیا ہے کہ وہ ایک ہی طرح کا کام کر سکتے ہیں مثلاً وہ یا تو خدا کی عبادت یا ہماری روح قبض کرتے ہیں۔ یہ بات فرشتوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ممکن ہے بعض عبادت گزاروں کی سمجھ میں بھی نہ آئے جو خدا کی عبادت کرنا اور اُس کے بندوں کی روح قبض کرنا ایک ہی چیز سمجھتے ہوں۔ میں کسی کی چغلی نہیں کھاتا ریڈیو پر تو میں بھی اس کا بڑا لحاظ رکھتا ہوں۔

چغلی کھانا غذا بھی ہے اور ورزش بھی۔ آج کل حال ایسا ہو رہا ہے کہ غذا ناپید ہو رہی ہے اور ورزش بڑھتی جاتی ہے، اس لیے ایسی چیز کی مانگ بڑھ گئی ہے جو غذا اور ورزش دونوں سے نجات دلا سکے۔ چغلی ایسی غذا ہے جس کے بغیر ہماری سوسائٹی کا دسترخوان پھیکا اور ویران رہتا ہے۔ جس طرح کھانے کا راز وٹامن میں ہے سوسائٹی کی آبرو چغلی سے ہے۔ غالب نے ایک جگہ بتایا ہے:

نظر میں ہے ہمارے جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اگر یہ صحیح ہے تو یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ ہماری سوسائٹی کی تمام شیرازہ بندی چغلی سے ہے ہمارے یہاں کوئی اجتماع پرائیویٹ یا پبلک ایسا نہ ہوگا جہاں چغلی کی گرم بازاری نہ ہو۔ میں نے دو عورتوں کو ایسا نہیں دیکھا جو اکٹھا ہوتی ہوں اور تیسرے کے بارے میں کلمۂ خیر نہ کہہ رہی ہوں اور ایسے دو مذہبی یک جا نہ پائے جو کسی نہ کسی عورت یا کسی نہ کسی کے کفر پر تبادلۂ خیالات نہ کر رہے ہوں۔ دو ادیب ایسے بھی نہیں ملیں گے جو کسی تیسرے ادیب پر ایسے خیالات کا اظہار نہ کر رہے ہوں جسے ادبی چغلی یا جدید تنقید کہتے ہیں۔ یہی حالت سیاست کے میدان یا ایوان میں نظر آئے گی۔

آپ نے بعض شہروں میں ایک آدھ شکرم یا گھوڑا گاڑی دیکھی ہوگی۔ ایک زمانے میں ان کا بڑا رواج تھا۔ اُمرا اور پردہ نشیں خواتین اس میں بیٹھتے تھے۔ آگے کوچوان بیٹھتا اور پیچھے سائیس کھڑا ہوتا۔ یہ بہت دنوں کی بات ہے۔ اُمرا ورؤسا اور پردہ نشیں خواتین کا جو انجام ہوا وہی ان گاڑیوں کا بھی ہوا۔ اب بھی کبھی کبھار یہ گاڑیاں نظر آتی ہیں۔ صرف ایک اُجڑا سا کوچوان ہوتا ہے۔ دُبلا پتلا گھوڑا اور ویسا ہی ساز و سامان۔ یہ گاڑی شہر کی سڑکوں سے گزرتی ہے تو ادھر اُدھر گھومنے والے لڑکوں کی عید ہو جاتی ہے۔ ان میں سے ہر لڑکا دوڑ کر پیچھے والی جگہ پر بیٹھنا چاہتا ہے۔ لڑ جھگڑ کر ایک کامیاب ہو جاتا ہے اور بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھ جاتا ہے تو ہارا ہوا لڑکا آگے بڑھ کر کوچوان سے کہتا ہے۔ ''گاڑی کے پیچھے لونڈا!'' کوچوان وہیں سے بیٹھا اپنا لمبا چابک مارتا ہے اور بیٹھا ہوا لڑکا جگہ چھوڑ دیتا ہے۔ گاڑی چلتی رہتی ہے اور لڑکے یہ کھیل کھیلتے رہتے ہیں۔ نامراد اور ناکام، کامیاب و کامران کے خلاف کوچوان سے چغلی کھاتے رہتے ہیں اور وہ اپنے

کوڑے سے ہر کامیاب کی مدارات کرتا چلا جاتا ہے۔ کوچوان گاڑی کی اس نشست پر خاردار تار پھیلا دیتے ہیں تا کہ کوئی منچلا اس جگہ پر قبضہ کرنے کی ہمت نہ کرے۔

''گاڑی کے پیچھے لونڈا'' کا نعرہ مجھے اب تک نہیں بھولا ہے، اور کیسے بھولے جب ہر گاڑی کے ساتھ یہی کاروبار لگا ہوا ہے۔ کوئی منصب ہو اُس کے حصول کے لیے جب کش مکش شروع ہوتی ہے تو ایک کامیاب ہوتا ہے اور بقیہ تمام اس نعرے کو طرح طرح سے بلند کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ میونسپلٹی ہو یا یونیورسٹی، ایوانِ سیاست ہو یا حریم شریعت، ان جاگیروں کے لیے کیا کیا فضیحتا ہوتا ہے۔ نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ کوڑے مار یا کوڑھ مغز گاڑی کی ان نشستوں پر نکیلے تاروں کا جال باندھ دیتا ہے یا نشست کے تختے کو اُکھیڑ دیتا ہے۔

حکومتی کاروبار میں چغلی بے معنی نہیں۔ اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ حکومت جس برائی کو ہم نیٹو یا آپ نیتاؤں سے دور نہیں کر پاتی اُس کو خود اختیار کر لیتی ہے۔ اصول یہ ہوتا ہے کہ حکومت کی سرپرستی میں وہ برائی بڑائی میں نہیں تبدیل ہو جاتی تو کچھ ایسی بُرائی ہی نہیں رہتی، چغلی کا بھی یہی حال ہے۔ اب تک اس کا کاروبار ہم آپ کاٹیج انڈسٹری کے طور پر کرتے آئے ہیں۔ اچھی حکومت کے فرائض میں سے یہ بھی ہے کہ وہ مفید اور منفعت بخش صنعتوں کو اس طور پر فروغ دے کہ اُس کا فائدہ محدود نہ رہے بلکہ عام ہو جائے۔ اس کارِ خیر کو نیشنلائز کرنا کہتے ہیں۔ چنانچہ چغلی کو اب نیشنلائز کر لیا گیا ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت ایسی نہیں ہے جہاں چغلی کو یہ درجہ نہ دیا گیا ہو۔ اب افراد ہی ایک دوسرے کی چغلی نہیں کھاتے بلکہ حکومتیں بھی ایک دوسرے کی چغلی کھا سکتی ہیں۔ جو پہلے کبھی قبروں کی تقسیم کے لیے کفن چوروں کی انجمن قائم کر لی تھی انھوں نے اب چغلی کا دفتر، چغلی کی جاں کاہیں اور چغلی کی رصدگاہیں قائم کر دی ہیں جب جی چاہتا ہے اُس کے مشاعرے منعقد کر لیتی ہیں۔ اب چغلی کاٹیج انڈسٹری نہیں رہی۔ اس کا شمار اب Heavy Industries میں ہوتا ہے۔

بات یہ ہے کہ ایک زمانے میں (آپ کو یقین آئے نہ آئے) میں بچہ تھا اور مٹی کھانے کا عادی تھا اور اس بنا پر مار کھانے کا بھی۔ اُس زمانے میں تعلیم کا کوئی ایسا بنیادی طریقہ نہیں نکلا تھا جو مار پیٹ کا بدل ہوتا۔ ایک دن مجھے اچھی طرح پیٹنے کے بعد بتایا گیا کہ مٹی کھانا بُرا ہے اور کھا کر

انکار کرنا اور بھی بُرا ہے۔ اس کے بعد مجھے دُھلے کپڑے پہنائے گئے کچھ اچھی چیزیں کھلائی گئیں۔ تھوڑی سی ہاتھ میں دے دی گئیں اور پیار کر کے کھیلنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ پٹنے کے بعد یہ عیش و تکلفات! میں نے سوچا کہ پٹنا کچھ اتنا بُرا سودا نہیں۔

گرمی کی دوپہر تھی۔ میں نے مٹی کھائی۔ نوکر سو رہا تھا اُس کی پگڑی سے منہ صاف کیا اور گھر میں اطمینان سے آ کر والدہ کے پاس لیٹ رہا۔ وہ کچھ نیم غنودگی کی حالت میں تھیں مجھے کھینچ کر سینے سے چمٹا لیا اور بے خبر سو گئیں۔ مجھے نیند نہیں آئی اور برابر کسمساتا رہا۔ آخر میں نے گفتگو شروع کر دی۔ انھوں نے جلد جلد تھپک کر سو جانے کی ترغیب دی جیسا کہ نیند کی ماتی ماؤں کا حال ہوتا ہے، لیکن جس کی زبان اور ضمیر دونوں پر مٹی ہو، اُس کی بھی کچھ مشکلات ہوتی ہیں۔ وہ سو کیسے سکتا ہے۔ میں نے کہا، اماں دیکھیے۔ رمضانی (نوکر) کیسا بُرا آدمی ہے مٹی کھاتا ہے، اور پگڑی سے اپنا منہ پونچھ ڈالتا ہے۔ میں نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ والدہ کے کرتے سے اپنا منہ بھی پونچھنا شروع کر دیا۔ بھانڈا پھوٹ گیا، اور میرا جو کچھ حشر ہوا وہ بھی کچھ ایسی بات نہ تھی۔ حشر میں ہوتا بھی اور کیا ہے، لیکن جو بات مجھے اس وقت سب سے زیادہ تلخ اور میری سمجھ سے باہر معلوم ہوئی وہ یہ کہ میرے اس کارنامے کا چرچا ہر موقعے پر ہر کس و ناکس سے کیا گیا، اور کس تو کس ناکس بھی ہنستا تھا۔ رمضانی بھی۔

کچھ دنوں بعد ایک دیہاتی اسکول میں مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی ریڈر میں مجھے ایک نظم پڑھنی پڑی جس کا عنوان چغلی تھا۔ ایک بڑے ہی موٹے کالے اور گم سم سے ڈپٹی صاحب اسکول کا معائنہ کرنے تشریف لائے تھے۔ پوری کلاس جس میں میں بھی تھا ایک قطار میں کھڑی کر دی گئی جیسے آج کل بڑی بڑی حکومتیں گولی مار دینے کے لیے مجرموں کو کھڑا کرتی ہیں۔ ہم سب کے ہاتھ میں ریڈر تھی۔ ڈپٹی صاحب نے مجھ سے کہا۔

''کتاب کھول اور پڑھ۔''

مجھے اُن کا لہجہ اور تیور اندھیرے اور سنسان کمرے میں اب بھی یاد آ جاتے ہیں اور ڈپٹی صاحب کے وہ الفاظ بھی نہیں بھولے ہیں جو غار حرا میں حضرت جبرئیل کی معرفت خدا نے ہمارے پیغمبر پر سب سے پہلے نازل کیے تھے جن کا ترجمہ ایک ڈپٹی صاحب ہی نے یہ کیا ہے۔

''پڑھ ساتھ نام پروردگار اپنے کے۔'' میں نے کتاب کھولی تو چغلی والی نظم سامنے آئی۔ میں نے شعر پڑھا:

چغلی ہے بُرا کام بچو اس سے ہمیشہ
جو لوگ ہیں بے شرم انھیں کا ہے یہ پیشہ

ڈپٹی صاحب نے کہا: ''بے شرم کسے کہتے ہیں؟'' میں نے کہا: ''جو لوگ پاجامہ نہیں پہنتے۔'' ڈپٹی صاحب نے پاس والے لڑکے کی طرف جو دھوتی باندھے ہوئے تھا اشارہ کر کے پوچھا: ''یہ بے شرم ہے یا نہیں؟'' میں نے کہا: ''یہ بے شرم نہیں ہے مانیٹر ہے۔'' ڈپٹی صاحب اُس کے سامنے آئے اور پوچھا: ''کیوں بے مانیٹر ہے؟'' اُس نے کہا: ''صاحب پھرا کے ہٹو تھوک اُڑت ہے۔'' یعنی صاحب ذرا دور ہٹ کر بات کیجیے تھوک اُڑاتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب نے اس وقت لڑکوں کا امتحان اور اسکول کا معائنہ دونوں کو ختم کر دیا۔ دوسرے دن لڑکا مانیٹری سے برخاست ہو گیا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب اپنی جگہ پٹوار گیری پر واپس کر دیے گئے اور میں دیر تک اپنے ہی کان پکڑے بنچ پر کھڑا رہا اور محو حیرت رہا۔ بغیر کسی خیال کے دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی بے شرمی کو پاجامہ نہ پہننے سے تعبیر کرنا میرے لیے بالکل مشکل نہیں تھا۔ بچپن میں مجھے پاجامہ پہننے سے زیادہ پاجامہ کو طرح طرح سے سر کے گرد چکر دینے، سر پر لیے لیے پھرنے اور

''دہی لے لو دہی''

کی صدا نکالنے میں مزا آتا تھا۔ والدہ پاجامہ چھین کر مجھے بٹھاتی جاتیں اور کہتی جاتیں ''تو بڑا بے شرم ہے پاجامہ نہیں پہنتا۔''

بات آئی گئی ہوئی اور بہت دنوں کی ہوئی، لیکن بے شرمی کا میرا تصوّر اب بھی کچھ اسی قسم کا ہے جو اکثر موقعوں پر میری چغلی کھاتا رہتا ہے۔

(نشریہ: 1949۔ مطبوعہ: آج کل، دہلی، یکم جون 1949)

●●●

عجب حالت ہوتی ہے!

دعوت دینے میں

دعوت دینے میں حالت عجیب ہی نہیں ہوتی غریب بھی ہوجاتی ہے۔ بشرطیکہ دعوت دینے والے کا تعلق کسی خفیہ فنڈ یا بلیک مارکیٹ سے نہ ہو۔ دعوت دینے والے بالعموم غریب ورنہ بےوقوف ہوتے ہیں! اگر مہمان بھی غریب ہوں تو پھر یا مظہر العجائب والغرائب! عربی میں غریب کے معنی نادار اور مسافر کے ہیں۔ یہ لفظ ہمارے دیار میں پہنچا تو اس کے وہ معنی ہوگئے جن کے بارے میں بعضوں کا خیال ہے کہ اُن کے خون سے تاج محل کی تعمیر ہوتی ہے!

ہماری زبان کے ایک مشہور پارکھ نے بتایا ہے کہ جو لفظ جس تلفظ سے جس مفہوم میں ہمارے ہاں چالو ہوگیا ٹھیک ہے چاہے وہ اپنے اصلی گھر میں کسی تلفظ سے کسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہو۔ غریب کی بدنصیبی دیکھیے جہاں گیا اس کا انجام کچھ کا کچھ ہوتا رہا۔ اب بعض دوستوں نے اس کا نیا مصرف دریافت کیا ہے۔ غریب ہی کا نہیں تاج محل کا بھی۔ غریب کا یہ تصوّر اس کے اصلی معنی سے عجیب تر ہے، یعنی جس کسی کو تاج محل بنوانا ہو وہ غریب کا خون استعمال کرے۔

اور جب کہ تاج محل کا ذکر آ ہی گیا، آیئے دیکھیں دعوت دینے میں تاج محل کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ تاج محل کی حالت اس لیے اور قابلِ رحم ہے کہ وہ بلائے یا نہ بلائے لوگ یوں بھی پہنچ جاتے ہیں پھر وہ بلائے بھی تو کس منہ سے۔ بلانے کا اس کا مقصد کچھ ہی کیوں نہ ہو، جو لوگ

بلائے جائیں گے ان کی نیت اور نظر کا کیا علاج! تاج محل تو دعوت دیتا ہے اس کی کہ لوگ آئیں اور دیکھیں کہ محبت کا پاکیزہ حسین اور بلند تصوّر انسانی تخلیقی سرگرمی میں جلوہ گر ہو کر ہماری کن اَن گنت معلوم و نامعلوم صلاحیتوں کو دعوت دیتا ہے، اور ہمارے آپ کے بعد آنے والی نسلوں کی نظر میں ہم کو کس درجہ برگزیدہ اور محبوب بناتا ہے۔ تاج محل ہم کو دعوت دیتا ہے اس کی کہ ہم دیکھیں اور اس پر ایمان لائیں کہ انسان کہیں کا ہو کسی نسل کا ہو کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو، یگانگت کا مشترک رشتہ ضرور رکھتا ہے اور فکر و نظر کی بلندی و پاکیزگی کسی تعمیر میں منتقل ہو کر کن انسانی خوبیوں اور مبارک صلاحیتوں کو فروزاں کرتی اور ان کو تقدیس بخشتی ہے اور انسانوں کو بلا کسی امتیاز کے ترقی و تجمل کی کن مہکتی دمکتی اور لہلہاتی ہوئی وادی کی طرف رہبری کرتی ہے۔ تاج محل دعوت دیتا ہے اس حقیقت کے پہچاننے کی کہ وہ فنونِ لطیفہ اور اخلاقِ فاضلہ کا ایک متوازی اور مکمل نمونہ ہے۔ راگ رنگ، رقص روپ، رمز و روایات کے کون سے نازک یا دقیق نقش نہیں جو انتہائی زیبائی و برنائی کے ساتھ اس میں جلوہ گر نہیں ہیں ـــــ لیکن دیکھنے والوں میں ایسے بھی ہیں جو تاج محل کے پورے وجود کو غریبوں اور ناکسوں کے خون سے آلودہ دیکھتے ہیں، اور خود یقین رکھتے ہوں یا نہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایک مطلق العنان بادشاہ نے اپنی عیش کوشی غریبوں کی بے چارگی پر خندہ زن رہنے کی یادگار قائم کی ہے۔[1]

اس تعبیر و تصوّر پر غور کرتا ہوں تو ذہن میں بے اختیار یہ بات آتی ہے کہ پچھلی اور اس سے پہلے کی جنگِ عظیم میں بھی جب سفاکی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور فتح یا انتقام کا جنون پورے عروج پر تھا، بے رحم سے بے رحم غارت گر بھی نوادر کو تلف کرنے کی ہمت نہ کر سکا کوئی نہ کوئی چیز باقی رہ گئی تھی، جو اِن کو تجاوز کرنے سے روک دیتی تھی۔ یہ تو مادّی نوادر تھے۔ مثلاً عمارات، عبادت خانے، عجائب خانے، تصاویر، تحریریں، مقبرے اور یادگاریں وغیرہ، لیکن یہ کیسے لوگ ہیں اور یہ کیسا مسلک ہے جو بڑی سے بڑی قدر اور تصوّر کو چاہے ان کے پیچھے کتنی ہی مبارک اور کیسی ہی مقدس روایات کیوں نہ ہوں بغیر کسی پس و پیش کے آناً فاناً خاک میں ملا دیتا ہے۔ ذہنی بربریت کی یہ بھیانک مثال بیسویں صدی کے وسط میں خاصے اچنبھے کی بات ہے! تعبیر و تلبیس کی یہی کارفرمائی رہی

1۔ نظم۔ تاج محل از ساحر لدھیانوی

تو غالباً دنیا کی اچھی سے اچھی بڑی سے بڑی اور خوب صورت سے خوب صورت شے بھی ایسی نہ رہ جائے گی جو غریبوں کے خون سے آلودہ یا جنسی آلودگیوں پر مبنی نہ ہو!

ایک عرصے سے کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ شاید ہی کوئی شریف آدمی خوشی خاطر کسی کو دعوت دیتا ہو، پھر یہ کن لوگوں کو بلائے اور کن کو نہ بلائے۔ اس لیے کہ ہوتا یہ ہے کہ جن کو بلائے وہ اتنا خوش نہیں ہوتے جتنا وہ لوگ ناراض ہوتے ہیں جن کو نہ بلائے۔ میزبان کی حالت اس وقت عجیب ہوتی ہے جب بے تکلف مہمان مقررہ وقت سے دو ایک گھنٹہ پہلے ہی نازل ہو جاتے ہیں۔ جب سے راشن بندی ہوئی ہے مہمان کا دیر سے آنا تو بالکل ہی بند ہو چکا ہے۔ بے تکلف مہمان آتے تو اس لیے ہیں کہ زائد سے زائد سگریٹ اور پان بطور کمیشن حاصل کریں اور حیلہ کریں گے کہ آپ سے کیا تکلف اپنا گھر ہے۔ آپ کا ہاتھ بٹانا تھا۔ یہی وقت میزبان کی انتہائی مصروفیت کا ہوتا ہے۔ دعوت کے سلسلے میں معلوم نہیں اُسے کتنے معقول اور نامعقول کام کرنے ہوتے ہیں تب کہیں وہ وقت آتا ہے جب وہ کسی قدر اطمینان و اعتماد کے ساتھ دعوت میں اپنی آبرو بچانے کے قابل ہوتا ہے۔

آنے کے ساتھ ہی موصوف ایک ایسا قہقہہ لگائیں گے جس سے میزبان کا بچا کھچا عفو و تحمل ختم ہو جائے گا۔ فرمائش کریں گے پان اور سگریٹ لائیے۔ ان سے شغل شروع ہوتے ہی گھر کا کوئی کام یاد آ جائے گا جو بالعموم یہ ہوگا کہ فلاں صاحب سے وعدہ تھا کہ اسی وقت ملنے تشریف لائیں گے۔ گھر پر یہ پیغام بھیجنا چاہتا ہوں کہ وہ یہیں بھیج دیے جائیں۔ آدمی شریف اور بے تکلف ہیں، یہاں کھا لینے میں مطلق تامل نہ کریں گے اور ہاں خوب یاد آیا ایک ضروری خط لکھنا تھا۔ ذرا کاغذ لفافہ منگائیے۔ آپ لانے کے لیے اُٹھیں گے اور تھوڑی دور چلے ہوں گے کہ پکار کر فرمائیں گے ذرا قلم بھی لیتے آئیے گا۔ آپ تین چوتھائی فاصلہ طے کر چکے ہوں گے کہ دہاڑ کر آواز دیں گے، ارے بھئی ٹکٹ بھی لیتے آنا۔ آپ یہ سب لے کر آئیں گے تو وہ خط لکھنا شروع کر دیں گے۔ اب بھی خاموش نہ ہوں گے کبھی آج کی تاریخ پوچھیں گے کبھی مہینہ بھر قبل یا سال بھر بعد کی۔ الفاظ کے ہجے پوچھتے رہیں گے کسی کا نام بھول گئے ہوں گے تو اس کا حلیہ یا اس کے اعمال بتا کر نام دریافت کریں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ کاغذ کے پھٹنے کی آواز

بلائے جائیں گے ان کی نیت اور نظر کا کیا علاج! تاج محل تو دعوت دیتا ہے اس کی کہ لوگ آئیں اور دیکھیں کہ محبت کا پاکیزہ حسین اور بلند تصوّر انسانی تخلیقی سرگرمی میں جلوہ گر ہوکر ہماری کن اَن گنت معلوم و نامعلوم صلاحیتوں کو دعوت دیتا ہے، اور ہمارے آپ کے بعد آنے والی نسلوں کی نظر میں ہم کو کس درجہ برگزیدہ اور محبوب بناتا ہے۔ تاج محل ہم کو دعوت دیتا ہے اس کی کہ ہم دیکھیں اور اس پر ایمان لائیں کہ انسان کہیں کا ہو کسی نسل کا ہو کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو، یگانگت کا مشترک رشتہ ضرور رکھتا ہے اور فکر و نظر کی بلندی و پاکیزگی کسی تعمیر میں منتقل ہوکر کن انسانی خوبیوں اور مبارک صلاحیتوں کو فروزاں کرتی اور ان کو تقدیس بخشتی ہے اور انسانوں کو بلا کسی امتیاز کے ترقی و تجمّل کی کن مہکتی دمکتی اور لہلہاتی ہوئی وادی کی طرف رہبری کرتی ہے۔ تاج محل دعوت دیتا ہے اس حقیقت کے پہچاننے کی کہ وہ فنونِ لطیفہ اور اخلاقِ فاضلہ کا ایک متوازی اور مکمل نمونہ ہے۔ راگ رنگ، رقص روپ، رمز و روایات کے کون سے نازک یا دقیق نقش نہیں جو انتہائی زیبائی و برنائی کے ساتھ اس میں جلوہ گر نہیں ہیں ـــــ لیکن دیکھنے والوں میں ایسے بھی ہیں جو تاج محل کے پورے وجود کو غریبوں اور ناکسوں کے خون سے آلودہ دیکھتے ہیں، اور خود یقین رکھتے ہوں یا نہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایک مطلق العنان بادشاہ نے اپنی عیش کوشی غریبوں کی بے چارگی پر خندہ زن رہنے کی یادگار قائم کی ہے۔ [1]

اس تعبیر و تصوّر پر غور کرتا ہوں تو ذہن میں بے اختیار یہ بات آتی ہے کہ پچھلی اور اس سے پہلے کی جنگ عظیم میں بھی جب سفّا کی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور فتح یا انتقام کا جنون پورے عروج پر تھا، بے رحم سے بے رحم غارت گر بھی نوادر کو تلف کرنے کی ہمت نہ کرسکا کوئی نہ کوئی چیز باقی رہ گئی تھی، جو اِن کو تجاوز کرنے سے روک دیتی تھی۔ یہ تو مادّی نوادر تھے۔ مثلاً عمارات، عبادت خانے، عجائب خانے، تصاویر، تحریریں، مقبرے اور یادگاریں وغیرہ، لیکن یہ کیسے لوگ ہیں اور یہ کیسا مسلک ہے جو بڑی سے بڑی قدر اور تصوّر کو چاہے ان کے پیچھے کتنی ہی مبارک اور کیسی ہی مقدس روایات کیوں نہ ہوں بغیر کسی پس و پیش کے آناً فاناً خاک میں ملا دیتا ہے۔ ذہنی بربریت کی یہ بھیانک مثال بیسویں صدی کے وسط میں خاصے اچنبھے کی بات ہے! تعبیر و تلبیس کی یہی کارفرمائی رہی

---

[1] نظم۔ تاج محل از ساحر لدھیانوی

تو غالباً دنیا کی اچھی سے اچھی بڑی سے بڑی اور خوب صورت سے خوب صورت شے بھی ایسی نہ رہ جائے گی جو غریبوں کے خون سے آلودہ یا جنسی آلودگیوں پر مبنی نہ ہو!

ایک عرصے سے کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ شاید ہی کوئی شریف آدمی خوشی خاطر کسی کو دعوت دیتا ہو، پھر یہ کن لوگوں کو بلائے اور کن کو نہ بلائے۔ اس لیے کہ ہوتا یہ ہے کہ جن کو بلائے وہ اتنا خوش نہیں ہوتے جتنا وہ لوگ ناراض ہوتے ہیں جن کو نہ بلائے۔ میزبان کی حالت اس وقت عجیب ہوتی ہے جب بے تکلف مہمان مقررہ وقت سے دو ایک گھنٹہ پہلے ہی نازل ہو جاتے ہیں۔ جب سے راشن بندی ہوئی ہے مہمان کا دیر سے آنا تو بالکل ہی بند ہو چکا ہے۔ بے تکلف مہمان آتے تو اس لیے ہیں کہ زائد سے زائد سگریٹ اور پان بطور کمیشن حاصل کریں اور حیلہ کریں گے کہ آپ سے کیا تکلف اپنا گھر ہے۔ آپ کا ہاتھ بٹانا تھا۔ یہی وقت میزبان کی انتہائی مصروفیت کا ہوتا ہے۔ دعوت کے سلسلے میں معلوم نہیں اُسے کتنے معقول اور نامعقول کام کرنے ہوتے ہیں تب کہیں وہ وقت آتا ہے جب وہ کسی قدر اطمینان و اعتماد کے ساتھ دعوت میں اپنی آبرو بچانے کے قابل ہوتا ہے۔

آنے کے ساتھ ہی موصوف ایک ایسا قہقہہ لگائیں گے جس سے میزبان کا بچا کھچا عفو و تحمل ختم ہو جائے گا۔ فرمائش کریں گے پان اور سگریٹ لائیے۔ ان سے شغل شروع ہوتے ہی گھر کا کوئی کام یاد آ جائے گا جو بالعموم یہ ہوگا کہ فلاں صاحب سے وعدہ تھا کہ اسی وقت ملنے تشریف لائیں گے۔ گھر پر یہ پیغام بھیجنا چاہتا ہوں کہ وہ یہیں بھیج دیے جائیں۔ آدمی شریف اور بے تکلف ہیں، یہاں کھا لینے میں مطلق تامل نہ کریں گے اور ہاں خوب یاد آیا ایک ضروری خط لکھنا تھا۔ ذرا کاغذ لفافہ منگائیے۔ آپ لانے کے لیے اُٹھیں گے اور تھوڑی دور چلے ہوں گے کہ پکار کر فرمائیں گے ذرا قلم بھی لیتے آئیے گا۔ آپ تین چوتھائی فاصلہ طے کر چکے ہوں گے کہ دہاڑ کر آواز دیں گے، ارے بھئی ٹکٹ بھی لیتے آنا۔ آپ یہ سب لے کر آئیں گے تو وہ خط لکھنا شروع کر دیں گے۔ اب بھی خاموش نہ ہوں گے کبھی آج کی تاریخ پوچھیں گے کبھی مہینہ بھر قبل یا سال بھر بعد کی۔ الفاظ کے ہجے پوچھتے رہیں گے کسی کا نام بھول گئے ہوں گے تو اس کا حلیہ یا اس کے اعمال بتا کر نام دریافت کریں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ کاغذ کے پھٹنے کی آواز

سنیں گے جیسے توڑ مروڑ کر دور پھینک دیں گے۔ بہت کچھ ہنس کر بقیہ گھگیا کر فرمائیں گے۔ بھائی ایک مسوّدہ لکھ دو، میں اُسے صاف کر کے بھیج دوں گا۔ بات یہ ہے کہ میں کچھ ایسا لکھنا چاہتا تھا کہ تحریر سے نہ ہاں نکلے نہ نا۔ اس طرح کی چیز تم ہی لکھ سکتے ہو اور ہاں بھائی کوئی مذاقیہ بات بھی لکھ دینا ورنہ کم بخت بُرا مان جائے گا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ نہ اس طرح لکھ سکتے تھے نہ اُس طرح۔ اتنی دیر میں ملازم اُن کے مہمان کو لیے ہوئے پہنچ جائے گا۔ جن کے ساتھ ایک صاحب اور ہوں گے جو خط لکھانے والے دوست کے ہاں اپنا قرض مانگنے گئے تھے اور بے شمار حاضری کے بعد آج قران السعدین ہوا تھا۔ دیکھتے ہی رنگ فق ہو جائے گا۔ ایک موٹی سی گالی نوکر کو اور اس سے زیادہ موٹی نووارد کو زیرِ لب، لیکن اعماقِ قلب سے نکلی ہوئی دے کر جھپٹیں گے اور اس تپاک اور گرم جوشی سے نووارد سے بغل گیر ہو جائیں گے جیسے ''دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے'' نووارد کا تعارف مجھ سے اس طرح کرائیں گے جیسے دعوت دینا میرا پیشہ ہے اور میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہ ہے کہ لوگ میرے ہاں کھانا کھائیں اور مجھ سے مذاق کریں۔ آخر میں کہیں گے خانہ بے تکلف ہے۔ مزید بے تکلفی کھانے کی میز پر ہوگی۔ اس بے تکلفی کی تفصیل یہ ہے کہ نووارد کو اپنے پہلو میں بٹھائیں گے۔ ہر اچھا کھانا بار بار اور زیادہ سے زیادہ مقدار میں اس کی پلیٹ میں ڈالیں گے اپنی اور دوسروں کی گفتگو کا ڈھلان نووارد کی طرف رکھیں گے۔

اس دوران میں نوکر کو خط دیں گے کہ میزبان کی سائیکل لے کر ڈاک خانے چلا جا اور واپسی میں فلاں فلاں سامان شہر سے خریدتا آئے۔ یکا یک دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال کر اس طرح چپ ہو جائیں گے جیسے دو چار سو روپے گھر سے جیب میں ڈال کر چلے تھے، راستے میں کسی نے اُڑا دیے۔ معاً ایک نادر خیال ذہن میں آئے گا۔ میزبان سے فرمائیں گے پانچ روپے نوکر کو دے دیجیے، میں گھر پہنچ کر بھیج دوں گا جو وہ کبھی نہ بھیجیں گے۔ کھانا ختم ہوتے ہی یک بہ یک معلوم ہوگا کہ حضرت غائب ہو گئے۔ سب لوگ ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو گئے، لیکن نووارد بیٹھے ہیں۔ بارہ بجے رات کے قریب معلوم ہوگا کہ یوسف گم گشتہ نے قرض خواہ سے فرمایا کہ انتظار کریں وہ ایک صاحب سے روپے لے کر پل بھر میں واپس آتے ہیں!

میری معلومات میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ نووارد کو رات میں سوجھتا نہیں، کسی کو متعین کر دیا جائے کہ وہ روشنی لے کر ان کو گھر پہنچا آئے۔ سارے نوکر دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد سو چکے تھے۔ مجبوراً یہ خدمت مجھے اپنے سر لینی پڑی۔ میں نے ان کو اپنے ساتھ لیا اور سید ھامفرور دوست کے مکان پر پہنچا۔ ساتھی کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں ان کو کہاں لے گیا تھا۔ نوکر سے اطلاع کرائی کہ ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ دوست کو جگا کر میری اطلاع کرو، آنکھ ملتے، گرتے پڑتے باہر آئے تو میں نے شب کور کا ہاتھ اُن کے ید بیضاً میں دیا اور شب بخیر کہہ کر واپس آ گیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے رات بھر ان کو اپنے ہاں ٹھیرایا اور علی الصباح جب تمام گھر والے سو رہے تھے، یہ ان کی سب سے قیمتی اچکن پہن کر جس میں گھڑی اور فاؤنٹین پن ملفوف تھے اپنے گھر چلے گئے! کئی دن بعد ملاقات ہوئی بولے آپ بھی عجیب آدمی ہیں میں نے عرض کیا اس سے کہیں زیادہ غریب!

اس تمام قصے کو دس سے ضرب دے دیجیے حاصل ضرب وہ حادثات ہوں گے جو گھر کے اندر پیش آ رہے ہوں گے بشرطیکہ خواتین بھی مدعو ہوں۔ اس موقع پر خاتون کے معنی اہل وعیال کے ہوتے ہیں اور اہل وعیال کے معنی خاتون ہی کے نہیں ہیں بلکہ محلّہ بھر کی خادماؤں اور اُن کے اہل وعیال کے ہوتے ہیں۔ اس لیے اور بھی کہ موصوفہ کی خود کوئی خادمہ نہیں ہوتی۔ اس جمِ غفیر کے ساتھ موصوفہ اس جبروت وطنطنہ سے چڑھائی کرتی ہیں جیسے کسی مفتوحہ ملک پر قبضہ لینے تشریف لے جا رہی ہیں۔ لباس، حلیہ، رفتار، گفتار، طور طریقے کسی سے آپ بالکل تمیز نہ کر سکیں گے کہ اس انبوہ میں خود موصوفہ کون اور کہاں ہیں! حسبِ معمول وقت سے کئی گھنٹے قبل تشریف لائیں گی، عذر وہی کہ خانۂ بے تکلف ہے۔ تانگے کے دام دلوائیں گی، اور مالکۂ مکان کے کمرے پر قبضہ کر لیں گی اور اس کے تمام اختیارات اور حقوق سلب کر لیں گی پھر نہایت اطمینان اور اعتماد سے فوجی احکامات صادر کرنے لگیں گی۔

فلاں فلاں بچّے کو فلاں فلاں چیزیں کھیلنے یا کھانے کو دو۔ فلاں فلاں کو فلاں فلاں کی گود میں دو کہ ان کو تفریح کے لیے باہر لے جائیں۔ اطلاعاً یہ بھی عرض ہے کہ یہ گودیں تمام کی تمام میزبان کے لواحقین فراہم کریں گے، پھر حکم ہو گا کہ فلاں کے ابا باہر کھڑے ہیں ان کو کام پر

جانا ہے اس لیے ان کا حصہ ان کے حوالے کر دیا جائے اور فلاں کے ابھی کام یا لام پر سے واپس نہیں آئے ہیں، ان کا حصہ گھر بھیج دیا جائے۔ بقیہ سے کہہ دیں گے کہ باغ، ڈرائنگ روم، سنگار میز، باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ میں پھیل جائیں۔ غارت گری شروع ہوئی۔ باغ میں پھل پھول باقی نہ رہے، فرش اور دیواروں پر ناک تھوک پان کی پیک یا کوئلہ کیچڑ کی لکیریں، ڈرائنگ روم، کبڈی کا میدان یا سوئمنگ باتھ بن گیا۔ آتش دان کی کارنس پر سے کود کر صوفے کو روندر ہے ہیں یا اس پر پیراکی کی مشق کر رہے ہیں۔ ریڈیو کی گھنڈیاں غائب اور وہ خود فرش پر سر بہ سجود۔ سنگار میز کی جو چیزیں توڑ پھوڑ سے بچیں وہ خادماؤں کی نذر۔ باورچی خانے سے کھانے غائب، بچوں کی دوڑ اور نوکرانیوں کی جھپٹ میں چینی کے برتن چکنا چور۔ بچوں کو پیٹ پیٹ کر اور موت کی بشارت دے دے کر اچھی سے اچھی چیزیں کھلائی جا رہی ہیں۔ جو چیزیں آتی ہیں اُسے جھپٹ کر خود لے لیتی ہیں اور نوکرانیوں کو تھماتی جا رہی ہیں کہ گھر لیتی چلنا۔ ساتھی بچوں میں سے کوئی رویا چیخا تو میزبان اور اُس کے ورثا کو ایسی ملاحیاں سنائیں کہ قومی لیڈر بھی ایک دوسرے کو نہ سنا سکے۔ رخصت ہونے لگیں تو اپنے بچوں کے ہونہار ہونے کا یہ مژدہ سنا کر گھر کی مالکہ کی اشک شوئی کر دی کہ ماشاءاللہ بڑا چونچال ہے۔ کتنی ذرا سی جان ہے، لیکن ابا کو بات بات پر ایسی ایسی گالیاں سناتا ہے، اور انھیں کے جوتے سے ایسے ایسے جوتے رسید کرتا ہے کہ مجھے تو کبھی کبھی ڈر لگنے لگتا ہے کہ اُسے نظر نہ لگ جائے اور اس کے ابا اللہ کو پیارے نہ ہو جائیں!

میرے ایک دوست تھے جن کی بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ مہنگائی سے پہلے ہی اس جہان سے اُٹھ گئے عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ دو ایک حاشیہ نشینوں نے مل کر ان کو کسی پر عاشق کر دیا اور یہ عاشق ہو گئے بغیر یہ جانے یا پوچھے ہوئے کہ محبوب کون ہے، کہاں ہے اور ہے بھی یا نہیں! سازش کرنے والوں کی خاطر مدارات شروع ہو جاتی۔ معمولی سی معمولی بات بھی اشارتاً کنایۃً پوچھتے تو اس کی قیمت ایک دعوت ہوتی۔ محبوب گوشت کھانے والوں میں ہوا تو دعوت میں انڈے مرغ اور مچھلی، سبزی کا عادی ہوا تو پوری ترکاری، مٹھائی مربّے ماڈرن ہے تو انگریزی کھانے۔ اونچی سوسائٹی کا ہوا تو لنچ، ڈنر سینما وغیرہ، دلّی یا آگرہ میں دیہاتی ہوا تو شکار، پکنک، فصل کی پکوان نہر کے کنارے کسی گاؤں میں ان میں سے کسی میں محبوب کا دور دور تک پتہ نہ ہوتا، اس فریب کا پتہ

لگ جاتا تو ناراض ہو جاتے اور یہ اُن کی دوسری بدنصیبی تھی۔ سازش کرنے والے مشہور کردیتے کہ وہ سب خود اُن سے سخت مایوس اور بیزار ہیں۔ اس لیے ایک عاشق کے جو آداب ہیں، وہ انھوں نے خود نہ رکھے اس طرح اپنے ہوا خواہوں کو رُسوا کیا۔ چنانچہ ہوا خواہوں کو راضی کرنے کے لیے پھر دعوت دیتے!

اکثر یہ ہوتا کہ ان کا رقعہ گشت میں ہوتا تو جن کے نام نہ ہوتے وہ اپنے نام کا خود اضافہ کردیتے، بعض ایسے بھی ہوتے جو اپنی پسند کے کھانے کا بھی اضافہ کردیتے۔ وہ اس پر ہر ایک کو غلط انگریزی میں گالیاں دیتے، اور اپنے مکان سے باہر چبوترے پر آرام کرسی پر لیٹ جاتے، جو شخص گزرتا اُسے اپنے پاس بلاتے، اور اس طرح کے مدعو ہو جانے والوں کی شکایت کرتے۔ وہ ان کا ہم زبان بن جاتا، اور اس خدمت کے عوض میں مدعو ہونے والوں میں اپنے نام کا اضافہ کرالیتا۔ دعوت میں دو چار ایسے بھی آجاتے ہیں جن کا نام سرے سے کہیں نہ ہوتا۔ اُن سے باز پرس کرتے تو وہ کہتا کہ فلاں صاحب نے کہا تھا کہ ممکن ہے وہ دیر سے پہنچیں اس لیے احتیاطاً مجھے بھیج دیا کہ جب تک وہ نہ پہنچیں میں وہ خدمت انجام دوں۔ لطف یہ ہے کہ یہ جن صاحب کی عوضی پر آئے ہوتے وہ خود مدعو نہ ہوتے۔

اب بعض سازشی، میزبان کو بتاتے کہ ناخواندہ مہمان دراصل جاسوس تھا جو حکومت کی طرف سے یہ ٹوہ لینے آیا تھا کہ میزبان سرکاری زبان غلط تو نہیں بولتے۔ نووارد جواب دیتا کہ وہ یقیناً جاسوس تھا، لیکن حکومت کا نہیں بلکہ میزبان کے محبوب کا جس نے اس کو یہ پتہ لگانے پر مامور کیا تھا کہ وہ جا کر یہ دیکھے کہ عاشق کا چال چلن کیسا تھا اور اس کے اردگرد لفنگے تو جمع نہیں رہتے۔ میزبان خفت اور سراسیمگی کی نظر سے جس میں مہمانوں کی طرف سے بدگمانی و بیزاری کی جھلک ہوتی، حاضرین کی طرف دیکھتے۔ حاضرین میں سے کوئی حاضر دماغ نووارد سے جرح کر بیٹھتا کہ بتاؤ محبوب کون ہے اور کہاں ہے جس نے تم کو تفتیش پر مامور کیا ہے۔ یہ سوال ایسا تھا جس کا جواب نہ میزبان دے سکتے تھے نہ مہمان نہ خود نووارد، لیکن جاسوس پھر جاسوس ہوتا ہے، کڑک کر جواب دیتا۔ یہ سوال بالکل غیر متعلق ہے، تم لوگ لفنگے ہو۔ حضرت کو عشق کراتے پھرتے ہو اور زیر بار کرتے ہو۔ میں اس کی طرف سے آیا ہوں جو خود حضرت پر دل و جان سے فریفتہ ہے، اور کئی

دن سے کھانا پینا ترک کیے ہوئے ہے اس کی ہمدردی میں، میں بھی فاقہ کرتا آیا ہوں۔ میں نے عاشق زار سے وعدہ کرلیا ہے کہ میں اس کا پیغام حضرت کی خدمت میں پہنچادوں گا، اور کھانا بھی ساتھ لاؤں گا۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ میزبان کے پہلو میں جگہ پاتا ہے، نصف کھانا اپنے ساتھ لے جاتا اور آئندہ اس کا نام حضرت کے ہاں مدعو ہونے والوں میں سب سے اونچا ہوتا۔

(نشریہ:20/جولائی 1949۔ مطبوعہ: نئی روشنی، دہلی 8/اگست 1949)

●●●

مہمان

مجھے مہمان بننے سے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی ایسے مرض میں مبتلا ہوں جس سے جاں بر ہونا محال ہے۔ اسی انجام کے پیشِ نظر میزبان، احباب اور اعزّا میری خاطر یا تیمارداری کرتے ہیں اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، بولنے چالنے میں وہی آداب ملحوظ رکھے جاتے ہیں جو کسی جاں بہ لب مریض کے لیے روا رکھے جاتے ہیں۔ کمرہ میں دبے پاؤں داخل ہوں گے اور میری کوئی فرمائش پوری کرنی ہوئی تو دبے پاؤں ہی کی ٹکریاں دکھاتے کمرہ سے باہر نکل جائیں گے۔ بات اس طور پر کریں گے کہ میری دل شکنی نہ ہو پائے یا

''ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے۔''[1]

میں جو کچھ کہوں گا اسے اس طور پر سنیں گے جیسے یا تو میں کوئی نعتیہ نظم سنا رہا ہوں جس میں چوں وچرا کی گنجائش نہیں یا کوئی ایسی وصیت کرر رہا ہوں جو پس ماندگان کے اخلاق و عادات سے زیادہ متعلق ہو، اپنے مال معیشت سے بالکل نہیں۔ خیال کریں گے چند دنوں کا مہمان ہے ہنس بول یا کاٹ کھا لینے دو۔ کھانا اس طور سے فراہم کریں گے اور کھلائیں گے، پلائیں گے اس طرح جیسے کھانا پینا مجھے تمام عمر نصیب نہیں رہا ہے یا پھر آخر وقت ہے پرہیز وغیرہ سب ہیچ، دل کے ارمان پورے کر لینے دو۔

---

1 سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

کہیں باہر لے جانا ہوگا، تو اس طور سے لے جائیں گے، جیسے مریض کو آپریشن تھیٹر یا مار پیٹ کی پہلی رپورٹ لکھانے کے لیے مضروب کو کسی دیہاتی تھانہ پر لیے جا رہے ہیں۔ رات کو رخصت اس طرح کریں گے کہ جیسے مجھ غریب کو کیا معلوم اور بتانے سے کیا حاصل:

''دم واپسیں برسر راہ ہے!''

سفر پر روانہ ہونے والا ہوتا ہوں تو میرے علاوہ گھر کا ہر شخص میرے لیے پروگرام بنانا شروع کر دیتا ہے۔ جس سے تنگ آکر میں تار بھیج دیتا ہوں کہ سفر سے معذور ہوں، لیکن سب سمجھتے ہیں کہ یہ ''مقامی ہلچل'' ہے۔ ''باضابطہ مانسون'' نہیں ہے اس لیے پروگرام جاری رکھتے ہیں۔ البتہ پہلے جو کچھ کھلم کھلا کرتے تھے اب روپوش ہو کر کریں گے یا اشاروں میں کریں گے یا ہمسایہ اور نوکروں میں بیٹھ کر کریں گے۔ میں بے بس ہو کر دوسرا تار پہلے کی تردید میں بھیجوں گا۔ تیسرے میں تاریخ بدلنے کی درخواست کروں گا چوتھے پر روانہ ہو جاؤں گا۔

منزل مقصود پر پہنچ کر خیریت کا تار گھر بھیجتا ہوں اور دوسرے تیسرے برابر بھیجتا رہتا ہوں اس لیے نہیں کہ میں خیریت سے ہوں بلکہ گھر والے خیریت سے ہیں۔ اسے آپ لطیفہ سمجھتے ہوں گے۔ نیک لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں، لیکن اس کا لاشعور یہ ہے۔ گھر والے مجھے اپنی خیریت سے کبھی نہیں مطلع کرتے ان کو اندیشہ رہتا ہے کہ خیریت کی اطلاع ہوگئی تو میں سفر سے فی الفور واپس آجاؤں گا۔ ایسی حالت میں اس کے سوا میں اور کر ہی کیا سکتا ہوں کہ اپنی خیریت کا تار بھیجتا رہوں اور گھر والوں کی خیریت سمجھتا رہوں۔

سفر پر روانہ ہونے سے جو میں بھاگتا ہوں اُس کے وجوہ کم سے کم مجھے مطمئن کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ پہلے ریل میں ایران، توران کی گفتگو ہوتی تھی، اب ہندوستان پاکستان کی ہونے لگی ہے۔ یہ موضوع گفتگو میرے نزدیک ایسا نہیں ہے جس کی خاطر قرض اور ناشتہ لے کر سفر کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ پہلے سیکنڈ کلاس میں سفر آرام سے ہو جاتا تھا، اب سیکنڈ نے انٹر کی جگہ لے لی ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ انٹر کو سیکنڈ کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ کرایہ انٹر کا اور ڈبہ سیکنڈ انٹر کا اور کرایہ سیکنڈ کا ''یعنی گویا کہ''، ''انٹر ہی انٹر'' یا ''سیکنڈ ہی سیکنڈ'' جیسا کہ چاندنی چوک دہلی کی ایک دوکان کا سائن بورڈ دعوت دیتا رہتا ہے ''چپل ہی چپل''!

اللہ تعالیٰ کے نیک بندے زادِ آخرت کے لیے اعمالِ حسنہ کا اتنا ذخیرہ نہیں فراہم کرتے یا کر پاتے جتنا اس خاکسار کے گھر والے خاکسار کے لیے سامانِ سفر فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اعمالِ حسنہ اور سامانِ سفر میں ایک نازک سا فرق یہ ہے کہ اعمالِ حسنہ جس آسانی سے فراہم ہو جاتے ہیں، اس آسانی سے سامانِ سفر سامانِ معیشت نہیں فراہم ہو پاتے۔ آپ روزے جیسے چاہیں رکھ لیں روزگار ممکن ہے تمام عمر نہ ملے۔ زکوٰۃ جتنی چاہے دیجیے بھیک ملنے کی توقع نہ رکھیے۔ اعمالِ حسنہ کا نقل و حمل فری ٹریڈ (آزاد تجارت) کے اصول پر ہوتا ہے جو چاہے جتنا چاہے جہاں چاہے لے جائے، اس لیے کہ دنیا میں ان کی ضرورت نہیں، آخرت میں ان کی کمی نہیں۔ سامانِ سفر یا سامانِ معیشت کے نقل و حمل کا اصول تھوڑا سا مختلف ہے یعنی جو چاہے جتنا چاہے جہاں چاہے رکھوا لے!

میرے لیے یہی کیا کم تکلیف دہ ہوتا ہے کہ سفر کرنا اور کسی کا مہمان بننا پڑے گا۔ اس سے قبل کے مراحل بھی کچھ کم تکلیف دہ نہیں ہوتے۔ بڑے لوگ پریس کانفرنس طلب کرتے ہیں اور جھوٹ سچ ملا کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ میرے لیے پریس کانفرنس خود بخود آن موجود ہوتی ہے شرکا کی تعداد، جنس، عمر، حق، حلیہ، نیت، کسی کی قید نہیں۔ یہی صورت اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب آپ شامتِ اعمال سے بیمار یا مصلحت آمرزگار[1] سے جاں بحق ہو جائیں۔ ہر شخص مرض نسخہ، غذا، معالج، گورکن تجویز کرنے پر آمادۂ فوج داری اور وقتِ وفات پر بازی لگانے پر آمادہ قبرستان جانے آنے کے دوران میں اس پر بحث کہ مریض مرض سے مرا یا معالج نے مار ڈالا۔ نتیجہ یہ نکالا جائے گا کہ مرحوم ان کی نصیحت یا مشورہ پر عمل کرتے تو موت واقع نہ ہوتی اور کیا تعجب مرحوم اپنے جنازہ میں شریک ہونے کے بجائے ان کے جنازہ میں شریک ہو سکتے!!

اس سفر کانفرنس کے لیے وقت اور موقع کی کوئی قید نہیں۔ خضرِ راہ کی زندگی کی مانند یہ:

"جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں"

رہتی ہے، میں کسی حال میں ہوں کہیں ہوں جو آ گیا اُس نے فہمائش یا فرمائش کی "مالوٹوف باسکٹ" مجھ پر پھینک دی۔ بعض مجرموں کو حکومتیں پکڑ نہیں پاتیں تو عام اجازت دے دیتی ہیں کہ ان کو جو شخص جہاں دیکھے جس حال میں پائے گولی مار دے۔ یہی حال میرا ہوتا ہے۔

---

1. آمرزگار: بخشنے والا، معاف کرنے والا، خدا۔

بعض سفر ایسے ہوتے ہیں جن میں سفر خرچ بھی ملنے والا ہوتا ہے، لیکن یہ ملتا اتنی دیر میں ہے کہ اس کی اُمید پر جو قرض لیا جاتا ہے وہ بالآخراُن قرضوں میں داخل حسنات ہو جاتا ہے جو فریقین قرض کی حیات میں ادا نہیں ہوتے۔ شاید اسی خیال سے اب یہ تجویز پیشِ نظر ہے کہ جہاں سفر کرنے والا اس امر کی تصدیق کرے کہ اس نے اسی درجہ میں سفر کیا ہے جس کا کرایہ طلب کر رہا ہے وہاں یہ بھی لکھ دے کہ اگر وہ سفر خرچ کے انتظار میں جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دے تو سفر خرچ کی رقم ورثا میں کس کے سپرد کی جائے!

اگر آفاتِ ارضی و سماوی سے بچ نکلے تو اکثر کچھ رقم بچ رہتی ہے، لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہے جب آفاتِ ارضی وسماوی کو دعوت بھی دوں اور ان سے بچ کر نکل بھی جاؤں۔ میرا خیال ہے کہ میں آخرت کا سفر اس طور سے کر سکوں گا کہ منزل پر پہنچنے کے بہت دیر بعد بھی بہت کم لوگوں کو خبر ہو، لیکن سفر خرچ والے سفر کی خبر معلوم نہیں کیسے تمام لوگوں کو جلد سے جلد ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے وہ لوگ آتے ہیں جنھوں نے قرض دے کر مجھ سے تعلقات بڑھائے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ سفر ہی کے موقع پر میں گھر والوں کے لیے کپڑے وغیرہ بنواتا ہوں اور ان پر زندگی کی سختیاں آسان کرتا ہوں۔ انعامات تقسیم کرتا ہوں۔ چھوٹے موٹے قرضے ادا کر دیتا ہوں۔ ظاہر ہے ان تمام مصارف کے لیے متوقع آمدنی سے کچھ زائد ہی قرض لینا پڑتا ہے۔ صرف اتنا ہی قرض لینا کہ پرانا قرض اتر جائے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جب تک اس خوشی، فخر اور فراغت کو لطف سے منا لینے کا موقع نہ ملے جو قرض کے اُتر جانے سے نصیب ہوتا ہے!

اس مبارک اور مقدس موقع پر جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا سب سے پہلے قرض خواہ تشریف لاتے ہیں۔ ظاہر ہے ملک الموت کسی کے ہاں برج کھیلنے نہیں آتے۔ میں ان کے کہے بغیر ان کی فرمائش بڑے لطف اور خوش دلی سے پوری کر دیتا ہوں۔ وہ خوش ہو جاتے ہیں اور بڑے خلوص سے سفری ذوق وشوق سے اسٹیشن تک رخصت کرنے کے لیے آتے ہیں۔ گاڑی چھوٹنے کا وقت قریب آتا ہے تو ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں، لیکن نہ ایسے کہ ٹھہر جائیں تو انگارہ اور بہہ جائیں تو دریا بن جائیں جس کے وجوہ کچھ ہی ہوں انجام ایک ہی ہوتا ہے۔ میں ان سے قرض میں ادا کی ہوئی رقم ہی واپس نہیں لے لیتا بلکہ جس کسی کا اور قرض بھی میرے اوپر ہوتا ہے

اس کے بارے میں یا اس کے قرض کے بارہ میں کچھ ایسی وصیت نما درخواست کرتا ہوں کہ وہ بھی میرے دوست کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ اقبال نے کتنے پتے کی بات کہی ہے:

''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی''

پھر وہ لوگ آئیں گے جن کے احباب یا اعزا اس دیار میں یا اس کے آس پاس رہتے بستے ہوں گے۔ کوئی جاڑے کا میلا بستر دے گا کہ دیتے آیئے گا اور برتنوں کی بوری وہاں سے لیتے آیئے گا۔ کوئی دو چار بچوں، بوڑھیوں اور بطخوں کا ایک ٹاپا ساتھ کر دے گا کہ فلاں کے ہاں پہنچا دیجیے گا۔ فلاں محلّہ میں فلاں گلی کے نکڑ پر جو مسجد ہے اس کے بازو پر سے بائیں یا دائیں کو جو گلی مڑتی ہے اُسے چھوڑ کر سودوسوگز ناک کی سیدھ میں چلے جایئے گا اور کسی سے پوچھ لیجیے گا کہ فلاں صاحب کہاں رہتے ہیں، بس ان کے حوالہ کر دیجیے گا۔ اگر وہ موجود نہ ملیں تو سامنے ہی ایک قلعی گر کی دوکان ہے وہاں بیٹھ جایئے گا۔ ایک صاحب اپنی اولاد کی داستان سنائیں گے، اور درخواست کریں گے کہ میں اُسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کروں اور اس کی تکمیل بھی بتادیں گے۔ یعنی یا تو میں اُسے کچھ روپے دیتا آؤں یا اپنے ہم راہ واپس لاؤں، کھانا اور خرچہ بھی میرے ذمہ!

گھر کے چھوٹے بڑے لائق نالائق بالغ نابالغ فرمائیں گے اور دوسرے اس طور پر سنیں گے کہ اگر میں نے ان کا کہنا نہ مانا تو سب کے سب میری منشا کے خلاف اپنی اپنی شادی کر ڈالیں گے کہ دیکھئے آپ جہاں جا رہے ہیں وہاں شرفا، بھنگی، دھوبی سبھی بستے ہوں گے۔ کمرہ میں جھاڑو نہ دینے لگیے گا۔ اپنے یا میزبان کے کپڑے نہ دھویئے گا گھاس کھودنے سے بھی باز رہیے گا۔ شیو روزانہ کیجیے گا۔ لباس بھی ہفتہ عشرہ بعد بدل ہی ڈالیے گا۔ ننگے پاؤں ننگے سر نہ پھریے گا۔ نوکروں کو روپے نہ بانٹنے لگیے گا ممتاز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش کیجیے گا۔ جو ملنے آئے اس سے تپاک سے ملیے گا اور جو نہ آئے اس سے بھی۔ دعوت ردّ نہ کیجیے گا ڈیوٹی سوسائٹی کا چندا نہ مانگنے لگیے گا۔ تقریر میں خواہ مخواہ علی گڑھ کے گن نہ گایئے گا۔ نہ کسی ادب کی فلاں دلیل سے تائید اور فلاں دلیل سے تردید کیجیے گا۔ اور فلاں فلاں دلیلوں سے نہ تائید کیجیے گا نہ تردید۔ گلابوں کی ٹوہ میں نہ رہیے گا۔ کمبل ہرگز نہ خریدیے گا۔ فلاں فلاں کھیل ہوتا ہو تو سینما ضرور جایئے گا اور کھیل ختم ہونے سے پہلے اُٹھ نہ جایئے گا۔ چینی کے برتنوں پر ہرگز نہ للچایئے گا۔ دل گرفتہ چینی والا شعر بھی نہ

پڑھیے گا۔ طالب علموں، مریضوں یا دونوں کے رشتہ داروں کو صلاح مشورہ دینے سے باز رہیے گا۔ گاڑی میں صرف انگریزی بولیے گا اور وہی بڑے یا پاپڑ پر اکتفا کیجیے گا نہ اردو کے شعر پڑھیے گا نہ عربی کی دعائیں۔ یہاں گھر پر نہ کوئی مرض الموت میں مبتلا ہوگا نہ کسی کے نام لاٹری نکلے گی۔ جب تک آپ واپس نہ آجائیں گے نہ ہم کسی کو مار ڈالیں گے نہ ہم کو کوئی مار ڈالے گا۔ یہاں نہ آپ کی کرسی پر کوئی بیٹھے گا، نہ آپ کے کھٹولے میں اڑے گا۔ آپ کی رذیوں کو کوئی ہاتھ نہ لگائے گا۔ ہم نہ دن میں دو خط بھیجیں گے نہ روزانہ ایک تار مختصر قصہ غم یہ ہے جلد واپس نہ تشریف لائیے گا!

میرے ہاں فقیر کی دعا ہے کہ ٹھکانے کی کوئی چیز خاندان کے کسی فرد کے پاس موجود نہ ہو فقیر اور دعا ہی کیا دے سکتا ہے۔ کسی کے ہاں کوئی چیز برائے نام ٹھکانے کی مل جائے گی ٹھکانے اور بے ٹھکانے کی چیزوں میں ایک گڑبڑ یہ ہوتی ہے کہ بے ٹھکانے کی چیز ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ کباڑیے کے ہاں سے خریدی ہے اور ٹھکانے کی رکھیے تو فرماتے ہیں چرائی ہے! ایک دفعہ چوری ہوگئی تو مال مسروقہ کی فہرست دینے میں لوگ مانع آئے، فرماتے تھے اس کا کیا جواب دو گے کہ یہ چیزیں تم کو نصیب کیسے ہوئیں! تو میرے ہاں اگر کسی کے پاس اچھا تکیہ ہے تو دوسرے کے پاس ثابت چادر ہوگی۔ ایک کا لحاف ٹھکانے کا ہے تو دوسرے کی مچھر دانی سالم ہے۔ ایک کا بکس قابلِ اعتنا ہے تو دوسرے کا قفل قابلِ اعتبار۔ چنانچہ جب میں سفر پر روانہ ہونے والا ہوتا ہوں تو گھر میں اسٹیٹ آف ایمرجنسی کا اعلان کر دیا جاتا ہے یعنی حکومت کو خطرہ کا سامنا ہے۔ جس کے معنی بعض شریر لوگ یہ سمجھاتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے ہر ایک کو خطرہ ہے۔ میں نے اسٹیٹ آف ایمرجنسی کا مفہوم اردو میں اس لیے بتا دیا ہے کہ ایک صاحب کو کچھ دن ہوئے اردو کا ایک اخبار لیے ہوئے آئے، اور دریافت کرنے لگے۔

''کیوں بھئی ذرا یہ تو بتانا اب تک تو حیدرآباد، کشمیر، بڑودہ، رام پور وغیرہ کی ریاستیں اسٹیٹ ہوتی تھیں۔ یہ اسٹیٹ آف ایمرجنسی کدھر سے نکل آئی؟''

میں نے کہا۔

''غور کروں گا، مجھے تو یہ ترقی پسندوں کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے ہمارے ہاں کے 'امرِ ربی' کے توڑ پر 'ایمرجنسی' کر لیا ہو۔''

اب یہ ہوگا کہ جس کے پاس جو چیز ہوگی وہ میرے حق میں نیشنلائز کردی جائے گی گھر کا اثاثہ اتنا اور ایسا ہی ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی عازم سفر کے لیے نیشنلائزیشن کا عمل درآمد ہوسکتا ہے۔ اگر ایک سفر پر ہو اور دوسرے کو بھی یہ مصیبت پیش آجائے یا اتفاق سے کوئی معزز مہمان رہزن کو دعائیں دیتے نازل ہوجائیں تو پھر ہمسایہ اور دوستوں کی مملوکات کو نیشنلائز کرنے کی فکر کی جاتی ہے۔ میرے نزدیک ساکھ کا مدار اس پر نہیں ہے کہ قبضہ میں مالی معیشت کیا ہے۔ اس کا تمام تر مدار اس پر ہے کہ آپ کے لیے کتنے اور کیسے لوگ اپنی آبرو جان و مال نیشنلائز کردیں گے۔ ساکھ ٹوٹنے سے نہیں آتی لٹانے سے آتی ہے۔ خدا کرے یہ بات آپ کی سمجھ میں آجائے، لیکن اس کی ضرورت نہ پیش آئے۔

مانگے کا سامان لے کر سفر کرنے میں آپ پر ایک عجیب کرامت کا انکشاف ہوگا، مثلاً آپ کا سامان ایک قلی لیے جارہا ہے اور آپ دوسرے قلی کے پیچھے چلے جارہے ہیں یا ڈبے میں سے آپ کا سامان کوئی اُٹھا لے جائے تو آپ کو خبر نہ ہو اور آپ کسی دوسرے کا اُٹھالیں تو پٹ جائیں، لیکن اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں خدا کے نزدیک آپ بالکل گنہ گار نہ ہوں گے۔ آپ نے مولویوں کی شاید وہ مثل سنی ہوگی کہ جب اللہ کا گناہ نہیں کیا تو اس کے بندے سے کیا ڈرنا۔ یعنی گویا کہ "مسجد کی چٹائی نہیں چرائی تو موذن کی بیوی سے آشنائی کرنے میں کیا مضائقہ!

کچھ دنوں کی بات ہے خدا نے بغیر یہ پوچھے ہوئے "بتا تیری رضا کیا ہے؟" مجھے ایک سفر پر روانہ کردیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سفر پر روانہ ہوتے تھے تو منزلِ مقصود پر پہنچ بھی جاتے تھے۔ میں پہنچا اور مہمان بن گیا۔ میرے بارے میں ایک عجیب افواہ پھیل گئی ہے کہ مجھے دیکھ کر لوگوں کو ہنسی آنے لگتی ہے، لیکن جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ ایسا نہیں ہے تو چاہتے ہیں کہ میں انھیں دیکھ کر ہنسنے لگوں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا تو خود ہنسنے "لگ" جاتے ہیں۔ یہ موقع میرے لیے بڑا مشکل اور گومگو کا ہوتا ہے میں نے ہنسی کی باتیں لکھی ہیں، لیکن لکھتے وقت میرے سامنے کوئی اور نہیں ہوتا تھا صرف میں ہوتا تھا اس لیے مجھ سے یہ توقع رکھنا میرے ساتھ انصاف نہ ہوگا کہ میری باتوں سے آپ کو ہنسی ضرور آئے۔ یا میں آپ کو ہنسانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگوں یا میری ہر بات پر آپ کو ہنسی آئے۔ میری باتوں سے اگر زیادہ لوگوں کو ہنسی آئے تو یہ میری خوش قسمتی ہوسکتی ہے۔ مجھ پر

اس کی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔فن کار اپنے مخاطب سے ہمدردی رکھ سکتا ہے۔مخاطب کی خوشی ناخوشی کا پابند نہیں ہوتا۔ایسا نہ ہوتو دنیا میں پیغمبروں کی ضرورت باقی نہ رہے یعنی عہد کا سب سے بڑا انقلابی ظہور میں نہ آئے۔شاید اسی لیے اصولاً یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ پیغمبر ہمیشہ خدا کا بھیجا ہوا ہوتا ہے اور اس کی تعلیم خدا کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔وہ ظہور انسانوں ہی میں پاتا ہے۔ انسانوں ہی میں سے ہوتا ہے اور انسانوں ہی کے لیے ہوتا ہے، لیکن وہ ان کے طور طریقوں، روایات خوشی ناخوشی کسی کا پابند نہیں ہوتا۔فن کار کا بھی یہی حال ہے وہ ماسکو کو سلام نہ کرے گا۔ ماسکو اس کے سلام کو خود آئے گا۔وہ ماسکو بن سکتا ہے زائیدہ ماسکو نہیں ہوتا۔

میری اس قسم کی باتوں سے ترقی پسند ادب کے احباب مجھ پر ترس کھاتے رہتے ہیں ان میں سے بہتوں کی قابلیت، بے جگری اور بے لوثی کا قائل ہوں بعضوں کو تو میں قریب قریب اتنا ہی عزیز رکھتا ہوں جتنا اپنے ہونہار شاگرد، لائق اولاد اور جان چھڑکنے والے بھائی کو عزیز رکھتا ہوں اور اس پر یقین رکھتا ہوں کہ ترقی پسندوں میں کچھ لوگ ضرور ایسے ہیں جو میرے اس طرح کے عقائد کے باوجود مجھے گردن زدنی نہیں سمجھتے۔لیکن میں بھی کیا کروں۔میں شعر و ادب کو فنونِ شریفہ میں سے سمجھتا ہوں۔ان کو کسی ادنیٰ مقصد یا ذاتی اُلجھنوں کا پابند نہیں کرسکتا۔فن خود اپنا جواز ہے۔اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ فن نہیں ہے کچھ اور ہے۔شعر و ادب میں، میں اشتراکیت کی تبلیغ کو وہ درجہ نہیں دے سکتا جو میرے دوست مجھ سے چاہتے ہیں۔میں اشتراکیت کی اہمیت کا کبھی منکر نہیں ہوا،لیکن میں اسے سمجھتا سیاسی تحریک یا معاشی بحران ہی ہوں۔

میں آپ کے کہنے سے نہ ہنس سکتا ہوں نہ ہنسا سکتا ہوں۔اس طرح کے کام ہندوستان کی فلم کمپنیاں یا رؤسا کے مصاحب کرتے ہیں۔میں اسی وقت ہنس سکتا ہوں یا ہنسا سکتا ہوں جب میرا دل چاہے گا۔ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے پھیر میں نہ پڑنا چاہیے۔یہ طرح کے مصرعے ہیں جن پر کافی طبع آزمائی ہو چکی۔ادب ادیب کا اور ادیب کا ادب جواب وہ ہوتا ہے کسی اور کا نہیں، زندگی کا بھی نہیں۔شاعر اور ادیب یا شخص زندگی کو تازگی اور توانائی بخشتا ہے۔ زندگی تو زندگی کے سوا کچھ بھی نہیں آدمی یا شخص سب کچھ ہے وہ نہ ہو تو ساری کائنات محض ایک لفظ ہے۔بے معنی و بے آواز۔ایک بے محل سا شعر بھی سن لیجیے:

نمی گویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من
بہار از یار و گل از یار و باغ از یار و یار از من [1]

مہمان ہی کے فرائض ادا کرنے کے سلسلہ میں میزبان کے اصرار پر مجھے ایک بار زنخوں کا ناچ دیکھنا پڑا۔ اسے آپ تقاضائے فطرت بتائیں یا فن یا عبادت۔ مردوں کا ناچنا مجھے کسی طرح نہیں بھاتا مجھے تعجب نہ ہوگا اور آپ کو ہمدردی بھی نہ ہوگی اگر اس بدعقیدگی کی سزا دینے کے لیے تمام دنیا کے دیوانے یا فرزانے مجھ پر ٹوٹ پڑیں اور میری بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلا دیں۔ میں زنخوں کو دیکھ کر یوں ہی کیا کم خرسند ہوتا ہوں کہ ان کا ناچ دیکھنے پر مجبور کیا جاؤں۔ میں جب کبھی مہمان بنتا ہوں تو میزبان کی بدنصیبی کا خیال کر کے اپنی پسند یا ناپسند کو میزبان کی پسند یا ناپسند پر ترجیح دیتا ہوں۔ یہاں تک کہ کھانے کی میز پر وہ زبردستی میری پلیٹ میں اپنی پسند کی کوئی چیز ڈال دیتا ہے تو میں اسے زدوکوب بھی نہیں کرتا۔ وہ اپنے تصنیف کیے ہوئے اشعار سناتا ہے تو خون کا گھونٹ پی کر بن بھی لیتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ میزبان بننے سے زیادہ مہمان بننے میں ظرف اور لیاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔

میری میزبان بڑے خلوص و خوبیوں کی ایک عزیز و محترم خاتون تھیں۔ عورتوں کے بارے میں میرے جو بعض ناقابلِ رشک خیالات بخطِ مستقیم واقع ہیں موصوفہ کا لحاظ کر کے ان میں جہاں تہاں سے گولائی دے دیا کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ ان کے اصرار پر مجھے پردہ نشیں خواتین کی محفل میں پردہ کے پیچھے بیٹھ کر میلاد بھی پڑھنی پڑی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس دن تک اپنی دانست میں، میں نے اپنی سنجیدگی، قابلیت اور شخصیت کا جتنا سرمایہ ایمان داری یا بے ایمانی سے جمع کیا تھا وہ سب خواتین کی نظروں سے گر گیا۔ میری نظروں سے بھی۔ اس کے بعد سے میں جب کسی اجنبی خاتون سے ملتا ہوں تو سب سے پہلے یہ پتہ لگانے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ اس محفل میں موجود تھیں یا نہیں اور نہیں تھیں تو کہیں اب تو میلاد پڑھنے کی فرمائش نہ کر بیٹھیں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی شخص کے لیے یہ کوئی قابلِ فخر بات نہیں ہے کہ اسے دیکھ کر خواتین میلاد پڑھنے کی فرمائش کرنے لگیں! افسوس ہے کہ میرا دغدغہ کبھی دور نہیں ہوا۔ اس میں خواتین کا اتنا قصور نہیں ہے جتنا میرا

---

1. ترجمہ: میں یہ تو نہیں کہتا کہ اس گلشن میں پھول، باغ اور بہار، سب کچھ میری وجہ سے ہے۔ (البتہ یہ ضرور کہتا ہوں کہ) بہار ہو یا پھول ہو یا باغ ہو یا خود یار ہو، یہ سب میرے یار (محبوب) ہی کی وجہ سے ہیں۔

اس لیے کہ خواتین کی فرمائش کے بارے میں کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کب وہ کون سی فرمائش نہ کر بیٹھیں گی اور میرے دل میں یہ بات بیٹھ ہی گئی ہے کہ وہ مجھ سے میلاد خوانی ہی کی فرمائش کریں گی۔ یہی سبب ہے کہ خواتین سے میرے تعلقات کا نقطہ خط کے راستہ پر گامزن نہیں ہو پاتا۔

زنخوں کا ناچ دیکھنے نہ دیکھنے پر دیر تک بحث ہوتی رہی اور ظاہر ہے خواتین سے دیر تک بحث کیجیے تو خواتین ہی جیتتی ہیں۔ میں کہتا تھا:

''کیا آپ نے اپنے تمام مہمانوں کے لیے لازمی قرار دے رکھا ہے کہ وہ زنخوں کا ناچ دیکھیں یا مجھ ہی میں کوئی ایسی بات دیکھ پائی ہے کہ جب تک میں زنخوں کے ناچ میں شرکت نہ کروں آپ نہ چین لیں گی نہ دیں گی آخر آپ زنخوں کا ناچ دیکھنے پر کیوں مجبور کرتی ہیں۔ آپ مجھے تگنی کا ناچ بھی تو نچا سکتی ہیں۔ وہ کیوں نہیں؟''

فرمایا: ''بحث کرنے سے کیا حاصل، تگنی کا ناچ نچانے کے لیے مجھے آپ سے بہتر لوگ پہلے سے میسّر ہیں۔ آپ کو تو زنخوں کا ناچ دیکھنا پڑے گا یہ آپ کے کام آئے گا۔''

میں نے کہا: ''واللہ جناب آپ تو غضب کرتی ہیں۔'' یعنی گویا کہ 'بقول' گل بکاؤلی':

''جو ناچ نچاؤ ناچتی ہوں!''

فرمایا: ''اور کیا۔ اب آپ کے عقل بھی آچلی ہے اور موڈ بھی ہے بس دیر نہ کیجیے چلیے چلیے۔''

میں نے کہا: ''خیر بہتر ہے چلوائیے!''

محفل میں پہنچا تو زنخوں نے ہمارا کچھ ایسا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور ایسی لے یا دُھن میں کہ میرے پاؤں اُکھڑ گئے مجھے اپنے ایک دوست کا واقعہ نہ یاد آ گیا ہوتا تو زنخوں نے مجھے مار ہی گرایا تھا۔ وہ واقعہ یوں ہے کہ ایک موقع پر اپنے دوست کے اعزاز میں ''گارڈ آف آنر'' دیا گیا۔ افسر نے ڈیٹ کر دستے کو آواز دی تو یہ چونک پڑے اور ''آئی بگ یور پارڈن!'' (حقت معاف فرمائیے گا!) کہہ کر ایک طرف ہو گئے۔ افسر نے دوسری بار للکارا تو غلطی محسوس ہوئی جواب دیا ''فرینڈس'' اس کے بعد ''مڑ کر بھی نہ دیکھا ترے دیوانے نے!''

زنخے تھرکتے مٹکتے گاتے تالیاں بجاتے اور بھاؤ بتاتے رہے۔ میں بھی۔

''بیضار ہا اگر چہ اشارے ہوا کیے''

عورتیں ناچتی گاتی ہیں تو دل میں کچھ ایسے جذبات اُبھرتے ہیں جن کا تعلق خدا سے ورنہ عورتوں سے یا پھر ترقی پسندوں سے ہوتا یا ہو سکتا ہے۔ مرد گاتے بجاتے ہوں تو دل کو سمجھا سکتے ہیں کہ خدا کی عبادت کر رہے ہیں یا کسی انسان کو پکڑ پایا ہے اسے بھون کر کھانے والے ہیں زنخوں کا ناچ دیکھ کر تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیجیے اور کہاں جائیے۔

اسی اثنا میں خدا کا کرنا اور اس خاکسار کا بھرنا کچھ ایسا ہوا کہ خاکسار کی نظر ایک عورت پر جا پڑی جو اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو سنبھالے سمیٹے ایک سمت بیٹھی ہوئی تھی۔ زنخوں کا ناچ دیکھ کر بچے خوش ہو رہے تھے، کچھ سہمے ہوئے تھے اور کچھ

''محو حیرت تھے کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی''

اس عورت کی آنکھیں مجھے غیر معمولی نظر آئیں۔ میں نے اتنی خوب صورت، پاکیزہ، نتھری اور نکھری آنکھیں کبھی پہلے نہ دیکھی تھیں۔ بے اختیار فارسی کا یہ شعر زبان پر آ گیا۔

می گزشتم زغم آسودہ کہ ناگہ زکمیں
عالم آشوب نگاہے سر را ہم بگرفت [1]

تھوڑی دیر کے لیے میں ان آنکھوں کی براہِ راست گرفت سے چھوٹ کر اس شعر کی گرفت میں بے دست و پا ہو گیا۔ یہ شاعری بھی کیا بلائے بد ہے کہ ہم کو کہیں اور نہیں رہنے دیتا نہ موضوع کے اعتبار سے نہ فارم کے اعتبار سے نہ موقع محل کے اعتبار سے نہ ٹکنک اور تاثرات کے اعتبار سے نہ تصور اور تصویر کے اعتبار سے اور نہ کسی اور اعتبار سے جہاں جائیے جہاں پہنچیے معلوم ہو گا یہ بہت پہلے سے پہنچے ہوئے ہیں۔ انسان کے سامنے نہ سقراط کی پیش جاتی ہے نہ سکندر کی نہ کولمبس کی نہ کومن ٹانگ کی اور ''نہ ہی'' اوٹ پٹانگ یا ورنگ اوٹانگ کی!

مجھے خوب صورت آنکھیں دیکھنے کی نہ تمنا تھی نہ خوب صورت آنکھوں کو اپنانے کا کوئی ایسا ولولہ تھا کہ لوگوں کے چھرا بھونکتا پھرتا۔ پھر اس آفت کے نازل ہونے کا سبب کیا تھا؟ عاشقی اور

---

1 میں اپنے غم سے آسودگی کی حالت میں گزر گیا تھا کہ کمیں گاہ سے کسی عالم آشوب نگاہ نے مجھے راستے میں اپنی گرفت میں لے لیا۔

خودکشی دونوں ناممکن ہو جاتی ہیں اگر ان پر غور فرمانا شروع کر دیا جائے اور یہی انجام میرا ہوا۔ میں نے زخموں کی طرف سے توجہ ہٹا کر اپنے دل و دماغ کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ گدھے نے کھیت کھانا شروع کر دیا تھا۔ یہ فقرہ ذرا ترقی پسندانہ ہو گیا، لیکن کیا کروں میں اس کے لاشعور سے مجبور ہو گیا۔ جہاں ایک نامعلوم شاعر جگالی کر رہا تھا۔ یعنی:

تیرے آہوئے چشم نے اے شوخ

میری کشتِ حیات چر ڈالی

میں نے فی الفور اپنے میزبان سے رجوع کیا اور پوچھا "وہ عورت کون تھی؟"

انھوں نے کہا کہ "وہ محلہ ہی میں رہتی ہے دوسرے تیسرے ملنے آ جایا کرتی ہے۔ شوہر کارخانے میں ملازم ہے۔ میاں بیوی تنگی ترشی سے بسر کرتے ہیں۔"

اس کے بعد ہی وہ کسی اور سے گفتگو کرنے لگیں۔ میرا جوشِ عشق دھیما پڑنے لگا۔ میں نے کہا، "ہو نہ ہو میں ہی حماقت میں مبتلا ہوں۔ ایسی آنکھوں والی کی تفصیل اس نثر معرا میں!"

کچھ دیر بعد میں نے تھوڑے سے پینترے سے پوچھا یا یوں کہیے پوچھ ہی بیٹھا کہ "اس کی آنکھیں کیسی ہیں؟"

انھوں نے گھبرا کر عورت کی طرف دیکھا اور فوراً ہی مطمئن ہو کر جواب دیا، "ٹھیک تو ہیں۔"

میں نے اُکتا کر پوچھا: "ٹھیک سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

بولیں: "یہی کہ مصنوعی نہیں ہیں!"

میں نے گھٹے ہوئے ڈپلومیٹ کے انداز سے آس پاس کے لوگوں سے یہی سوال کیا۔ کسی شخص نے کوئی ایسی بات نہ کہی جس سے مجھے اطمینان ہوتا کہ میرا عشق آتشِ نمرود میں بے دھڑک کود سکے گا۔ عقل سے رجوع کیا تو اسے محوِ تماشائے لبِ بام تک نہ پایا۔ عقل ہی جو ٹھہری اسے یہ اندیشہ رہا ہوگا کہ بالائے بام ہونا کبھی خطرہ سے خالی نہیں۔ ممکن ہے کوئی دوپہر میں ننگے پاؤں کوٹھے پر چڑھے اور اسے دھکیل دے!

میں نے ان آنکھوں کی طرف ایک دفعہ پھر دیکھا۔ یہ یقین کرنے کے لیے کہ کہیں مجھے دھوکا تو نہیں ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کہیں بھی اپنی بے نوری پر نہیں رو رہی تھیں۔ ان میں وہ تمام باتیں تھیں جو مجھے بڑے سے بڑے جرم یا بڑی سے بڑی قربانی پر مائل کرسکتی تھیں۔ میرا کچھ اس طرح کا عقیدہ ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا انسانی یا انفرادی زندگی کے بے پناہ و بے پایاں، ہماری سمجھ سے باہر اور ہماری خوشی ناخوشی سے بالکل بے پروا، پروگرام کی کسی نہ کسی خاص مد کو پورا کرنے کے لیے آتا ہے اور چلا جاتا ہے جسے اس کے علاوہ اس دنیا میں نہ پہلے کوئی پورا کرسکا نہ اس کے بعد کوئی اور پورا کر سکے گا۔ یا بالکل ممکن ہے کہ اس رہرو راہ مشیت کو بالکل معلوم نہ ہو سکے کہ اس سے کیا کام لیا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عام طور پر ہم کسی شخص کے کارنامہ کے بارے میں جو رائے رکھتے ہوں اس کا کوئی تعلق اس خاص فریضہ سے نہ ہو جو غیب سے اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ بہ ایں ہمہ میں جبر محض کا قائل نہیں ہوں۔ جبر محض کا وہ شخص کیسے قائل ہوسکتا ہے جو اعلیٰ انسانی قدروں پر ایمان رکھتا ہو اور ان کا فریفتہ ہو جو اپنی بساط بھر اپنی استعداد اور اپنے وسائل کو کام میں لا سکنے کی خوشی اور توانائی محسوس کرتا ہو۔ فتح و شکست کا مدار تو صرف دلِ ناتواں کے خوب مقابلہ کرنے پر ہے۔ ممکن ہے میرا یہ عقیدہ بعضوں کے نزدیک فلسفیانہ یا متصوفانہ الکل پچو سے زیادہ وقعت نہ رکھتا ہو، لیکن میں خود اپنے اس عقیدے کو اتنا فلسفہ یا تصوف نہیں سمجھتا جتنا ریاضیات کا ایک سیدھا سا مسئلہ۔

اس تمام بقراطیت کا خلاصہ یہ ہے کہ میرے دل میں یہ بات اُتر گئی کہ ان آنکھوں سے متعلق جتنے از غیبی جھگڑے مقدر میں ہوں گے میں انھیں میں مرکھپ جانے کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔ اس لیے مجھے کفن باندھ اور حق بخشوا لینا چاہیے، لیکن میں دہشت پسند ذرا یوں ہی سا واقع ہوا ہوں۔ میں نے رائے عامہ کے سامنے سر جھکا دیا اور عشق سے باز آ گیا باوجود اس کے کہ رائے عامہ زنخوں کی محفل میں لی گئی تھی!

(1۔ ماہِ نو، خاص نمبر۔ کراچی 1949، 2۔ انتخاب 'ماہِ نو' 1952-1948 کراچی)

●●●

وہ خط جو پوسٹ نہیں کیا گیا

شاگرد کا خط استاد کے نام

تعزیت کے خطوط کا جواب فرداً فرداً نہیں دیا جا سکتا اس لیے یہ خط
سارے استادوں کے نام ہے۔

میں اس وقت اپنے آپ کو اس پر مامور پاتا ہوں کہ مجھے اپنے استاد سے جو شکایت پیدا ہوئی ہو اس کو ایک ایسے خط یا مضمون میں بیان کروں جو لکھا تو گیا ہو، لیکن بھیجا نہ گیا ہو!

استاد سے مراد وہ بزرگ ہیں جنھوں نے مجھے لکھنے پڑھنے سے آشنا کرایا اور وہ بھی ہو سکتے ہیں جو مجھ سے آپ سے زیادہ من چلوں کو کشتی، گانا بجانا، ناچنا، جیب کترنا، بلوے کرانا اور طرح طرح کی دہائی دیتے پھرنا سکھاتے ہوں۔ اس وقت صرف ان کا حال سنیے جنھوں نے مجھے لکھنا پڑھنا سکھایا۔ دوسروں کے بارے میں کسی اور سے کہیں اور سن لیجیے گا یا پڑھ لیجیے گا یا پھر ان میں سے بعض کے کرتب دکھاتے یاد یکھتے ہوئے خود کہیں گرفتار کر لیے جانے پر اکتفا کیجیے گا۔ تجربہ سب سے بڑا معلم کہلاتا ہے۔

وہ بزرگ جنھوں نے مجھ کو لکھنا پڑھنا سکھایا ان کی بھی بہت سی اقسام ہیں مثلاً وہ صاحب جو مجھے برابر رٹاتے اور ہر وقت پیٹا کرتے تھے اور تھک جاتے تو ایسی بدعائیں دیتے کہ

ان میں ایک بھی قبول ہو جاتی تو آج میں ایسا لیڈر ہوتا جس سے لوگ دلوں میں پناہ مانگتے اور مائیکر وفون پروڈٹ ۔اس رٹائی اور پٹائی سے میرا حلیہ سنور گیا اور ذہن مسخ ہو گیا یا جنھوں نے مجھے دھمکا کر یا چائے پلا کر میری عاقبت اور اپنی دنیا سنواری، ان میں سے کسی ایک کو چھوڑ دینا یا کسی ایک کے پیچھے پڑ جانا ان کے ساتھ بے انصافی ہو یا نہ ہو آپ کے ساتھ صریحی بے انصافی ہوگی اس لیے میں مناسب یہ سمجھتا ہوں کہ ان سب کے بارے میں مجھے جو کہنا ہے جستہ جستہ اُسے آپ پر ظاہر کر دوں۔ نیکی کر کے دریا میں ڈالنا مشہور ہے جس طرح خط لکھ کر پوسٹ نہ کرنا اور ریڈیو پر اُسے نشر کر دینا آج کل کا دستور ہے۔

میں نے مکتب میں بھی پڑھا ہے اور دیہاتی اسکول میں بھی کالج اور یونیورسٹی میں بھی مکتب میں مولوی صاحب پڑھانا نہیں چاہتے تھے مارنا اور رٹانا جانتے تھے۔ وہ اپنے کسی شاگرد سے کبھی خوش نہ ہوئے۔ اُن کے گھر سے جب کبھی خط آتا تو ہم سب لرز جاتے تھے۔ ہم کو یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ خط کا مضمون کیا تھا، لیکن مشہور یہ تھا کہ مولوی صاحب جو سلوک ہمارے ساتھ مکتب میں کرتے تھے وہی سلوک مولوی صاحب کی محترمہ گھر پر موصوف کے ساتھ کرتیں۔ خط میں کچھ اسی قسم کا اشارہ ہوتا تھا کہ خط کی خبر پا کر، لیکن مار کھانے سے قبل سارا مکتب مولوی صاحب سمیت بقول حسرت:

اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی

کا مصداق بن جاتا۔ چنانچہ ہم سب اپنے اپنے گھروں سے کچھ نہ کچھ چرا چھپا کر لاتے اور مولوی صاحب کو ان کی بیوی سے سرفراز ہونے سے بچا لیتے۔

دیہاتی اسکول میں، میں نے ایک شوالہ میں تعلیم پائی ہے جہاں ایک پنڈت جی دن بھر ساری کلاس کے سامنے اشلوک پڑھا کرتے تھے اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے پوجا پاٹ کے لیے مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے۔ اسکول ختم ہونے پر اور کبھی کبھی دورانِ اسکول میں پرشاد یعنی تبرک تقسیم کرتے۔ ہم سب قطار باندھ کر کھڑے ہو جاتے۔ اُن کی ایک مٹھی میں تبرک ہوتا جس میں سے ایک ایک چٹکی وہ ہر لڑکے کو بلا تخصیص مذہب و ملت دیتے تبرک میں کبھی بتاسے کا چورا ہوتا اور کبھی صرف راکھ۔

پنڈت جی کے ہاں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ البتہ جو زیادہ مقرب ہو جاتا وہ پرساد میں بتاسے کا پورا پاتا اور جس کا درجہ کم ہوتا وہ صرف راکھ پاتا۔ پنڈت جی کو اردو بالکل نہیں اور ہندوستانی بہت کچھ آتی تھی۔ ایک جملہ میں کمرہ کا لفظ آیا تھا، میں نے پوچھا۔ ''پنڈت جی کمرہ کسے کہتے ہیں؟''

فرمایا اور اس طور پر گویا مجھے بتاسے سے راکھ پر معزول کر دیا تھا،

''ارے مورکھ، یہی کمل، کمرہ ہے''

اور یہ بات ٹھیک تھی پورب کے دیہاتوں میں کمل کو کمرہ ہی کہتے ہیں۔

انگریزی اسکول میں مجھے جن ماسٹروں نے پہچانا ان میں بھی ایک پنڈت ہی تھے اور دوسرے ہیڈ مولوی صاحب۔ پنڈت جی سے مجھے یہ شکایت تھی کہ وہ میری ریاضی دانی پر ایمان نہ لاتے تھے اور ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ جب تک تم شین قاف نہ چھوڑ دو گے ریاضی کیا تم کو دس تک پہاڑا بھی ٹھکانے سے نہ آئے گا۔ مجھے اس پر غصہ آتا تھا کہ شین قاف کو ریاضی سے کیا سروکار۔ میں نے پنڈت جی کو یہ بتانے کی ہزار کوشش کی کہ جب کبھی خرگوش اور شکاری کتے کی دوڑ ہوگی خرگوش کتنا ہی پہلے کیوں نہ بھاگنے لگا ہو وہ پکڑا ضرور جائے گا اور جب کبھی کوئی کیڑا استون پر چڑھے گا اور پھسلے گا بالآخر وہ ستون کے سرے پر پہنچ کر پھسلنے سے باز آجائے گا۔ پنڈت جی کہتے تھے ''یہ تو زمانہ کا پھیر ہے، ریاضی کو اس سے کیا سروکار۔'' بہرحال پنڈت جی اور مجھ میں یہ اُلٹ پھیر مدت العمر رہی!

ہیڈ مولوی صاحب فارسی پڑھاتے تھے۔ ان سے مجھ کو یہ گلہ تھا کہ گھنٹہ بجا اور وہ پڑھاتے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئے۔ گھنٹہ ختم ہوا اور پڑھاتے ہوئے کمرہ سے نکل گئے بعضوں کا خیال تھا کہ مولوی صاحب کوئی عمل پڑھتے تھے اور جنات کو قابو میں لانا چاہتے تھے، عمل میں کچھ ایسی نیچ اونچ ہوئی کہ مولوی صاحب خود جنات کے قبضہ میں چلے گئے۔ اب جب کہ میں خود اپنے آپ میں جناتی آثار محسوس کرنے لگا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ مولوی صاحب کی عربی، فارسی کی قابلیت بے نظیر تھی۔ ان میں مجھے صرف ایک نقص نظر آتا تھا یعنی وہ پڑھاتے تھے بہت باوضو ہوکر۔ وہ پیچیدہ یا گہری بات گرامر سے واضح کرتے تھے، اور اس سے کبھی باز آتے تھے تو ان کا

پڑھانا، بتانا وعظ کی نوعیت اختیار کر لیتا۔ گرامر کبھی میری سمجھ میں نہ آئی اور وعظ سننے کا میں کبھی سزاوار نہ تھا۔

اسکول میں میرا سابقہ ایک ڈرائنگ ماسٹر سے تھا جو غلطی کبھی بخشتے نہ تھے۔ وہ اپنے سامنے ڈرائنگ بنواتے تھے اور ہاتھ بھر لمبی پنسل ساتھ رکھتے تھے۔ جہاں میری انگلیوں نے دغا دی ان کی انگلیوں نے لمبی پنسل رسید کی۔ ایسی صورت میں مضروب انگلیوں سے جو شکل بنتی تھی وہ یقیناً وہ نہ ہوتی تھی جس کی شکل مدِ نظر تھی، لیکن میرے دردناک اور ماسٹر صاحب کے غصہ ناک چہروں کی کولیشن منسٹری ضرور بن جاتی۔ مجھے شکایت تھی کہ وہ میری انگلیوں کے بجائے میرے ہاتھ پاؤں کو اپنی پنسل کی توجہ کا مرکز کیوں نہیں بناتے وہ کہتے کہ جس عضو کا قصور ہو اسی کو سزا دینی چاہیے۔ میں خاموش ہو جاتا اس لیے کہ اس طرح کی سزا اگر واضعانِ قانون کو معلوم ہو جاتی تو پھر انسدادِ جرم ہی نہیں استیصال جرم بھی ہو جاتا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس پر ہم میں سے شاید ہی کوئی اب بھی راضی ہو!

کالج پہنچا تو یہاں بھی طرح طرح کے مولوی اور پنڈتوں سے سابقہ ہوا۔ ان میں اکثر ایسے تھے جن کو استاد تو کہہ سکتے تھے معلّم کبھی نہ کہہ سکتے تھے میں، پروفیسر اور ماسٹر میں فرق سمجھتا ہوں۔ دنیا میں پروفیسر خال خال اور ماسٹر، جس کا ٹوٹا پھوٹا ترجمہ معلّم، بے شمار ہیں۔ اگر پروفیسر کے معنی نظر بندی اور پتے بازی کے نہ ہوتے ہوں، تاش اور مسمریزم کے بازی گر بھی تو پروفیسر ہی کہلاتے ہیں۔ میں ایک ایسے پروفیسر سے واقف ہوں جو میرے کالج کے زمانے میں کتابیں، کاپیاں اور اسٹیشنری بھی فروخت کرتے تھے اور روغنِ مقوی دماغ بھی اور کہتے تھے میں ڈبل پروفیسر ہوں میری کتابیں علم بخشتی ہیں اور میرے تیل سے دماغ روشن ہوتا ہے۔

میرے زمانے کے ایک پروفیسر یکتائے عصر سمجھے جاتے تھے ان کی دماغی اور انتظامی صلاحیتیں اس صدی کے نوادر میں شمار ہوتی تھیں ان کے سپرد بورڈنگ ہاؤس کے انتظامات بھی تھے۔ فرض کیجیے کمرہ کے انتخاب پر دو طالب علموں میں جھگڑا ہوا۔ ایک لڑکا دور سے پروفیسر کے مکان کی طرف آتا ہوا نظر آیا، پروفیسر نے پیچ و تاب کھانا اور طالب علم کو دشنام زیر لبی سے یاد کرنا شروع کیا۔ لڑکا قریب پہنچا تو بڑھ کر گلے سے لگا لیا، صوفہ پر بٹھایا، خود صوفہ کے بازو پر

بیٹھ گئے بولے:

''تم سے تو ملاقات کو آنکھیں ترس گئیں، آج کل کس دُھن میں ہو؟
کھانے میں مرچیں یا مکھیاں تو نہیں ہوتیں؟ اگر تم فوج میں بھرتی ہو جاؤ تو
میں اپنی روح کو بیچ میں رکھ کر کہتا ہوں تم کو وکٹوریا کراس مل جائے گا۔ تم کو
پکّا گانا پسند ہے یا کبڈی؟ میں نے حال ہی میں ایک گانا تصنیف کیا ہے
اس کا پہلا ٹکڑا یہ ہے......''

پہلی ہی کنکری لی تھی کہ لڑکا رونے لگا۔

فرمایا: ''گھبراؤ نہیں۔ کسی کے والدین تمام عمر زندہ نہیں رہتے۔''

لڑکے نے گھبرا کر رونا بند کیا اور کمرہ کا قصہ چھیڑا تو پروفیسر صاحب نے فوراً ہی ٹوک دیا۔ بولے:

''میں خوب جانتا ہوں وہ بڑا ہی حقنّی ہے۔ جب سے بورڈنگ ہاؤس
میں آیا ہے مجھ پر حلال حرام اور حرام حلال ہو گیا۔ تم کو شاید یہ معلوم نہیں
تمھارے آنے سے پہلے ہی میں نے اُسے جہنم رسید کر دیا اب تم کمرہ پر
جاؤ گے تو اس کا نام نشان تک نہ پاؤ گے۔''

لڑکا خوش خوش کمرہ پر واپس آیا تو وہ پہنچا جس کو یہ جہنم رسید کر چکے تھے۔ اطلاع پاتے ہی اس کو بھی دشنام زیرلبی سے یاد کیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس دفعہ اپنے کو بھی شامل کر لیا تھا۔ برآمد ہوئے تو قبل اس کے کہ لڑکا سنبھلے اسے گلے سے لگالیا اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے بولے:

''اہلاً وسہلاً مرحبا، خوب آئے۔ میں تو تم کو رات کو خواب میں دیکھتا تھا اور
اُچھل پڑتا تھا۔ کیا بتاؤں جب سے یہ عہدہ قبول کیا ہے خواب و خور حرام
ہو گیا ہے۔ کاش یہ عہدہ تم کو تفویض ہوتا اور میں تو اس پر تیار ہوں کہ تم ہی
یہ کام سنبھالو۔ مجھ سے دریافت کیا گیا تو میں تمہارا ہی نام پیش کروں گا اور
میرا تو ایمان ہے کہ انتظامی معاملات اور ہم لوگوں کی برخاستگی بحالی سب
تم لوگوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔''

لڑکے نے کمرہ کا قضیہ چھیڑنا چاہا تو فوراً ٹوک دیا اور کہا:

''میں نے تو تمھارے آنے سے پہلے ہی اُسے نکال دیا۔ تم میری آنکھوں کے نور ہو اور دل کے سرور تم اطمینان سے کمرہ پر قبضہ کرو اور تمھارے جی چاہے تو میرے ہاں چلے آؤ۔ یہ سب جو تم دیکھتے ہو تمھارے ہے میں تو روسی نظامِ معاشرت کا قائل ہوں، معاشی ملکیت خدا کے ہاں لے کر کیوں جایئے؟''

لڑکا کمرہ پر پہنچا تو دونوں میں فوج داری ہوگئی۔ اب اسسٹنٹ ٹیوٹر پروفیسر کے ہاں پہنچے۔ ان کی پذیرائی بھی اسی زیروبم سے کی گئی جس سے طلبا کی کی گئی تھی۔ بولے:

''خوب ہوا کہ آگئے۔ میں تو استعفیٰ دینے جا رہا تھا۔ ورنہ ان دونوں کو شہربدر کیا جائے۔ میں صرف تمھاری رائے کا منتظر تھا اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں تمھارا میں اتنا احترام کرتا ہوں کہ میں چاہتا ہوں کہ جب میں مروں تو تم ہی مجھے قبر میں اُتارو۔ بس آخری خدمت میرے لیے یہی ہوگی اور دنیا میں رکھا ہی کیا ہے، آؤ میں تم کو ایک تقریر کا حصہ سناؤں جو......''

اسسٹنٹ ٹیوٹر ان باتوں سے واقف تھے انھوں نے بات کاٹتے ہوئے کہا:

''آپ کو چاہیے تھا مجھ سے صورتِ حال دریافت تو فرما لیتے۔''

پروفیسر نے جواب دیا:

''صورت حال کا کیا سوال؟ دونوں صورت سے بدمعاش معلوم ہوتے تھے میری آنکھوں کی پُتلی، تم اس کا خیال نہ کرو۔ یہ طالب علم نہیں، جھوٹ ان کی گھٹی میں ہے۔ میں ان کو پرنسپل کے سامنے پیش کروں گا اور یہ کہوں گا کہ ان کو نکالا جائے یا میرا استعفیٰ لے لیا جائے اور سینئر ٹیوٹر تم کو بنا دیا جائے۔ میں بوڑھا ہوا، میں اس جھگڑے میں کیوں مبتلا رہوں۔ میں تو دنیا کا چکر لگاؤں گا میرے لکچر تیار ہیں۔ امریکہ کی ایک کمپنی نے مجھے اسٹیج ڈائرکٹری تفویض کی ہے، لیکن میرا ارادہ ہے کہ میں خراسان کے درویشوں کے

ساتھ اِدھر اُدھر گھومتا پھروں اور حقہ پیتا رہوں۔ بابا یہ کام تم سنبھالو۔ جب تک
یہ کام تم نوجوانوں کے ہاتھ میں نہ دیا جائے گا اسلام خطرہ سے باہر نہ ہوگا اور
جب تک اسلام خطرے سے باہر نہ ہو میں آپ سے کیسے باہر ہو سکتا ہوں۔''
ان پروفیسر صاحب نے کلاس میں کورس کبھی نہیں پڑھایا۔ ان کا مقولہ تھا کہ:
''کورس تو غبی پروفیسر پڑھاتے ہیں۔''
طالب علموں سے کہتے:
''میں تم کو ایسی باتیں بتانا چاہتا ہوں جن کے بغیر زندگی میں تازگی اور
خرمی نہیں آتی مثلاً تم کو معلوم ہے نوشیرواں عادل کس قسم کے خضاب
لگاتا تھا اور کلوپیٹرا کا اثر اجنتا کے غاروں میں کہاں کہاں اور کس حد تک
نمایاں ہے؟''
کسی شعر کی وضاحت کے لیے کوئی طالب علم بہت مضطرب ہوتا تو پروفیسر صاحب
ہمیشہ ایسا وقت مقرر کرتے جب سورج غروب ہونے میں چند لمحوں کا وقفہ ہوتا۔ وجہ یہ بتاتے تھے کہ:
''یہ وقت زوالِ آفتاب اور عروجِ فکرِ انسانی کا ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو
معرفتِ الٰہی اسی وقت ہوئی تھی۔''
لیکن ادھر سورج غروب ہوا اُدھر پروفیسر صاحب عبادت الٰہی کے لیے رخصت ہو گئے۔
پروفیسر صاحب سے کسی قسم کا سوال کیوں نہ کیا جائے جواب یہ وہی دیتے تھے جوان کو
از بر ہوتا ان کی اس حرکت پر آپ جتنا متغض یا متعجب ہوتے اتنا ہی ان کے جوش وخروش کا پارہ
اونچا ہوتا جاتا مثلاً آپ یہ دریافت کریں۔
''پروفیسر صاحب فلاں تحریک کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''
یہ فی الفور جواب دیں گے۔
''میں خود اس قسم کی تحریک کا بانی رہ چکا ہوں۔ اُس زمانے میں ایورسٹ کی
چڑھائی کا بڑا چرچا تھا کیلاش پر سنسکرت میں ایک نہایت دل کش نظم ہے
جس میں کیلاش کو ایک حسینہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔''

یہاں سے وہ کوئی ایسی نظم پڑھنا شروع کردیں گے، جس میں کبوتر، ہرنی، بلّی بھنورا، بھالو، بوبل کا نام آیا ہے اور جس کا غلط ترجمہ کسی یورو پین مصنف نے کیا تھا اور پڑھنے کے دوران میں جہاں کسی خوب صورت پھول یا پرند کا نام آیا حاضرین میں سے کسی ایسی خاتون کی طرف اشارہ کریں گے جس کے شوہر کا منصب بلند اور خاتون کا حلیہ واجبی ہو!

پروفیسر صاحب کا سب سے بڑا حربہ خود حفاظتی ڈرنا تھا۔ کسی کا قصیدہ، ہجو یہ زوروں پر پڑھ رہے ہوں اور سننے والوں میں سے کسی ایک پر اس کا شبہ ہو جائے کہ وہ پروفیسر کے فرمودات کہیں اور پہنچادے گا، اُسی وقت مشتبہ شخص کا بوسہ لے کر گریز اس طور پر فرمائیں گے جس کا تعلق تشبیب سے قطعاً نہیں دعائیہ سے تمام تر ہو۔ جس کسی کا ہاتھ بغل میں لے کر ہنستے بولتے پروفیسر صاحب چلے آتے ہوں سمجھ لیجیے کہ اس شخص سے زیادہ مفسد، احمق یا آبرو باختہ کوئی اور نہ ہوگا۔ ان کا مصرف ہمیشہ سے یہ سمجھا گیا کہ جب کوئی بڑا موقع ہو تو یہ کسی ایشیائی زبان کا انگریزی ترجمہ بطور قصیدہ سنائیں اور اس طور پر سنائیں کہ اس کی مجسم تصویر بن جائیں۔ کلاس میں کسی لڑکے نے سنجیدگی کے ساتھ اُن کی طرف غور سے دیکھنا شروع کر دیا یا کوئی سوال کر دیا تو یہ اسے فی الفور کلاس میں یہ کہہ کر چائے پر مدعو کردیں گے کہ یہ مسئلہ کلاس میں طے کرنے کا نہیں ہے۔ یہ تو تمام تر استاد اور شاگرد کے باہمی دوستانہ تعلقات کی استواری پر منحصر ہے۔ چنانچہ ہم سب کو جب کبھی کھانے پینے یا مسخرگی و مطربی کا شوق اُٹھتا تو ہم سب یا دو ایک، پروفیسر صاحب کے دولت کدے پر پہنچ جاتے۔ وہاں یہ ایسی حرکتیں کرتے اور اچھی چیزیں کھلاتے پلاتے کہ مسئلہ زیر بحث گاؤ خورد ہو جاتا اور آخر میں فرماتے:

''یونیورسٹی کی تعلیم دراصل پروفیسر اور طالب علم کے باہمی گہرے سوشل تعلقات کا نام ہے یوروپ میں تو پروفیسر کے ساتھ بیٹھ لینا ہی اس بات کی ضمانت تھا کہ طالب علم کو فلاح دارین میسّر آ گیا اور دور کیوں جاؤ ——

پسرِ نوح بابداں بہ نشست
خاندانِ نبوتش گم شد

اور اصحابِ کہف کا کتا بھی بہشت میں جانے کا سزاوار ٹھہرا۔''

ان پروفیسر صاحب نے مجھے لکھایا پڑھایا کم، نصیحت برابر کرتے رہے، ایسی نصیحت جس سے میرے بجائے آپ کو زیادہ فائدہ پہنچتا تھا وہ مجھے علم سے اتنا آشنا نہیں کراتے تھے جتنا اپنے عالم مانے جانے کی ذمہ داری مجھ پر ڈالتے تھے۔ بالفاظِ دیگر میں ہی نہیں میرے پس ماندگان بھی اُن کو عالم سمجھیں۔

میں نے بعض اُن علوم کے سیکھنے کی بھی کوشش کی جن کا تذکرہ اوپر کرآیا ہوں، لیکن کوئی ایسا استاد نہ ملا جو اپنی استادی یا میری شاگردی کو خطرے میں ڈالتا۔ معلوم نہیں فن کے انتخاب میں مجھ سے غلطی ہوئی تھی یا ماہرِ فن کو شاگرد منتخب کرنے میں۔ بہرحال کچھ ایسا ہوا کہ میں طالب علمی سے مایوس ہو کر معلّم بن گیا! لیکن یہاں میری معلّمی زیرِ بحث نہیں ہے بلکہ میری طالب علمی اور دوسرے کی معلّمی۔

(تحریر 1949 قیاساً)

●●●

کیا کیا نہ کیا —— دولت کی خاطر

یاد نہیں آتا دولت کی خاطر میں نے پہلے قرض مانگنا شروع کیا یا بھیک، ممکن ہے دونوں کاروبار ساتھ ساتھ کر دیے ہوں۔ یہ اس لیے کہتا ہوں کہ اصلاً دونوں ایک ہی ہیں۔ فرق مراتب کا ہے۔ مانگنے والا بڑا آدمی ہے تو قرض ہے، چھوٹا ہے تو بھیک!

میں نے بھیک مانگنا شروع کیا تو بھک منگوں نے شاعری شروع کر دی۔ اب میرے لیے بڑی مشکل تھی۔ وہ یوں کہ لوگ یہ تمیز نہیں کر سکتے تھے کہ بھک منگا کون ہے اور شاعر کون ہے۔ تمیز گھٹتی ہے تو دولت بڑھتی ہے، لیکن جہاں دولت پہلے سے نہ ہو وہاں اس کے سوا چارہ نہیں کہ بھک منگے اور شاعر بڑھتے رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میونسپلٹی نے قانون پاس کر دیا کہ بھیک مانگنا جرم ہے۔ سارے بھک منگے شہر بدر کر دیے جائیں ان کے ساتھ شاعر بھی نکالے گئے۔ انھوں نے خلد سے آدم کے نکالے جانے اور کسی کی گلی سے خود اپنے نکالے جانے کا شعر بھی پڑھا، لیکن ایک پیش نہ گئی۔ کہا یہ گیا کہ آدم اس لیے نکالے گئے کہ وہ ضرورت سے زیادہ آدمی تھے اور تم اس لیے نکالے جا رہے ہو کہ سرے سے آدمی نہیں ہو، اتنا بھی کسی نے نہ دیکھا کہ کتنے بھک منگے شاعر تھے یا شاعر بھک منگے۔ اب ان کی اوقات یہ رہ گئی تھی کہ دن بھر بھیک مانگتے رات کو مشاعرہ کرتے۔ زندگی کا یہ انداز بہت مقبول ہوا، ایک نئی میونسپلٹی وجود میں آ گئی۔ ظاہر ہے کہ کوئی زندگی میونسپلٹی سے خالی نہیں۔ بھک منگے ممبر بنے، شاعر ووٹر رہ گئے مجھ میں دونوں کے خواص پائے گئے، اس لیے میں چیئرمین تسلیم کر لیا گیا۔

لیکن یہاں میں نے جلدی سے کام لیا، کام کی کچھ باتیں چھوٹ گئیں —— دولت کمانے، شعر کہنے اور مار کھانے کا کوئی اصول نہیں، طریقے بہت سے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ بھک منگوں اور شاعروں کا آج تک کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔ انھوں نے سب کچھ بگاڑا ہے آپ نے سنا ہوگا کسی چیز کے حاصل کرنے کے لیے تین طریقے بہت عام ہیں، بھیک مانگنا، قرض لینا، چوری کرنا ان میں ہر ایک ایسا ہے جو سلیقے سے نہ برتا جائے تو آدمی جیل یا جہنم کو چلا جاتا ہے اور سلیقے سے برتا جائے تو نورٌ علیٰ نور۔

دولت کمانے کی ان تینوں عبادتوں کو میں نے بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ میر نے کہا ہے:

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں![1]

میرا کہنا یہ ہے کہ بھیک مانگنے میں بھی کچھ کم سلیقے کی ضرورت نہیں پڑتی مثلاً یہی دیکھئے کہ بھیک اس طرح مانگئے کہ لوگ چندہ مانگنا سمجھیں یا چوری اس طرح کہ لوگ سمجھیں مذاق یا قوم کی خدمت کر رہا ہے، یا قرض اس طرح مانگئے کہ لوگ سمجھیں ملک خطرے میں ہے یا بہ یک وقت سب کچھ کر رہا ہو اور ہم آپ سمجھیں ترقی پسند ہے۔ یہ سب سلیقہ ہی کا کرشمہ ہے یا کسی اور کا۔

بھیک مانگنے والوں نے اس فن کے جواز میں یہ بتایا ہے کہ بھیک مانگنا دراصل بھیک مانگنا نہیں ہے بلکہ بھیک دینے والے کو اس کا موقع دینا ہے کہ وہ خدا کو قرض دے جسے خدا آخرت میں ادا کردے گا۔ میں اب تک یہ دریافت نہیں کر سکا ہوں کہ دنیا اور آخرت میں کون ''سوفٹ کرنسی'' رقبہ میں ہے اور کون ''ہارڈ کرنسی'' میں اور شرح مبادلہ کیا ہے۔ اقبال نے ایک جگہ کہا ہے کہ اپنی خودی کو اتنا بلند کرو کہ: ''خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔''

ممکن ہے خودی کے بلند ہو جانے پر خدا بندے کی رضا پوچھنے لگے، لیکن خیال ہے کہ اگر کبھی ایسا ہوا تو خدا دو ہی ایک بندوں سے رضا پوچھنے کے بعد خودی کے مقررہ معیار پر نظر ثانی کر ڈالے گا۔ مجھے شبہ ہے کہ میری خودی کبھی بھی اتنی بلند نہ ہو سکے گی کہ خدا مجھ سے میری رضا پوچھنا گوارا کرے گا۔ میں نے بھی بھیک مانگنے میں خدا سے کبھی نہ پوچھا کہ اس کی رضا کیا ہے۔ مجھے تو اکثر اس کا اندیشہ رہا کہ جو لوگ مجھے بھیک دیتے ہیں خدا ان کی رضا طلب کرنے کے بجائے ان سے جواب طلب کرے گا۔

---

1. پورا شعر اس طرح ہے:

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں　　　تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

چور بازاری کی آمدنی پر خدا کو مقروض کرنا بالخصوص ایسی حالت میں کہ شرح مبادلہ، زر طے نہ ہو، میرے نزدیک کوئی شریفانہ فعل نہیں ہے، لیکن میں ایمان داری سے بھیک مانگتا ہوں یا نہیں اتنی بات ضرور ایمان داری سے کہوں گا کہ میں نے اتنی بھیک نہیں مانگی کہ بھیک دینے والے کو آخرت میں کچھ زیادہ آمدنی کی توقع ہو۔ مجھے اُمید ہے خدا میری اس خدمت کا ضرور لحاظ رکھے گا!

میں نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ دولت کمانے کے تین طریقے بہت مقبول ہیں، ان تینوں میں، میں نے بھیک مانگنا اختیار کیا تھا۔ آپ یہ معلوم کر کے خوش ہوں گے کہ قرض لینا اور چوری کرنا دراصل بھیک مانگنے ہی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔ یہ توتو قع یا مصلحت ہوتی ہے کہ ہم کسی کو بھک منگا نہیں مقروض یا چور کہتے ہیں اور یہ ہماری کمزوری ہے کہ ہم ایک بھک منگے کو چور کہتے ہیں اور دوسرے بھک منگے کو غریب پرور سلامت! اور گزارش حال یہ بھی ہے کہ غریب پرور سلامت پر بُرے دن آتے ہیں تو ہم ان کو ایسے لقب سے یاد کرتے ہیں جن سے بھک منگے مقروض اور چور کو بھی شرم آئے!

قرض لینے کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ کو پیسے کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ قرض دینے والا جب آسیب کی طرح آپ کا پیچھا کرنے لگتا ہے اس وقت آپ محسوس کرتے ہیں کہ پیسے کا پاس ہونا یا نہ ہونا کیا اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بات میں نے کچھ یوں ہی سی کہہ دی ہے اور آپ کے لیے نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے ہے جو شاید بھیک مانگنے کی بھی اہمیت نہیں رکھتے، لیکن خرچ کرنے میں خاصے فارورڈ بلاک ہوتے ہیں!

قرض لینا بڑے ریاض کا فن ہے اس میں ذرا سی چوک ہو جائے تو آدمی کہیں کا نہیں رہتا قرض کا علاج صرف قرض ہے۔ علاج سے ذرا غفلت برتی جائے تو مریض کہیں کا نہیں رہتا۔ قرض میں ٹھہراؤ ہوا نہیں کہ فن پر زوال آیا جس طرح انسانی فضائل کی تکمیل میں عقل اور عشق دونوں کی کارفرمائی ہوتی ہے، اسی طرح قرض کے فن کی تکمیل میں بھی عقل و عشق کا دخل ہوتا ہے۔ یہاں بھی ابتداء عقل کی اور اس کے بعد کی ضرورت قدم قدم پر محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے کہ عقل تو تماشائے لبِ بام سے آگے نہیں بڑھتی، آتشِ نمرود یا آتشِ مقروض میں عشق ہی کو کود پڑنا ہے۔

دولت کی خاطر قرض لینا پڑتا ہے، لیکن جب تک دولت نہ ہو اس وقت تک قرض نصیب نہیں ہوتا۔ دولت نہ ہو اور قرض لینا پڑے تو پھر شخصیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ شخصیت کی پہچان یہ ہے کہ قرض آسانی سے لے سکے اور جب ادا کرنا چاہے تو قرض خواہ بُرا مان جائے! بالفاظ دیگر قرض دار میں شخصیت ہونی چاہیے اور قرض خواہ میں محبت۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوگی، لیکن یہ عجیب ہے نہیں اس لیے کہ قرض دینے والا محبت نہ کرے تو میں اس کا قرض کیوں ادا کرنے لگا۔ میں جس سے قرض لیتا ہوں اس سے ایک طرح کا سمجھوتا ہوتا ہے۔ یعنی قرض لے کر ہم نے ایک دوسرے کو اس کا مچلکہ دیا ہے کہ تا ادائیگی قرض آپس میں شریفانہ طور طریقے برتیں گے۔ اس قرض پر نیک چلنی کے مچلکہ کے نباہنے کا تمام تر بار قرض دینے والے پر ہوتا ہے۔ میں صرف اتنی احتیاط برتتا ہوں کہ قرض دینے والے کو اپنے حسنِ سلوک ورنہ صرف حسنِ نیت سے یہ ظاہر کر دیا کرتا ہوں کہ صلح و شرافت کے اعلیٰ مقاصد کے پیشِ نظر حتی الوسع یہ قرض ادا کیا جائے گا، یہی نہیں بلکہ اس قرض میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ بقول شخصے چو محمل را گراں بینی!

دولت کمانے کا تیسرا وسیلہ چوری ہے۔ اس کا رشتہ بھیک اور قرض دونوں سے ہے مثلاً دونوں کو ایک ادا میں رضامند کر گئی! کم بھیک یا قرض مانگنے والے ایسے ہیں جو چوری کے مرتکب نہ ہوتے ہوں۔ میں ان کم لوگوں میں نہیں ہوں۔ چوری کا مدار ہمیشہ کسی کی حق تلفی پر نہیں ہوتا اپنی خوش قسمتی پر بھی ہو سکتا ہے اور دنیا میں کون ایسا بدنصیب ہے جو کسی نہ کسی حد تک خوش قسمت نہ ہو۔ میں بھی خوش قسمت ہوں اس لیے چوری سے باز نہ آیا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ میں نے بھیک، قرض یا چوری کا مشغلہ کب شروع کیا ختم کر دینے کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بقول اقبال کارِ جہاں دراز ہے۔''

میرا خیال ہے کہ آپ کو اس پر اصرار بھی نہ ہوگا کہ میں یہ بتاؤں کہ یہ مشاغل میں نے کب سے شروع کیے۔ خود آپ میں ایسے لوگ موجود ہوں گے جو یہ نہ بتا سکیں گے کہ فطرت یا سوسائٹی کے مطالبات گناہ انھوں نے کب سے ادا کرنے شروع کیے۔ اسی وقت یا نزاکت کے پیشِ نظر عقل مندوں نے، گناہِ اوّل، کا نظریہ ایجاد کیا اور ہم نے آپ نے نکاح ثانی اور مہر شرعی کا! اس طور پر میرا خیال ہے زندگی کی ہر سرگرمی کا شجرۂ نسب ان نظریات کی روشنی میں دریافت کیا جا سکتا ہے!

دولت کی خاطر میں نے کیا کیانہ کیاپر اظہار خیال کرنے میں ایک قباحت یہ بھی ہے کہ اس سے میری اُس ہر دل عزیزی کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے جو انکم ٹیکس والوں اور چور بازار کے کاروباریوں میں مجھے یکساں طور پر حاصل ہے۔ دراصل میں دولت پیدا کرتا ہی ہوں انہی دونوں کی خاطر۔ میں چور بازار والوں کا احسان مند ہوں اس لیے کہ وہ کبھی نہیں پوچھتے کہ میں نے روپیہ کہاں کمایا اور کیسے کمایا۔ میں انکم ٹیکس والوں کا بھی شکر گزار ہوں کہ وہ اتنا پوچھتے ہیں کہ کتنا کمایا؟ ریڈیو والوں کے بارے میں کیا عرض کروں جو یہ دریافت کرنے پر تلے ہیں کہ کیوں کر کمایا؟ انکم ٹیکس کا تو مقصد یہ ہے کہ اتنے میں اتنا رکھتے جاؤ چور بازار والے اس کے درپے رہتے ہیں کہ سب کچھ رکھ جاؤ ریڈیو اس فکر میں ہے کہ جیل خانے بھی جاؤ!

بھک منگائی، قرض، چوری کے تجربات ابھی پورے ہوئے تھے کہ میرا سابقہ ایسے زمانے اور ایسے لوگوں سے ہوا جو دولت پیدا کرنے کے بجائے دولت لوٹنے کی عبادت میں مبتلا تھے۔ مجھے لوٹنے والوں کے ہتھکنڈے معلوم تھے، لیکن عقل کے اعتبار سے میں کچھ ایسا مرنجاں مرنج واقع ہوا تھا کہ جس آسانی سے دوسروں کی کامیابی دیکھتا اور للچاتا تھا اس سے بہ درجہا زیادہ غور و فکر کے بعد بھی اور غالباً اسی وجہ سے، اپنی نالائقی کا اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ میں نے لفنگوں کو لیڈر بنتے دیکھا، لیکن خود لفنگا بننے کی کوشش شروع کی تو لفنگوں نے مار گرایا۔ وہ بھی اس شان سے کہ نہ خود لفنگا بن سکا نہ لفنگوں کا کچھ بگاڑ سکا۔ چور بازاری شروع کی تو چور بازار والوں نے مجھے خفیہ پولیس اور خفیہ پولیس نے دہشت پسند قرار دے کر چالان کر دیا اور ایک خاتون مجسٹریٹ نے ناقص العقل قرار دے کر چھوڑ دیا۔

اب میں نے سوچا کہ جمعہ کے دن نمازیوں کی جوتیاں چراؤں گا۔ گاؤں کی معمولی سی مسجد تھی حلیہ نے کام بنا دیا، نمازی یہ سمجھے کہ میں واعظ ہوں۔ نماز کے بعد ہاتھ چومے، منبر پر بٹھایا اور وعظ سننے کے لیے سر بہ زانو ہو گئے۔ میں نے زکوٰۃ کی فضیلت اور جوتے چرانے کی معصیت پر تقریر شروع کر دی۔ میرا خیال ہے کہ میرے وعظ کا جو اثر ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہو رہا تھا اس لیے کہ جن پر زکوٰۃ واجب آتی تھی وہ اونگھنے لگے تھے اور جن کی نیت جوتے پر تھی وہ رہ رہ کر کن انکھیوں سے کچھ اس طرح میری طرف دیکھتے تھے کہ مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی تھی۔ باہر نکلا تو جوتا غائب معلوم ہوا کہ اس دیار میں لوگ جوتے پہنتے نہیں لاٹھی پر لے کر چلتے ہیں اور لاٹھی کندھے پر

ہوتی ہے۔ مزید گفتگو پر یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ لوگ بگڑ بیٹھتے ہیں تو جوتا سمیت لاٹھی سے خبر لیتے ہیں، اور عدالت اس کا مطلق لحاظ نہیں کرتی کہ آپ لاٹھی کے علاوہ جوتے سے بھی پٹتے ہیں۔

پھر میں نے خیال کیا کہ مکتب میں مدتوں معلّمی کی ہے کیوں نہ کسی شاگرد کے ہاں قسمت آزمائی کی جائے۔ گاؤں میں ایک کھاتے پیتے کاشت کار تھے جنھوں نے مجھ سے سال ہا سال قواعد بغدادی کا درس لیا تھا۔ اُس زمانے میں بنیادی تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ ایک حرف بتا دیا اور فوراً ہی کان مروڑ دیے تا کہ بتایا ہوا حرف یا لفظ فرار نہ ہونے پائے۔ بالآخر خوے مُڑے کان اس قابل نہ رہ جاتے کہ کوئی بات اندر سما سکے۔ انھوں نے بڑی محبت سے پذیرائی کی۔ کئی دن تک خاطر مدارات رہی۔ اس دوران میں، میں نے کتنوں کو مذہب کی اہمیت اور فاقے کی فضیلت بتائی، کتنوں کی جھاڑ پھونک کی۔ کسی کی صورت دیکھ کر اولاد کی صورت بتائی اور کسی کے تیور دیکھ کر شادی کی ضرورت جتائی۔ جن کے مقدمے دائر تھے ان کے لیے جھوٹے بیانات تصنیف کیے۔ پٹواری سے ڈرنے اور زمین دار سے لڑنے کی ترغیب دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چلنے لگا تو اچھا خاصا مالِ غنیمت ساتھ تھا۔ ایک بوجھ گنے اور گیہوں کی ہری ہری بالیوں کا، چند سیر گُڑ، کچھ اچار، ایک تھان گزے کا، ایک عدد مرغ دو روپے سے کچھ کم کی ریزگاری۔ ان سب کو لاد پھاند کر گاؤں سے رخصت ہوا راستے میں پولیس کی چوکی پڑتی تھی۔ ہیڈ صاحب کی نظر پڑی، پکڑ بلایا۔

اُن دنوں آس پاس گاؤں میں چوریاں ہو رہی تھیں اور چور کا پتہ نہیں لگتا تھا۔ جو چیزیں چوری ہوئی تھیں اور جن لوگوں پر شبہ تھا اُن کی فہرست اور حلیے قلم بند تھے۔ جو چیزیں متفرق طور پر مختلف اوقات میں چوری گئی تھیں وہ مجموعی طور پر میرے قبضے سے برآمد ہوئیں اور جن لوگوں پر شبہ تھا ان کے حلیے کے مختلف اجزا مجموعی طور پر میرے حلیے میں ملے۔ ہیڈ صاحب نے ایک زہرخند کے ساتھ فرمایا: ''اُن چہ خوباں (دُزداں) ہمہ دارند تو تنہا داری''[1]

میں نے آہِ سرد کھینچ کر کہا: بہارآفریا گنہ گار ہیں ہم!!

نتیجہ یہ ہوا کہ سارا سامان ضبط کر لیا گیا اور مجھے فہمائش کی گئی کہ اس نواح میں نہ پایا جاؤں!

---

1 فارسی کا یہ مشہور شعر ہے:

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، ید بیضا داری   آن چہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

دولت کی خاطر میں نے ''گرومورفوڈ'' (خوراک زیادہ پیدا کرو) کی تحریک پر بھی عمل کیا ہے اس میں سب سے پہلی دقت یہ محسوس ہوئی کہ جب تک زیادہ کھایا نہ جائے اس وقت تک زیادہ خوراک کس طرح پیدا کی جائے۔ بہر حال ایک قطعہ اراضی حاصل کی، دو مریل بیل اور ایک شکستہ ہل بہم پہنچائے۔ فنِ کاشت کاری پر ایک کتاب چُرائی۔ گرومورفوڈ کے مسئلے پر شکم سیر لیڈروں کی جتنی تقریریں ہوتی تھیں وہ سب اپنے اوپر دم کہیں، قوم کے لیے نعرے لگا تا اپنے آپ پر لعنت بھیجتا، اوباشوں کے تیور اور دلہ روں کے حلیے میں کھیت پر پہنچا۔ چابک کو اونچا کیا اور بیلوں کو دو ایک رسید بھی کر دیے۔ تھوڑی دور چلا تھا کہ ایک جگہ پاؤں مڑا، زمین پر آ رہا، لیکن ہل کو نہ چھوڑا اور گھسٹتا چلا گیا۔ جو زمین ہل سے کھدی تھی وہ ہموار ہوگئی اور ایک ایسا طریقہ دریافت ہو گیا جس سے بہ یک وقت زمین جُتتی جائے، بیج پڑتے جائیں اور زمین ہموار ہوتی جائے۔ یہ طریقہ ذرا شکم خراش ضرور تھا، لیکن فوراً ہی بڑے فوجی جرنل کا قول یاد آیا کہ فوج پیٹ کے بل مارچ کرتی ہے۔ میں نے دل کو سمجھایا کہ ''گرومورفوڈ'' کی مہم میں بھی ایسا ہوتا ہے!

تفصیل میں طوالت ہے۔ مختصر یہ کہ ایک گڑھے میں برسات کا پانی جمع تھا اس میں سنگھاڑے کی بیل ڈال دی۔ ایک طرف دھان کے بیج بکھیر دیے، کچھ ترکاریاں بو دیں۔ دن رات کی کروٹوں کے ساتھ آفاتِ ارضی و سماوی بھی کروٹیں لیتی رہیں۔ یہاں تک خیریت رہی، لیکن پودوں کے نمودار ہوتے ہی آفتوں نے کروٹیں لینا بند کر کے چھلانگیں مارنا شروع کر دیں۔ مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ میری کاشت کاری کتنی بابرکت تھی۔ سنگھاڑے کے ساتھ میں نے گڑھے میں بھینسیں اگتی دیکھیں جن پر کہیں کہیں بندر اُگے ہوئے تھے۔ دھان اور ترکاریوں کے ساتھ ہر طرف مویشیاں، مرد، عورت، بچے، مرغیاں، چوہے، خرگوش، پٹواری، مہمان، شاعر اور مسخرے بھی اُگنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خوراک پیدا کرنے کی بجائے مجھے اس کا اندیشہ ہوا کہ کہیں میں ہی نہ خوراک بن جاؤں۔ ایک صاحب نے مجھے ایک فوٹو لا کر دکھایا جب میں نے ہل چلا کر پیٹ کے بل گرومورفوڈ کے پروگرام کا افتتاح کیا تھا، اس کے نیچے لکھا ہوا تھا: ''ہل من یزید۔''

(نشریہ: 13 رفروری 1950۔ مطبوعہ: نئی روشنی، دہلی 24 رمارچ 1950۔ نگار، لکھنؤ، اپریل 1950)

●●●

اشتہار بازی

اشتہار پر جو ایمان نہ لائے وہ کافر۔ یہاں کافر سے مراد کسی کا کفر نہیں میرا تکیۂ کلام ہے۔ اشتہار سے مردے زندہ اور زندہ درگور ہو چکے ہیں اور جو باقی رہ گئے ہیں ان کے لیے بقول اخبار والوں کے ''اشتہار کے لیے جگہ خالی ہے۔'' مجھے دواؤں کے اشتہار سے زیادہ دلچسپی ہے اس لیے نہیں کہ میری بعض کمزوریوں کی دوا ان اشتہارات میں ہوتی ہے بلکہ اُن اشتہارات میں دواؤں کی کرامات کا حال پڑھ کر مجھ میں اکثر یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش اس مبارک مرض میں، میں بھی مبتلا ہوتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ شاید وہ اشتہاری مرض مجھے لاحق ہو گیا۔ دواؤں کا اس طور پر اشتہار دینا کہ امراض سے ہمدردی پیدا ہو جائے، اشتہار دینے والے کا بڑا کارنامہ ہے جس کی قرار واقعی داد صرف وہ مریض دے سکتے ہیں جو اِن اشتہارات کا شکار ہوں یا وہ تندرست جو لیڈروں کے پکّے گانے پر سر دُھنتے ہوں۔

میری طبیعت کی اس افتاد سے آپ میرے لاشعور کا پتہ لگا سکتے ہیں وہ لاشعور جس کی برکتیں آج کل کے شعر و ادب میں سرایت کیے ہوئے ہیں اور جس شعر و ادب کی جھلکیاں اشتہارات میں ملتی ہیں، جس کی بنا پر آج کل کے شعر و ادب کے دور کو دورِ لاشعور کہیں تو بجا ہے۔ اشتہار دینے والوں نے ہمارے اس لاشعور کو خوب پہچانا ہے اور وہ دن بھی دور نہیں جب اس سے پولیس والے بھی واقف ہو جائیں گے۔

جن چیزوں کا اشتہار دیا جاتا ہے ممکن ہے وہ ایسی نہ ہوں جیسا کہ اشتہار میں بیان کیا گیا ہے، لیکن جس طرح مزخرفات کثرتِ استعمال سے ادب کا درجہ یا نعرۂ جنگ کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اسی طرح اشتہارات میں جھوٹ کی کثرت یا جھوٹ کا مسلسل اشتہار ہماری اکثر معتقدات کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ بات منوانے کا ایک گر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جھوٹ بولو کثرت سے بولو بانگِ دہل بولو اور بار بار بولو، بات مان لی جائے گی اور یہ سوائے اشتہار کے کسی اور طرح ممکن نہیں۔

ایک صاحب کی زبان ایک بے سروپا بات سن کر میں نے اس کی تصدیق کرنے میں تامّل کیا، لیکن جب انھوں نے بڑے شدومد کے ساتھ یہ کہا کہ واقعہ جھوٹ نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ انھوں نے اسے چھپا ہوا دیکھا ہے تو مجھے ہار ماننی پڑی۔ صحیح ہے اس لیے کہ چھپ گیا اور چھپا ہوا ہے اس لیے صحیح ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں ہے جن کی بات یا حلیہ کو وقعت دی جاسکے۔ یہ لوگ اشتہارات کو وقعت دیتے ہیں بالخصوص دواؤں اور بیویوں کے اشتہارات کو بیویوں کے اشتہار سے میری مراد ہماری آپ کی بیویاں نہیں بلکہ وہ ہیں جو اُن بیویوں کی جگہ لینے کی درپے ہیں۔

ہماری شاعری میں ''اشتہار بازی'' کے دو بڑے اہم نمونے ملتے ہیں، غزل اور قصیدہ۔ قصیدہ میں ممدوح کی اور غزل میں محبوب کی تعریف کی جاتی ہے اور جب کہ ہم مشرق کے مسکینوں کا دستور ہے، تعریف اور مذمّت دونوں میں ہم تعریف اور مذمّت کی حدود اور اپنے آپ سے باہر ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ غزل اور قصیدہ میں محبوب اور ممدوح کے جن اوصاف حمیدہ کا ذکر جس بدحواسی سے کیا جاتا ہے ان کو الفاظ کے جامہ سے تصویر کے پیرہن میں منتقل کیا جائے تو بعض ایسے کارٹون نظر آئیں گے جن کو دیکھ کر آپ مشکل میں پڑ جائیں گے کہ یہ ہیئت محبوب کی ہے یا ممدوح کی یا دخود شاعر کی۔

غزل اور قصیدہ اب نامقبول ہو رہے ہیں مگر ممدوح یا محبوب سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہا ہے، چنانچہ غزل اور قصیدہ کی جگہ اب اُن افسانوں اور نظموں نے لے لی ہے جن میں انسانی کمزوریوں کے مقابلہ میں عقل و اخلاق کے بے بس یا لاطائل ہونے کا اشتہار دیا جاتا ہے،

ان افسانوں اور نظموں میں جو باتیں جس جس طرح سے بیان کی جاتیں ہیں ان سے قطع نظر ان کے مصنفین کو اس کی شدید ضرورت لاحق ہوتی ہے کہ انسانیت کا حشر کچھ ہی ہو خود ان کا نشر خاطر خواہ ہو۔ اس کے لیے مقدمہ نگار تلاش کیے جاتے ہیں۔

پیشہ ور مقدمہ بازوں کی طرح پیشہ ور ''مقدمہ نگار'' بھی ہوتے ہیں۔ مقدمہ باز اور مقدمہ نگار دونوں میں ایک فضیلت مشترک ہوتی ہے دونوں شرفا کے ناموس کے لاگو ہوتے ہیں۔ مقدمہ باز اپنے حریف کو رُسوا کرتا ہے مقدمہ نگار ان ارباب فکر ونظر کو اس وقت تک رُسوا کرتا ہے جن کے افکار سے ملتے جلتے مقدمہ نگار کے ہیرو کے خیالات ہوتے ہیں یا جن سے اس نے بقول شخصے ''سرقہ کیا ہوا ہوتا ہے۔'' چنانچہ ان دنوں نظم اور نثر کے مجموعوں پر جو مقدمے لکھے یا لکھوائے جاتے ہیں، ان کو غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فضائے شعر وادب میں ایک دُم دار ستارہ بڑی آب وتاب سے نمودار ہوا ہے جس کے ایک سرے پر صاحب مجموعہ ہیں اور دوسرے پر مقدمہ نگار اور مشیتِ الٰہی سازگار ہوئی تو اس ستارہ کی دُم سے ٹکرا کر دوسرے ثوابت وسیار پاش پاش ہوجائیں گے۔ بقول ایک اشتہار کے:

''پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔''

کچھ تو میری عادت اور کچھ وقت گزاری کا مشغلہ، میں اسٹیشن پر ادھر اُدھر چسپاں اشتہارات ضرور پڑھتا ہوں سوا ایسے اسٹیشنوں کے اشتہارات کے جن کے پلیٹ فارم کے شیڈ میں ایسے کبوتر آباد ہوں جن کا سخن فہمی عالم بالا کی بنا پر شکار کیا جانا ممنوع ہے۔ مجھے اُن اشتہارات سے بڑی دلچسپی ہے جو ریلوے پولیس کے دفتر کے باہر تختوں پر چسپاں ہوتے ہیں۔ یہ اشتہارات بالعموم تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو گم شدہ عزیز کے تلاش کے، دوسرے کسی من چلے مفرور کے اور تیسرے پولیس کی سرپرستی میں کسی دنگل کے۔ سب سے پہلے میں یہ دیکھتا ہوں کہ ان کے لیے انعامات کتنے کے مقرر ہیں اور یہ انعامات مجھے مل جائیں تو میں اپنے کتنے لاشعوری مطالبات پورے کرسکتا ہوں یعنی مجھے اپنے ذاتی استعمال کے لیے کتنی وہ دھوتیاں مل سکتی ہیں جن کی نمائش کپڑے کی مشہور ہندستانی کارخانوں نے رنگ برنگ کی دل کش ساری پوش تصاویر میں کی ہے جو اسٹیشن کی دیوار پر جابجا نصب ہوتی ہیں۔ مردانی دھوتی میں ملبوس دو مختلف اشتہاروں میں آپ نے

دو قوی ہیکل گاؤدی مردوں کی تصویریں دیکھی ہوں گی۔ ایک تو ساریوں سے لدے ہوئے ایک بیل، ایک سروِ خراماں کے ساتھ ساتھ رو نموں ہیں اور دوسرے انھیں کے بھائی ایک سہی[1] قد کے پاس انتہائی اندازِ ابلہی کے ساتھ اُکڑوں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ انعامات کا موازنہ اپنے لاشعور سے کرنے کے بعد میں اس امکان پر غور کرتا ہوں کہ یہ انعامات میرے بجائے کسی دوسرے کو ملیں تو مجھے کتنی جلن ہوگی اور کسی کو نہ ملیں تو اس میں میرا کیا قصور! اس کے بعد دل میں یہ بات آتی ہے کہ گم شدہ عزیز، من چلے مفرور اور دنگل کے پہلوان میں سے کس کے حالات یا حلیہ مجھ سے ملتا ہے۔ میں مطالعہ اور مشاہدہ دونوں میں اس کا بڑا لحاظ رکھتا ہوں کہ مطالعہ میں دماغ اور مشاہدہ میں دل پر ضربِ کاری نہ لگنے پائے۔ چنانچہ بہ یک نظر میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ چند در چند مصروفیتوں اور ان سے زیادہ معذوریوں کی بنا پر پولیس کے دنگل میں بہ طور اُمیدوار شریک نہیں ہوسکتا اور یہ اشتہار دینے والوں کا صریحی قصور ہے کہ وہ ایسا اشتہار دیں جو مجھ پر میرے بہت سے بھائی بندوں پر صادق نہ آئے۔ باوجود اس کے کہ میں اور میرے بہت سے بھائی بند ''اشتہاری'' ہونے اور بننے کی استعداد بھی رکھتے ہیں اور حوصلہ بھی!

میں اسے لیتھو کا کمال سمجھتا ہوں کہ اس کے ذریعہ اور صرف اسی کے ذریعہ ہندستانی پہلوانوں کی ایسی عدیم المثال شبیہیں ہم کو نظر آجاتی ہیں جن کے سر پر سینگ اور بازوؤں پر پر لگا دیے جائیں تو وہ پولیس کے دنگل سے راجہ اندر کے اکھاڑے میں پہنچ جائیں۔ گم شدہ عزیزوں کے بعض اشتہارات اور تصویروں کو مطالعہ کرنے کے بعد میں عموماً اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ پس ماندگان کو ان کی بازیافت کی زیادہ فکر نہیں ہے اور بفرضِ محال فکر ہے تو میں نہیں وہ غلطی پر ہیں۔ گم شدہ عزیزوں کی بھی تین اقسام ہیں، بچے، نوجوان اور بوڑھے۔ بچوں کے بارے میں مجھے کچھ نہیں کہنا ہے، نوجوانوں کی میں تعریف کروں گا، یا جیسا کہ انگریزی کا ایک محاورہ ہے میں ان کے اعزاز میں اپنی ٹوپی یا آپ کی پگڑی اُتارلوں گا بشرطیکہ کم سے کم میں نے کوئی ایسی اشتہاری دوانہ استعمال کی ہو جس کا تعلق بالوں کے عدم یا وجود سے ہو۔ نوجوانی کھوئے جانے کا زمانہ ہے اور بجائے خود کھوئے جانے کا اعلان یا اشتہار ہے جسے عقل کی پاس بانی راس نہیں آتی اور پولیس کی

[1] سہی: ٹھیک، بجا، درست۔

نگرانی اور سرگردانی مبارک ہوتی ہے۔ بوڑھوں کے کھوئے جانے پر البتہ مجھے سخت اعتراض ہے۔ ان کی تلاش میں سرگرداں ہونا بے وقوفی اور بدمذاقی ہے۔ یہ کھوئے کب جاتے ہیں کہ ان کی تلاش کی جائے، لیکن بعض ناگفتہ بہ وجوہ کی بنا پر مجھے بوڑھوں سے ایک نسبت خاص ہے اس لیے میں ان کو مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ ان کے لیے دو بڑے خطرے ہیں ایک اشتہاری ادویات، جن میں حیرت انگیز خضاب اور بال اُگاؤ تیل بھی شامل ہیں اور دوسرے اشتہاری بیویاں۔ رہا یہ کہ اشتہاری ادویات اور اشتہاری بیویوں میں کون کس کا نتیجہ ہے یہ بوڑھوں کے طے کرنے کی بات ہے۔

بچپن میں مجھے ہیچم صاحب کی گولیوں کے اشتہار سے بڑی دلچسپی تھی۔ طفلی کی جہاں بہت سی رنگینیاں ختم ہوئیں وہاں ہیچم صاحب کی گولیوں کا اشتہار بھی مجھے داغ دے گیا۔ اُس زمانہ میں مجھے انگریزی آتی نہ تھی اور اردو املا کی اصلاح کی تحریک شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہیچم صاحب کے نام کو ہر طرح سے پڑھتا تھا الا ہیچم پڑھنے کے۔ میں نے اپنے مولوی صاحب سے پوچھا تو اوّل تو انھوں نے اس سے اختلاف کیا کہ میں اسٹیشن جاؤں اس لیے کہ کیا معلوم کسی دن انجن کا نشانہ غلط بیٹھے اور پٹریوں پر چلنے کے بجائے پلیٹ فارم پر دوڑ پڑے، دوسرے یہ کہ اسٹیشن پر نامحرم تصاویر ہوتی ہیں۔ ایک دن انہی گولیوں کا اشتہار ایک اردو اخبار میں نظر آیا۔ میں نے مولوی صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ پہلے تو غور سے سارا اشتہار پڑھ ڈالا اس کے بعد بولے اس میں کیا قباحت ہے؟ یہ دیکھو لکھا ہے کہ مروڑ کی دوا ہے۔

میں نے کہا مروڑ کی دوا؟

مروڑ کو فارسی میں کہتے ہیں پیچش۔

میں نے کہا پیچش؟

اس کا مصدر ہے پیچیدن

میں نے کہا پیچیدن؟

پیچیدن سے پیچم۔

میں نے کہا پیچم؟

بولے۔ بس پیچم صاحب کی گولیاں۔

پھر نہایت فاتحانہ، لیکن ہمدردانہ انداز سے بولے آخر اس میں دقت کیا تھی؟ تم کیا پڑھتے تھے؟

میں نے کہا میں بھی قریب قریب یہی پڑھتا تھا۔

بولے آخر میں بھی تو سنوں!

میں نے کہا میں تو اس کو نجم پڑھتا تھا۔

بولے یہ بھی صحیح ہے، بعض نسخوں میں یوں بھی آیا ہے۔

عرصہ ہوا ایک اردو جنتری میں، میں نے نوشیروانی خضاب کا اشتہار پڑھا تھا۔ ایک بہت ہی چوڑا چکلا رعب دار چہرہ اور اس سے زیادہ چوڑی چکلی گھنی داڑھی، نصف سیاہ اور نصف سپید، جیسے جغرافیہ کی کتاب میں زمین اور سورج کے مقامات بتا کر دن اور رات کا ظہور دکھایا جاتا ہے۔ میں نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ نوشیرواں کا دارومدار تمام تر داڑھی پر تھا۔ البتہ یہ طے نہ کر سکا کہ داڑھی کا مدار نصف سیاہ اور نصف سپید پر تھا یا عدل پر!

لکھنؤ کے سب سے آباد اور پُر رونق بازار میں ایک دن ایک شخص نظر آیا۔ لمبی گھنی داڑھی، آدھی بالکل سیاہ اور آدھی بالکل سفید دونوں ہاتھوں سے باری باری نصف داڑھی کو دائیں بائیں جنبش دیتا چلا جاتا تھا اور کہتا یہ جاتا "پہلے ایسی تھی، اب ایسی ہے، پہلے ایسی تھی اب ایسی ہے۔" لڑکوں اور بے فکروں کا ایک ہجوم ساتھ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی قومی جلسے میں کوئی گھن گرج رزولیشن پاس کیا جا رہا ہو۔

ہم کو یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں ایک نیکی کی جائے تو آخرت میں ستر نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ یہ تو میرا عقیدہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا تجربہ یہ ہے کہ آخرت میں ایک گناہ کرنے سے دنیا میں ستر سے کہیں زیادہ عذاب اُٹھانے پڑتے ہیں۔ یہ باتیں یقیناً میرے لاشعور میں رہی ہوں گی کہ ایک بار میں نے اپنے زمانۂ بے شعوری میں رنگین پتنگی کاغذ پر ایک اشتہار چھپا ہوا دیکھا۔ یہ ایک گھڑی کا اشتہار تھا اس میں یہ بشارت دی گئی تھی کہ ایک گھڑی خریدنے پر بارہ نادر تحفے بطور ہدیہ پیش کیے جائیں گے، جن کی فہرست باتصویر بھی دی گئی تھی۔ آپ کو تو معلوم ہے بچپن اور زمانۂ جنگ میں شریفوں کے گھر میں روپے پیسے کا کیا کال یا کنٹرول ہوتا ہے۔ معلوم نہیں کن

مصیبتوں سے میں نے گھڑی کے دام اکٹھے کیے اور اشتہار کو چھپائے رکھا کہ کہیں دوسرے اس سے نہ فائدہ اُٹھالیں اور میں بے وقوف بن جاؤں۔

گھڑی آئی، تحفے بھی ملے۔ ایک سے ایک بڑھ کر۔ گھڑی کا کمال یہ تھا کہ آپ پر کوئی وقت ہو وہ صرف ایک ہی صحیح وقت بتاتی تھی۔ تحائف کا یہ عالم تھا کہ ان کو دیکھ کر عشق اور برسات اس درجہ پر پہنچ گئی تھی جہاں پر اس طرح کی گھٹا چھا جاتی ہے جو ''کھلتی ہے نہ برستی ہے۔'' اتنے میں نیچے سے ایک ڈراؤنی آواز آئی یہ چوری کہاں کی؟'' نتیجہ میں سزا بھگتنی پڑی۔ اُسی دن سے اس دنیائے دُنی کا قائل ہو گیا جہاں چوری کرنے اور لوٹے جانے میں تفریق نہیں کی جاتی۔

میں نے اشتہارات کا مطالعہ کافی کیا ہے۔ ہندستانی اشتہارات کا اور ہندوستان سے باہر کے اشتہارات کا بھی۔ ہندستانی اشتہار میں ہندستانی شاعری اور ہندستانی غیر ذمہ داری کا رنگ جھلکتا ہے۔ ہمارے اشتہار دینے والے اپنے مال کی خوبی پر اتنا بھروسہ نہیں رکھتے جتنا ہماری آپ کی سادہ لوحی، اوہام پرستی اور مشاعرہ دوستی پر۔ ولایت کے مشتہرین نے کاروبار کی دنیا میں اپنے مال کی خوبی اور اپنی کاروباری امانت و دیانت کا سکّہ بٹھا رکھا ہے اُن کا مال اور ان کا اشتہار دونوں مستند۔ ہم ولایت کی اقوام کے بارے میں ممکن ہے اچھی رائے نہ رکھتے ہوں، لیکن اس بدنام ترین قوم کی مصنوعات کے بہترین ہونے کا اقرار کرنے پر مجبور ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یورپ اپنے تجارتی مال اور تجارتی ساکھ کی اتنی ہی حفاظت و احترام کرتا ہے جتنا کبھی ہم اپنے مذہب و اخلاق کا کرتے تھے۔ کاروبار کے معاملے میں ان کا شخصی اور اجتماعی اخلاق ہم سے کہیں بلند ہے۔ ہم کاروبار شروع کرتے ہیں تو پہلے خریدار کو آخری خریدار قرار دے کر اسی سے سارا نفع وصول کر لینا چاہتے ہیں۔ برخلاف ولایت والوں کے جو اپنے خریدار کو اپنا سرمایہ بھی سمجھتے ہیں اور اپنا اشتہار بھی اور کسی خریدار کو اپنا آخری خریدار نہیں سمجھتے۔

ہم اشتہار دیتے ہیں تو سارا زورِ قلم پر دیتے ہیں، وہ زور بھی جو ایمان پر دینا چاہیے تھا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سارے ملک کو کٹ مرنے یا بغلیں بجانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر گویا مشاعرہ کے لیے'' کلام بلاغت التیام''[1] تصنیف فرما رہے ہیں۔

---

1. آپس میں مل جانا، میل ملاپ، زخم کا بھر آنا۔

یہ باتیں تو ہوئیں ہمارے آپ کے اشتہارات سے متعلق جن میں بہت سی چھوٹ گئیں، بعض ایسی تھیں جن کا تذکرہ نزاکت یا خطرے سے خالی نہیں۔ اب میں آپ سے پوچھوں گا کیا آپ نے کبھی ان اشتہارات کا تصور بھی کیا ہے جو زمان و مکاں کے بے پایاں، بے پناہ، بے نام و نشان، باہمہ و بے ہمہ وراء الوراء لا ولاّ میں نظر آتے ہیں۔ محسوس یا محسوب ہوتے ہیں جن میں کبھی ہم سب کچھ ہوتے ہیں اور کبھی کچھ بھی نہیں جن میں ہر حقیر عظیم اور ہر عظیم ہیچ، جسے انسان نے دریافت کیا، جس میں انسان کھو یا گیا اور جس میں انسانیت برافگندہ نقاب ہوگی۔

ہولناک جنگیں، سیلاب، وبائیں، قحط، حسد، فریب، ظلم، ہوس ایک طرف دوسری طرف عظیم الشان قربانیاں، برگزیدہ حوصلے، بے پایاں عمل، عمل و عقل، حسن و عشق کارفرما نظر آتے ہیں۔ یہ کس کے اشتہارات، کس کی شہادتیں اور کس کی نشانیاں ہیں ہم ان کی کس طرح تعبیر کرتے ہیں۔ کیوں کرتے ہیں؟ اور کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں؟

تاریخوں کے اوراق، فطرت کے مظاہر، صنادید کے آثار، سائنس کے انکشافات، عقل و عقائد کی کش مکش، فن کی عظمتیں، لاف دانش نفع عبادت، اللہ کی کتاب، انسان کا حاشیہ، یہ سارا عالم ایک بے پایاں، گراں مایہ، مستقل اور مستند اشتہار ہے۔ کیوں؟ کس کا؟ کس لیے؟ یہ آپ بتائیں!

(مطبوعہ: نگار۔ لکھنؤ، مئی 1950)

●●●

کبھی آپ نے سوچا — آپ کتنا سچ بولتے ہیں؟

کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ آپ کتنا سچ بولتے ہیں؟ یہ سوال ارباب ریڈیو نے مجھ سے کیا ہے۔ کاش یہی سوال میں ان سے کرسکتا۔ یہ خواہش میرے دل میں صرف آپ کے خیال سے پیدا ہوئی ہے اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ ان کا جواب میرے جواب سے کہیں زیادہ آپ کی تفریح کا باعث ہوتا۔ اردو کے ایک مشہور انشاپرداز نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ ان کو عقبیٰ سے صرف اتنی دلچسپی تھی کہ وہ قرۃ العین کے قاتلوں کا حشر[1] دیکھنا چاہتے تھے۔ میں عقبیٰ کا قائل ہوں ممکن ہے آپ میں بھی ایسے ہوں، لیکن میں اس دنیا کا بھی کچھ کم قائل نہیں ہوں اس لیے کہ میں اور ارباب ریڈیو دونوں اپنا اپنا حشر یہیں دن رات دیکھا کرتے ہیں بغیر اس بحث کو چھیڑے کہ ہم دونوں میں کون کتنا سوچتا ہے اور کتنا سچ بولتا ہے۔

آج کے سوال کا سیدھا جواب تو یہ ہے کہ سچ بولنے میں سوچنے کی کب ضرورت ہے اس طرح کا تکلف یا اس قسم کی عبادت تو جھوٹ بولنے میں کرنی پڑتی ہے۔ قانون میں آیا ہے کہ آپ کسی ایسے سوال کا جواب دینے پر مجبور نہیں کیے جاسکتے جس سے آپ کے کسی جرم میں ماخوذ ہوجانے کا اندیشہ ہو۔ قانون سے میری واقفیت بالکل واجبی سی ہے، لیکن افواہاً یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اگر آپ فوج داری کے کسی مقدمہ میں ماخوذ ہوں تو اپنا بیان عدالت فوج داری کے

---

1. ملاحظہ کیجیے محشرِ خیال از سجاد انصاری مرحوم۔

بجائے عدالت سیشن کے لیے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ ممکن ہے یہ اس لیے ہو کہ آپ زیادہ سوچ کر جواب دے سکیں۔ میں اس رعایت سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا۔ میں اپنا بیان ابھی اور یہیں دوں گا۔ اسی کی ایک نقل عقبی کو چلی جائے گی مجھے نہیں معلوم ارباب ریڈیو عقبیٰ کے قائل ہیں یا نہیں۔ غالباً عقبیٰ کو ان سے دلچسپی ضرور ہوگی۔ آپ کو یاد رہے تو آپ ان کے بیانات وہیں پڑھ لیجیے گا۔

آج کا سوال بجائے خود ایک طرح کا دلچسپ الزام ہے، لیکن ریڈیو عدالت فوج داری نہیں ہے۔ یہاں آپ گفتگو کرنے پر مجبور ہیں۔ بعض مواقع پر چپ رہنا ایک سانحۂ عظیم کی صورت اختیار کر لیتا ہے میں اس خطرے سے خواتین کو خاص طور پر آگاہ کر دینا چاہتا ہوں بالخصوص اگر ان کی شادی کا مرحلہ درپیش ہو۔ بعضوں کے ہاں یہ طریقہ ہے کہ ایجاب قبول کے موقع پر عورت چپ رہے یا رو پڑے تو اسے اس کی رضامندی سمجھا جائے گا۔ میں اس طریقہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اتنا البتہ جانتا ہوں کہ عورت کا چپ رہنا یا رونے سے باز رہنا دونوں ناممکنات سے نہیں تو حادثہ ضرور ہیں جس کا توڑ شاید شادی ہی کر دینے سے کیا جا سکتا تھا۔ بہر حال آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ریڈیو پر نہ خاموش رہنے دیا جاتا ہے نہ رو پڑنے کی اجازت ہے، اور یہ پابندی عورتوں پر ہی نہیں مجھ پر بھی ہے۔

جو لوگ اس جہان سے رخصت ہو چکے ہیں ان میں سے بعض کے بارے میں رہ رہ کر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش میں ان کی زندگی میں ان سے مل سکتا۔ ان میں سے وہ بزرگ بے اختیار یاد آتے ہیں جو اس دنیا میں سب سے پہلے جھوٹ بولے ہوں گے غور تو کیجیے کتنا بڑا فن دریافت کر کے رکھ دیا۔ جس سے کتنے "برائے"، قسم کے فن برآمد ہوئے یا ہوں گے۔ معلوم نہیں پہلے انھوں نے سوچا اور پھر جھوٹ بولے یا جھوٹ بولنے کے بعد سوچ میں پڑ گئے۔ یہ بھی نہیں معلوم مرد تھے یا عورت خدا رسیدہ تھے یا فاقہ زدہ ادویہ بیچتے تھے یا ایمان، آرٹ قبل انسان کے قائل تھے یا انسان قبل آرٹ کے۔ اس لیے کہ مجھے آرٹ کے بعض نمونے ایسے بھی نظر آئے ہیں جو انسان کے ظہور سے پہلے کے معلوم ہوتے ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جن کی قدر شاید انسان کے ختم ہو جانے کے بعد کی جائے۔

پھر یہ دریافت کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان کا حلیہ کیا رہا ہوگا کیا پیشہ تھا کس رسم خط میں کھاتے پیتے، جیتے جاگتے تھے۔ مہنگائی پاتے تھے یا پیدا کرتے تھے۔ شادی اور شاعری کے بارے میں ان کے عقائد یا اعمال کیا تھے۔ شادی برائے شاعری کرتے تھے یا شاعری برائے شادی۔ پیشہ معلوم کر لینے کے بعد حلیہ معلوم کر لینا آسان ہو جاتا ہے۔ مثلاً پیٹ بڑا اور لباس میلا ہوا تو لیڈر اور پیٹ خالی اور بال بڑھے ہوں تو شاعر۔ لیڈر رفتہ کی خاطر جھوٹ بولتا ہے۔ شاعر فن کی خاطر اور ہم آپ پیٹ کی خاطر۔ لیڈر لیڈر ہی رہتا ہے۔ شاعر بھیک مانگنے لگتا ہے اور ہم آپ جیل خانے چلے جاتے ہیں۔ سوچیے تو بقول شخصے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے، لیکن آج تک کسی کے ذہن میں یہ بات نہ آئی کہ ڈوب مرنے یا کسی طرح مرنے کے لیے سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایسے مواقع پر سوچنا بڑا مضر ثابت ہوا ہے سوچے گا تو مرنے پر کیسے راضی ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ بعض لوگ سوچتے ہی سوچتے سُر گباش ہو جاتے ہیں اس سے اتنا تو ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ سوچنے کا مرحلہ اسی دنیا میں طے کر لیتے ہیں۔ اب یہ آپ بتائیں کہ آخرت میں وہ سچ بولتے ہوں گے یا جھوٹ ممکن ہے آپ سرے سے آخرت ہی کے قائل نہ ہوں پھر تو آپ کو بے سوچے بھی جواب دینے میں تامل نہ ہوگا۔

بیسویں صدی میں دنیا کی دو سب سے بڑی لڑائیاں لڑی گئیں۔ ایٹم بم کے دریافت ہو جانے سے اس کا بھی اطمینان ہو گیا کہ تیسری جنگِ عظیم بھی کچھ دور نہیں۔ تیسری جنگ میں بھی کوئی نہ کوئی ایسی ایجاد ظہور میں آجائے گی جس سے چوتھی جنگِ عظیم متعین ہو جائے گی۔ ممکن ہے کوئی ایسا گر ہاتھ لگ جائے جس سے جنگ ختم ہی نہ ہو پائے۔ چنانچہ ابھی سے یہ سوچا جانے لگا ہے کہ آئندہ جنگوں کو زیادہ یقینی بنانے کے لیے جلد سے جلد صلح کر لی جائے۔ صلح کرنے کے لیے آخر گروہ بندی کے کیا معنی! دیکھا یہی گیا ہے کہ قومیں اور حکومتیں جس بے جگری سے اور جس پیانہ پر ایک دوسرے کو ہلاک کرتی ہیں اس بے جگری اور اس پیانہ پر صلح کے لیے آمادہ نہیں ہوتیں جھوٹ البتہ بولتی ہیں۔ گول میز کانفرنس میں بیشتر سے میدانِ جنگ ہی کے ہوتے ہیں اور اراکین پوری کوشش اس کی کرتے ہیں کہ وہ جتنا کم سچ بولیں اس سے کہیں زیادہ ہم آپ اسے سچ سمجھیں۔ لڑائی میں ''سچ'' سب سے پہلے ہلاک ہوتا ہے صلح میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ کہیں پھر سے وہ زندہ نہ ہو جائے۔

جھوٹ یا سچ بولنا اب اس پر نہیں رہا کہ جھوٹ بولنا بُرا اور سچ بولنا اچھا ہے۔ سائنس اور نفسیات نے اس بات کے ثابت کرنے کی مسلسل کوشش کی ہے اور کامیابی ہوئی ہو یا نہیں ہمارے ذہن میں یہ بات بیٹھنا ضروری ہے کہ انسانی زندگی میں ثواب کا جواز ہو یا نہ ہو گناہ کا جواز موجود ہے۔ گناہ کا کوئی جواز نہ تھا جب کوئی گناہ سے باز آتا تھا۔ اب جب کہ گناہ کا جواز موجود ہے تو پھر گناہ کی لذت سے بہرہ یاب کیوں نہ ہوں۔ جھوٹ یا سچ بولنے کا مدار اب تمام تر اس پر رہ گیا ہے کہ نفع کہاں ہے۔ جہاں نفع ہے وہاں جھوٹ سچ کا جھگڑا کوئی مول نہیں لیتا۔ یہ بات میں نے بے وقوفوں جیسی کہہ دی اس لیے کہ اس طرح کی باتیں تو چھپی ہوئی کتابوں میں مل جاتی ہیں اور تعلیم بالغان کے کورس میں داخل ہیں۔ یہ مرا قصور نہیں، سوچنے کا قصور ہے سوچ کر کہیے اور اتفاق سے کوئی معقول بات کہہ جایئے تو لوگ کہتے ہیں کھوسٹ ہے اور بے سوچے کہیے تو ترقی پسند قرار دیتے ہیں۔ ایک پوزیشن اس کے بین بین ہے یعنی کھوسٹ ترقی پسند یا ترقی پسند کھوسٹ اب سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ بات میں نے سچی کہی ہے، لیکن یہ ہے محض اتفاقیہ حادثات اتفاقیہ ہی ہوتے ہیں۔

نیوٹن نے زمین پر سیب گرتے دیکھ کر جس طاقت کا انکشاف کیا تھا وہ آپ کو معلوم ہے اس انکشاف نے فکرِ انسانی کی ترقی میں جو حصہ لیا اس کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ جس کسی نے جھوٹ دریافت کیا ہوگا اس کا ہماری زندگی پر کتنا بڑا احسان ہے بعض دوائیں امراض کو دور نہیں کرتیں، لیکن ان کی شدت کو بہت کم کر دیتی ہیں۔ یہ دوائیں بذاتِ خود کوئی اچھی چیز نہیں ہوتیں۔ پھر بھی ان کا نعمت ہونا مسلّم ہے۔ بعض مواقع پر جھوٹ کا کام یہی ہوتا ہے دوسروں ہی سے نہیں ہم اکثر اپنے آپ سے بھی جھوٹ بولتے ہیں اس طرح کا جھوٹ بولنا جتنا مضر ہو سکتا ہے اتنا ہی مفید بھی۔ اس کا تمام تر انحصار بولنے والے کی شخصیت پر ہے۔

طبیب، سپہ سالار، معلّم، احباب اور اعزّا اپنی اپنی جگہ پر مواقع کے لحاظ سے جھوٹ بولتے ہیں اور نفع پہنچاتے ہیں۔ بعض امراض کا علاج ہی جھوٹ سے کیا جاتا ہے آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ آپ کے دل میں اپنے بہترین احباب یا اعزا یا کسی دوسرے کے متعلق جو خیالات

یا جذبات کبھی کبھی پیدا ہو جاتے ہیں اگر ان کا اظہار آپ جوں کا توں کر دیں تو کیسی قیامت برپا ہو جائے۔ آپ نے وہ لطیفے تو سنے ہوں گے جو ایسے لوگوں سے منسوب کیے جاتے ہیں جو باواز بلند سوچنے کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔

مگر معاف کیجیے آپ کو تو یہ سننا ہے کہ میں یا آپ دن بھر میں کتنا جھوٹ بول ڈالتے ہیں، لیکن چاہتے یہ ہیں کہ ان کو سچ سمجھا جائے۔ اچھا وہ دیکھئے میرے محلّہ کے مولوی صاحب چلے آرہے ہیں جن کے ایک ہاتھ میں ان کے صاحبزادے کا اور دوسرے میں ان کی بکری کا کان ہے۔ قریب پہنچ کر انھوں نے فرمایا۔ ''السلام علیکم'' میں نے بڑے ادب اور خلوص سے رحمۃ اللہ برکاتہٗ کے اضافہ سے ان کا جواب دیا۔ ''وعلیکم السلام''۔ مزاج بھی پوچھا اور ان کے لختِ جگر اور بکری دونوں کی شفاعت بھی کی، لیکن خون کا گھونٹ پی کر۔ ان کی بکری اور ان کے نورِ نظر میرے باغ کو دن بھر تباہ کرتے رہے اور خود مولوی صاحب نے اللہ کے نام پر چندہ اور قرض لے کر مجھے زیر بار کر رکھا ہے، لیکن میں بھی کیا کروں۔ میں الیکشن میں کھڑا ہونا چاہتا ہوں مولوی ناخوش ہو گیا تو مجھے ووٹ کون دے گا، اور میں بھی بندہ بشر ہی جو ٹھہرا اور محلّہ میں، میں نے کہیں زہرِ عشق پڑھنا پڑھانا شروع کیا تو مولوی صاحب کے ہاتھوں میرا کیا انجام ہوگا۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولوی صاحب سے مجھے کس درجہ عشقِ مجازی یا بغضِ حقیقی ہے۔

مولوی صاحب ابھی پورے طور پر دور نہیں ہوئے تھے کہ ایک فقیرنی آ گئی جس کی گود میں ایک سوکھا سا بچہ ہے۔ میں نے یہ کہہ کر کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے اسے ٹالا اور مزید اصرار پر جھڑک دیا حالاں کہ میرا خیال ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس سے کوئی بھکاری کچھ مانگے اور دینے کے لیے اس کے پاس تسلّی کے کلمات تک نہ ہوں۔ فقیر اور درماندہ سے لوگ ضرور جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ فقیر اور درماندہ بھی جھوٹ ہی بول رہے ہوں آپ تو جانتے ہیں دنیا میں جھوٹ ہی وہ تفریح ہے جو ہر شخص کے لیے ارزاں ہے۔

میں اپنے مکان کے اندر ایک بڑے ضروری یا دلچسپ کام میں مصروف ہوں اور چاہتا ہوں جلد از جلد اسے انجام دے لوں۔ باہر سے آواز آئی جسے میں پہچان گیا اور آنے والے کا مطلب بھی سمجھ گیا۔ آج کا پورا دن ضائع ہو گیا تن بدن میں آگ لگ گئی۔ پہلا غصہ گھر والوں پر

اُتارا۔ نہ یہ سب زندہ ہوتے نہ یہ شخص اس وقت یہاں آپڑتا۔ آنے والے کی شان میں کچھ ایسے سہل ممتنع کلمات کہے جو گھر والوں پر خود مجھ پر اور آنے والے سبھی پر "لاگو" ہوتے تھے۔ لاگو کا استعمال میں صرف اس طرح کے مواقع پر گوارا کرسکتا ہوں۔ ہاتھ پاؤں گردن کو جھٹکتا اور سمجھانے والوں کو جھڑکتا کہ آنے والے کا خون پہلے پی لوں گا۔ بات اس کے بعد کروں گا۔ اب مکالمہ سنیے:

(اُدھر سے) "آداب بجالاتا ہوں حضور۔"

(ادھر سے جلد سے جلد گلا صاف کرتے ہوئے) "کورنش عرض ہے بندہ پرور۔"

(دونوں بغل گیر ہوجاتے ہیں)

"بھئی ناوقت تو نہیں آیا؟"

(خون کا گھونٹ اُتارتے ہوئے "نابکار") واہ جناب، آپس میں یہ تکلفات۔"

"نہیں یار نہیں۔ مجھے معلوم ہے تم ملنے والوں سے گھبراتے ہو۔"

(دل میں "نابکار") زبان سے "توبہ، توبہ یہ آپ کیا فرمارہے ہیں۔" بے خبری میں "اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے۔"

(اُدھر سے) "شکریہ۔ شکریہ۔ تم سے مجھے ہمیشہ یہ اُمید رہی تو بھئی بات کو طول دینے سے کیا فائدہ! اس وقت سوروپے کی ضرورت ہے۔"

(دل میں "ملعون") زبان سے "برادرمن خیریت تو ہے۔ سوروپے کی ایسی کوئی بات نہیں۔" اس کے بعد دو گھنٹے تک راز و نیاز ہوتا رہا۔ تفصیل کسی اور موقع پر سنیے گا۔ سوروپے صاف نکل گئے۔

بات یہ ہے کہ یہ شخص کچھ ادب برائے زندگی قسم کا ہے اور میرے مشاغل ادب لطیف جیسے ہیں۔ اگر یہ کسی دن مجھ پر چڑھ دوڑا تو مجھے عدالت تک جانا اتنا ہی شاق ہوگا، جتنا اس کو جیل خانہ چلے جانے کا شوق ہے۔ معلوم نہیں یہ کب مجھے کس آرڈی ننس کی زد پر لا کھڑا کرے۔ اس لیے مقتول ہونے کے باوجود مترحم شاہی کی درخواست کرتا رہتا ہوں۔

امتحان کا پرچہ ختم کرکے طالب علم ہال سے برآمد ہوئے۔ فرض کر لیجیے آج کا پرچہ میرا تھا۔ لڑکوں کی ایک بڑی تعداد گھیر کر کھڑی ہوگئی سوالات کے جوابات کی تصدیق چاہتے ہیں۔

مختلف لڑکوں نے مختلف جواب دیے ہیں۔ صحیح جواب ظاہر ہے ایک ہی ہوگا۔ ان میں سے ہرایک یہی چاہتا ہے کہ میں اس کے جواب کو صحیح بتادوں اور وہ اطمینان سے اپنے گھر کے راستہ لے۔ جوابات پوچھنے میں ان طالب علموں کے خوف اور اُمید کے جزرومد کا لحاظ رکھیے اور یہ مکالمہ سنیے:

پہلا طالب علم: ''اس سوال کا جواب یہی ہوگا نا؟'' (جواب غلط ہے)

میں عرض کرتا ہوں: ''بھئی جواب دینا اکثر اتنا اہم نہیں ہوتا جتنا محنت اور مستعدی سے امتحان دینا۔ میں دیکھ رہا تھا تم بڑے انہماک سے جواب لکھ رہے تھے۔ حال ہی میں یونیورسٹیز کمیشن نے امتحان کے موجودہ طریقوں پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور بتایا ہے کہ امتحان طالب علم کی قابلیت کا حقیقی معیار نہیں ہوتا۔''

دوسرا طالب علم: ''میں نے تیسرے سوال کا یہ جواب دیا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟'' (جواب غلط تھا)

میں عرض کرتا ہوں: ''اور کیوں جناب آپ نے رول نمبر بھی صحیح لکھا ہے یا نہیں، اور آپ کو تو یاد ہوگا میں نے آپ کا ٹٹوریل دیکھ کر کتنی تعریف کی تھی۔ آج آپ کا پرچہ بہتوں سے اچھا ہوا ہوگا۔ میں اس وقت تک کچھ نہ بتاؤں گا جب تک کہ جواب نہ دیکھ لوں۔ بعض مرتبہ جواب غلط ہوتا ہے، لیکن اُمیدوار کے لکھنے کا انداز اتنا دل نشیں ہوتا ہے کہ غلطی غلطی نہیں معلوم ہوتی۔''

تیسرا طالب علم: ''فلاں سوال کا جواب میں نے یہ دیا ہے۔'' (یہ بھی غلط ہے)

میں فرماتا ہوں: ''بھئی جوابات کی کچھ نہ پوچھو۔ بعض لڑکے غلط لکھنا شروع کرتے ہیں، لیکن ختم کرتے کرتے صحیح بات لکھ جاتے ہیں کبھی بالکل اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں بہ حیثیت مجموعی ان کے نمبر گھٹا بڑھا دیے جاتے ہیں۔''

چوتھا طالب علم: ''جناب میں نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے (''ایک آواز'') ''بالکل غلط! فلاں کتاب کی رو سے۔''

میں: ''نہیں۔ یہ بات یوں نہیں ہے۔ کتابوں میں مختلف نقطۂ ہائے نظر دیے ہوتے ہیں۔ آپ نے جو کچھ لکھا ہوگا، ممکن ہے وہ غیر متعلق ہو۔ غلط نہ ہو۔''

پانچویں صاحب: ''کیوں صاحب۔ فلاں سوال کا جواب میں نے یہ لکھا ہے۔ صحیح ہے نا؟''
(یہ جواب غلط سے بھی کچھ زیادہ چیز ہے) بقیہ لڑکوں نے قہقہہ لگایا۔ اُمیدوار سے زیادہ میں گھبرا گیا۔ میں نے اپنے آپ کو جلد ہی سنبھالا اور کہنے لگا:
''جناب

ہنسی کے ساتھ یاں رونا بھی ہے مثلِ قُلقُلِ مینا۔''

اُمیدوار سے، دیکھئے آپ کے جوابات کے بارے میں علی الحساب کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آج شام کو آپ میرے ہاں چائے پیجئے۔ اس وقت سارے جوابات پر غور کرسکوں گا۔''

اب تک میں جو کچھ کہہ سکا ہوں اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں کہاں تک سوچ سکا ہوں اور کتنا سچ بول سکا ہوں، لیکن آپ بھی کیا کریں جب آپ خود یہ چاہتے ہوں کہ سچ سنیں تو جھوٹ سمجھیں اور جھوٹ سنیں تو سچ سمجھیں۔ اس میں نہ آپ کا قصور ہے نہ سچ یا جھوٹ کا۔ یہ کچھ آرٹ، اُسلوب یا انداز قسم کی چیز ہے، جس پر گفتگو کرنی ہمارے آپ کے بدی نہ تھی اور نہ ہے۔ اس لیے خدا حافظ!

(نشریہ۔ 21 ر اکتوبر 1950۔ مطبوعہ شعاعیں، دہلی، سالنامہ 1950)

●●●

عہدِ حجر سے سائنس اور ٹکنالوجی کے عہد تک

''عہدِ حجر سے سائنس اور ٹکنالوجی کے عہد تک'' کا مسئلہ اب ''راہ از کجا است تا بہ کجا'' کا اتنا نہیں رہا ہے، جتنا ''من تو شدم تو من شدی'' کا ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ دونوں عہد ایک دوسرے سے اتنے علاحدہ نہیں رہ گئے ہیں، جتنا کہ خیال کیا جاتا ہے۔ عہدِ حاضر واضح طور پر سائنس اور ٹکنالوجی کا عہد ہے۔ بالخصوص دو عالمی جنگوں کے بعد سے یہ اور بات ہے کہ مغرب میں مشرق سے بہت پہلے سائنس اور ٹکنالوجی کا عہد شروع ہوا، لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ مشرق کے مذہب و اخلاق، شعر و ادب اور معیشت و معاشرت پر سائنس ٹکنالوجی کا تصرف جس طاقت اور تیزی سے بڑھ رہا ہے اُس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ دن شاید دور نہ ہو، جب مذہب و اخلاق اور شعر و ادب کو بھی الہام، ذوق یا وجدان کا نہیں بلکہ سائنس اور ٹکنالوجی کا فیضان قرار دینے لگیں۔ اس طور پر اختلافِ عہد کا جو تصور آج ہے کیا تعجب آگے چل کر بالکل بدل جائے۔ بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مذہب، معاشرت اور شعر و ادب کا موجودہ تصور پہلے سے بہت کچھ بدلا ہوا ہے اور یہ تصرف سائنس اور ٹکنالوجی کا ہے۔ مشرق یا غیر ترقی یافتہ ملکوں پر ترقی یافتہ مغربی قوموں اور حکومتوں کا تسلط فوجی طاقت اور بہتر ہمہ جہتی تنظیم سے ہوا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد یہ تسلط ختم ہونے لگا اور برابر ختم ہو رہا ہے، لیکن مغربی اقوام کی بجائے اب مغربی خیالات اور مغربی رسم و راہ نے ہم کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور دیکھنے میں یہ آ رہا ہے کہ مغرب کی یہ گرفت اُس

کے براہ راست فوجی تسلط سے کہیں زیادہ قوی اور دیرپا ہے اس لیے کہ وہ جسم پر تھی یہ ذہن پر ہے۔ اس کے علاوہ مغرب نے سائنس اور ٹکنالوجی میں اتنی زیادہ ترقی کر لی ہے اور زندگی کے تحفظ اور ترقی کے وسائل پر اس حد تک قابض ہے کہ اکثر یہ محسوس ہونے لگتا ہے، جیسے عہد ہی نہیں تقدیر کے اعتبار سے بھی، ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہوں۔

جس عہد میں اس وقت ہم ہیں وہ سائنس ٹکنالوجی کی برکتوں سے مالا مال ہے۔ برکت کا لفظ استعمال کرنے سے آپ بدگمان نہ ہوں۔ سائنس اور ٹکنالوجی بجائے خود گناہ نہیں ہے۔ گناہ ہمارا ہے کہ ہم سائنس اور ٹکنالوجی کے کارناموں کو انسان کے خیر و برکت کا ذریعہ بنانے کی بجائے ہلاکت اور فلاکت کا وسیلہ بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ کبھی ہوس کی بنا پر کبھی ہراس کے سبب سے!

گفتگو کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مذہب و اخلاق کا سائنس اور ٹکنالوجی سے کیا ربط اور رشتہ ہے۔ مذہب و اخلاق اور شعر و ادب کا سرچشمہ داخلی ہے، سائنس اور ٹکنالوجی کا خارجی! مذہب اور اخلاق کے ذریعہ ہم نفس کے نامبارک تقاضوں کو قابو میں رکھتے ہیں، اور اس کو سیدھے اور سچے راستے پر لاتے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے ہم فطرت کی قوتوں کو اپنی چاکری میں لیتے ہیں اور اس کی زیادتیوں کی روک تھام کرتے ہیں۔ انھیں داخلی اور خارجی قوتوں کا توازن وہ بہشت ہے جسے انسان نے کھویا ہو یا نہیں پایا اب تک نہیں ہے۔

مذہب و اخلاق کو سائنس اور ٹکنالوجی سے دور یا علاحدہ نہیں رکھا جا سکتا۔ دونوں کو ایک دوسرے کا حلیف رکھنا چاہیے، حریف نہ بنانا چاہیے، اس لیے کہ دونوں کا ایک دوسرے سے سازگار رہنا قرینِ فطرت ہے۔ انسان جب سے انسان ہوا اس کی ابتدائی ضرورتیں ایک طرف مذہب و اخلاق یعنی خوف و حیرت دوسری جانب، سائنس اور ٹکنالوجی یعنی زندگی کے شدائد سے بچنے اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھانے کی تدابیر سے پوری ہوتی رہیں۔ انسانی زندگی کا اوّلین عہد انہی دو غیر شعوری تصوّرات پر قائم تھا۔ اس میں شک نہیں کہ انسانی معاشرے میں مذہب کا عمل دخل زیادہ قوی اور زیادہ دنوں تک رہا۔ یہاں تک کہ آج بھی جب سائنس اور ٹکنالوجی کا غلبہ عالم گیر ہے، مذہب کی سیادت بڑی حد تک قائم ہے اور یہ انسان کے شرف و سعادت کی نشانی ہے۔ تہذیب کے اوّلین دور میں انسان غیبی یا انجانی طاقتوں سے خائف تھا۔ اُن کو موافق و مہربان

رکھنے کے لیے اُن کی طرح طرح سے پرستش کرتا تھا۔ آج اس کی نوعیت بدل چکی ہے۔ اب وہ اپنی خاطر نہیں بنی نوعِ انسان کی خاطر اُن طاقتوں سے کام لیتا ہے اور اُن کو ٹھیک راستے پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے جو انسان کی ذہنی، اخلاقی اور روحانی صلاحیتوں کو اُبھارتی اور نفس کے نامبارک میلانات کو دباتی ہیں۔

معلوم ایسا ہوتا ہے جیسے ابتدا میں فطرت کے جبر وقہر سے مغلوب ہوکر انسان نے مذہب کا سنگِ بنیاد رکھا ہو، لیکن بعد میں مذہب کے اجارہ داروں کے جبر وقہر سے تنگ آ کر اُس نے علم وحکمت کے دامن میں پناہ لی ہو۔ یوں بھی انسانی ذہن عرصہ تک قید وبند میں نہیں رکھا جاسکتا۔ چنانچہ انسان نے نادیدہ طاقتوں کا سہارا پکڑنے کے بجائے اپنی عقل، محنت اور حوصلہ مندی کا سہارا لیا اور سائنس اور ٹکنالوجی کے کرامات کی ابتدا ہوئی جو رفتہ رفتہ ہمارے ذہن اور عمل پر چھا گئے۔ یہ فیض، یعنی اصلاحِ دین، رینے ساں[1] یعنی احیائے علوم کا تھا جن کی ابتدا یورپ میں ہوئی۔ یہ تحریکیں مذہب کی اصلاح اور حکمت ودانش کے فروغ پر مبنی تھیں۔ ان کے اثرات جلد یا بہ دیر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔

علم ودانش کی بے محابہ وبے کراں ترقی نے زندگی کو اس درجہ سخت گیر اور عزّت وآسودگی سے گزر بسر کو اتنا دشوار کردیا ہے کہ لوگوں کے لیے مذہب واخلاق کے تقاضوں کی طرف توجہ کرنا ناممکن نہیں، بے حد مشکل ہوگیا۔ یہ سائنس اور ٹکنالوجی کا جبر وقہر ہے، لیکن ایسے آثار نظر آنے لگے ہیں کہ انسان اُن کی گرفت میں رہنے کے بجائے اُن کو اپنی گرفت میں لے لے۔ دشواری یہ ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی جس تیزی سے ترقی کرتی ہے، اُس سے بدرجہا سست رفتار سے اور مدت الایام میں مذہب واخلاق کا اثر عام طبائع پر ہوتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح حکومتیں اپنی حربی طاقت اور سیاسی اقتدار کو مستحکم رکھنا چاہتی ہیں اُسی طرح کسی نہ کسی تنظیم کے ماتحت افراد اور اقوامِ عالم کے ضمیر کو بیدار اور فعال رکھنے کے لیے اہتمام کیا جائے۔

صورت حال یہ ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی پر قومی اور ملکی وقار ہی کا نہیں ملکوں اور قوموں کی زندگی کا بھی مدار ہے۔ اس عہد میں سائنس اور ٹکنالوجی کے دیے ہوئے زبردست

---

1. Renaissance

اور مہلک ترین حربے دوسب سے طاقتور حکومتوں کے قبضے میں ہیں، اور تمام کمزور ملکوں اور قوموں کی عزّت، آسودگی اور ضمیر واقتدار کی پیروی کا مدار انھیں دونوں کے چشم وابرو کے اشاروں پر ہے اور یہ اچھا نہیں! سائنس اور ٹکنالوجی نے انسان کو بے شمار نعمتیں دی ہیں ایسی نعمتیں جو آج سے پہلے خواب و خیال میں نہ تھیں۔ امراض، افلاس، جہالت اور طرح طرح کی دوسری مصیبتیں بڑی حد تک دور ہوگئی ہیں، لیکن سائنس اور ٹکنالوجی کی آرائشِ خم کاکل سے "اندیشہ ہائے دور دراز" بہت بڑھ گئے ہیں۔ سائنس نے کبھی توہم پرستی کا قلع قمع کر دیا تھا، آج وہ خود ایک توہم بن گئی ہے۔ وہ حکومتیں یا اُن کے سائنٹسٹ اور ٹکنیشینس جنھوں نے ذرّوں کا دل چیرا یا مہر و ماہ پر کمندیں ڈالیں یا قیدِ مقام سے گزر گئے۔ جس وقت چاہیں خدا کی بستی کو چشم زدن میں خاک میں ملا دیں۔

لیکن مایوسی یا ہراس اس کی وجہ نہیں۔ اچھے اور بڑے لوگوں نے انسان کو شروع سے اب تک اتنی اچھی اور بڑی باتوں سے آشنا کیا ہے اور انسانیت کا ضمیر اس کی نہاد میں اتنا سرایت کر چکا ہے کہ وہ اپنی ہی زندگی کے لیے نہیں اُن اقدارِ عالیہ کے تحفظ و ترویج میں بھی کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھے گا۔ جو پیغمبروں، رشیوں، معلّمانِ اخلاق، مصلحانِ معاشرت اور اعلیٰ شاعروں اور فن کاروں نے اپنے اپنے طور پر اس کو سمجھائے سکھائے اور دلوں میں اُتار دیے ہیں۔ اگر خیر کی طاقتیں شر کی طاقتوں سے زیادہ معتبر و موثر نہ ہوتیں تو دنیا میں جیسے جیسے تہلکے آئے ان میں انسان نابود اور انسانیت معدوم ہو جاتی۔ سائنس اور ٹکنالوجی ہو یا مذہب و اخلاق اور شعر و ادب زندگی کے یہ سارے معظمات انسان کے لیے ہیں۔ اس لیے وہ اُن کی حفاظت و احترام میں ہمیشہ اپنی بہترین صلاحتیں صَرف کرتا رہے گا، اور ہر قیمت پر صَرف کرے گا جیسا کہ ہزاروں برس سے دیکھنے میں آرہا ہے۔ قدیم یا جدید یا یہ عہد اور وہ عہد، قصۂ دلیل کم نظری ہے۔

(پندرہ روزہ آواز، دہلی 1950)

●●●

بیوی

اگلے زمانہ میں جہاں کوئی بات سمجھ میں آئی لوگ عبادت کرنے لگتے تھے، اس کے بعد شعر کہنے لگے، اب لڑنے لگتے ہیں۔ یہ سب اس لیے کہ آدمی اپنے آپ کو دھوکا دیے بغیر جی نہیں سکتا، چاہے دھوکا اپنے آپ کو دیا جائے چاہے کسی دوسرے کو، چاہے وہ ادنیٰ درجہ کا دھوکا ہو چاہے اعلیٰ درجہ کا۔ غرض بغیر اس کے زندگی بسر نہیں ہوتی! کوئی دوسرا ہم کو دھوکا دے تو ہم بُرا مانتے ہیں، لیکن خود اپنے آپ کو دیں تو خوش ہوتے ہیں۔ جتنا بڑا دھوکا اپنے کو دیتے ہیں اتنا ہی زیادہ خوش ہوتے ہیں، جیسے کسی دوسرے کو دے رہے ہوں!

اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

یہ مصرعہ غالب اور ان کی شراب کا اتنا ترجمان نہیں جتنا ہمارا آپ کا، سب کا، جن میں کالا چور بھی شامل ہے۔

ہر شخص کی ہر خواہش دنیا کی کوئی طاقت پوری نہیں کرسکتی۔ جو شخص جتنا بڑا احمق یا نالائق ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ اپنی ہر خواہش کے پورا کرنے پر زور دے گا، لیکن دنیا میں کون ایسا ہے جو کسی نہ کسی حد تک یا کسی نہ کسی معاملہ میں احمق یا نالائق نہ ہو۔ میں تو دونوں ہوں۔ اس لیے عورت اور بیوی دونوں سے نباہ کرسکتا ہوں۔ پھر تھوڑا بہت احمق یا نالائق ہوئے بغیر:

"کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی!"

سوال اتنا بیوی کا نہیں ہے جتنا کہ عورت کا۔ مرد، عورت چاہتا ہے، بیوی پاتا ہے، کبھی بیوی چاہتا ہے عورت پاتا ہے، اور یہ دونوں باتیں ایک انتقام ہے جو سوسائٹی افراد سے یا افراد سوسائٹی سے لیتے ہیں۔ فرد اور سوسائٹی کی اسی آویزش و آمیزش سے زندگی کی گاڑی معلوم راستے سے نامعلوم منزل کو چلی جارہی ہے۔ کبھی چرخ چوں اور کبھی

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں![1]

اُس سفر پر جس کے

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

اتنی دیر تک اس طرح کی باتیں سننے کا کوئی متحمل نہیں ہو سکتا۔ جہاں نقاد بھی نعرے لگانے لگے ہوں وہاں شعر و ادب کی خیر کب تک کوئی منائے گا، اچھا چھوڑیے اس قصہ کو۔ آپ نے عورت کی تخلیق یا شانِ نزول کا ایک لطیفہ یا روایت تو سنی ہوگی۔ یعنی جب مرد وجود میں آگیا تو کچھ مدت بعد زندگی کی بے کیفی سے تنگ آکر برہما کے حضور میں حاضر ہوا اور اپنی زار و زبوں زندگی کا حال سنا کر فرمائش کی کہ اس کی تفریح و تسکین کا کوئی سامان پیدا کر دیا جائے۔ برہما کے پاس تخلیق کا کوئی سامان باقی نہیں رہ گیا تھا، اس لیے انھوں نے تمام موجوداتِ ارضی و سماوی سے تھوڑی تھوڑی چیزیں یا خاصیتیں اکٹھا کیں اور عورت کی تشکیل کر دی۔ مثلاً کسی سے رنگ، کسی سے روشنی، کہیں سے گرمی، کہیں سے گداز، کہیں سے شوخی، کہیں سے شگفتگی، کہیں سے بھولا پن، کہیں سے اوچھا پن، کسی سے تواضع، کسی سے تبختر[2]، کہیں سے نرمی، کہیں سے سختی، کہیں سے گرفت، کہیں سے گریز، کہیں سے دھوپ کہیں سے چھاؤں، کسی سے شفقت، کسی سے شقاوت، کہیں سے شرار کہیں سے شبنم، اور عورت کی شکل اور سیرت دے کر اس عجیب و غریب مجموعہ کو مرد کے سپرد کر دیا۔

مرد اُسے پاکر بہت خوش ہوا، لیکن جلد ہی اُکتا کر برہما کے پاس پہنچا اور فریاد کی کہ خداوندا اسے واپس لے لیا جائے۔ اس نے اپنی جھک جھک اور بک بک سے زندگی دوبھر کر دی۔ برہما نے عورت کو واپس لے لیا، اور مرد خوش ہو کر لوٹ آیا، لیکن جلد ہی زندگی میں خلا محسوس کرنے لگا

---

1 مکمل شعر: رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے + نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں (غالب)

2 تبختر: اترا کر چلنا، ناز و انداز، ادا، تکبر، غرور۔

اور برہما کے آستانہ پر حاضر ہو کر عرض کی خدایا عورت کو واپس کر دیا جائے بغیر اس کے زندگی روکھی اور ویران ہے۔ برہما نے التجا قبول کی اور عورت کو حوالہ کر دیا، لیکن ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ وہ پھر برہما کے حضور میں پہنچا اور گڑگڑانے لگا:

الہانہ پائے رفتن نہ جائے ماندن

اس مصیبت کو تو واپس ہی لے لیا جائے۔ ہم نے تجھ سے آسائش طلب کی تھی تو نے آزمائش میں مبتلا کر دیا۔ ہم نے تجھ سے انعام چاہا تھا، تو نے ہمارا انجام سپرد کر دیا۔ یہ تو تجھ سے بھی زیادہ خدمت کی طلب گار ہوتی ہے۔ تیری عبادت اور اس کی خدمت خاکم بدہن اتنا بار اور ایسوں کا بار ہم سے نہیں اُٹھ سکتا، برہما نے کہا۔ ''بھاگ جاؤ۔ اب اسے واپس نہیں لیا جائے گا۔ یہ کیا مذاق بنا رکھا ہے کہ نہ اس کے ساتھ تم رہ سکتے ہو! نہ اس کے بغیر رہ سکتے ہو!'' اس کے بعد کی ایک ضعیف سی روایت یہ ہے کہ چلتے چلتے مرد نے کہا۔ ''خداوند، جو تیری مرضی ہو، لیکن ہماری حالتِ زار پر بھی نظر رکھ! ہم تیرے بغیر یا تیرے ساتھ بھی تو نہیں رہ سکتے!'' سنتے ہیں اس پر برہما سوچ میں پڑ گئے، پھر مسکرائے ـــــ اور عورت سے شادی کر لی! سنتے ہیں برہما اس کے بعد پھر کبھی نہ مسکرائے!

شوہر اور بیوی کے تعلقات کو اس لطیفہ کی روشنی میں پرکھتے رہنے سے ''بہتوں کا بھلا ہوگا'' بشرطیکہ اشتہاری دوا اور اشتہاری بیوی دونوں سے بچتے رہیں!

ایک دوسری روایت یہ ہے کہ عورت مرد کی پسلی کی ہڈی سے پیدا کی گئی اور عورت ہی مرد کو اغوا کر کے اس دنیا میں لائی۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ شیطان نے عورت کے ذریعہ مرد کو بہکایا اور گیہوں کھانے کی پاداش میں مرد، عورت اور شیطان تینوں آسمان سے زمین پر پھینک دیے گئے۔ یہ روایت صحیح ہو یا نہیں میں گیہوں کھانے کھلانے میں بڑی احتیاط برتنے لگا ہوں، بالخصوص جب سے امریکہ سے گیہوں آنے لگا ہے!

میں روایات کا بڑا احترام کرتا ہوں۔ اکثر خدا کے خوف سے کبھی کبھی مولویوں کے ڈر سے، لیکن میرے دل میں یہ وسوسہ بھی گزرا ہے کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ شیطان کو عورت نے دھوکا دیا ہو۔ یہ بات میرے دل میں شیطان نے یقیناً نہیں ڈالی ہے۔ شیطان اتنا کم ظرف نہیں کہ وہ عورت کے دھوکا دینے پر پولیس میں رپٹ لکھوائے یا اردو کے سستے بازاری اخبارات میں

مضمون لکھنے لگے۔ یہ بات میرے دل میں اس لیے آئی کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ایسا ہوتا تو بڑا اچھا ہوتا۔ میں اس کی کوئی دلیل نہیں دے سکتا۔ دلیل کی کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں۔ جی چاہنا خود کیا کم دلیل ہے۔ میں عورت کا تو یقیناً دوست ہوں اور شیطان کا بھی خواہ مخواہ دشمن نہیں ہوں اس لیے کہ ان دونوں کے بغیر زندگی، بقول ایک بزرگ کے جو انگریزی کے دو ہی چار الفاظ سے واقف، لیکن ہر انگریزی داں پر بھاری ہیں۔ ''شووار'' (پُر رونق) نہیں رہتے۔ انھیں دوست کا قصہ ہے۔ کسی خاتون کو دیکھ آئے تھے۔ بولے ''رشید صاحب آپ نے......کو دیکھا ہے۔'' میں نے کہا ''دیکھا ہے۔'' بولے ''واللہ غضب کی 'ایبل فیشن' ہے!'' میں نے ''اقرار کیا کہ'' میں نے یہ چیز نہیں دیکھی تھی'' میں نے دوست کے انتخاب کرنے میں اکثر دھوکا کھایا ہے، لیکن دشمن کا انتخاب کرنے میں غلطی نہیں کی۔ اس لیے کہ اس کی اب تک نوبت نہیں آئی۔ سوسائٹی کے ناقص ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اچھے دشمن نایاب ہوں!

میں عورت کو عزیز رکھتا ہوں۔ شاید اسی لیے بیویاں مجھے بالکل عزیز نہیں رکھتیں۔ عورت کو عزیز رکھنے ہی کی بنا پر میں چاہتا ہوں کہ شیطان کو دھوکا دینے کا سہرا اُسی کے سر رہے۔ دھوکا دینا بجائے خود کوئی اچھی بات نہیں ہے، لیکن عورت کا شیطان کو یا اس خاکسار کو دھوکا دینا بیویوں کو پسند ہو یا نہ ہو، مجھے تو پسند ہے۔ ممکن ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ مجھ میں شیطان موجود ہے البتہ میں عورتوں کو یہ مشورہ نہ دوں گا کہ وہ دھوکا دینے کی کوشش کریں۔ اس لیے کہ اکثر ہوتا یہ ہے کہ وہ دھوکا دے نہیں پاتیں کھا یقیناً جاتی ہیں، اور ترقی پسندوں کو اللہ واسطے بے قافیہ نظمیں کہہ کر جواب دہی کرنی پڑتی ہے۔

بیوی ملے تو ایسی یا بیوی ملی تو ایسی یا بیوی نہ ملے تو کیسی! سوالات کا سلسلہ ہے بیویوں کی اقسام نہیں۔ ان میں ایک ارمان ہے، دوسری شامت اور تیسری ما بخیر شما سلامت! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان تینوں میں کون سی بات ایسی ہے، جس پر مجھے گفتگو کرنی ہے۔ گفتگو تو بہر حال کرنی ہے۔ اس لیے اور کہ جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اُس وقت بات کرنا اور کیے جانا ضروری ہو جاتا ہے، بالخصوص جب بیویوں سے متعلق بات کرنی ہو۔ اس لیے کہ میں نہ کروں گا تو خود بیویاں بات کرنے لگیں گی، اور سنا یہ گیا ہے کہ بیویاں بات کرنے پر اُتر آتی ہیں تو فرشتے

دنیا سے اُٹھا لیے جاتے ہیں، اور کوئی دوسرا بیویوں سے متعلق گفتگو کرے تو فرشتے خود بخود اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں۔ فرشتہ خصلت شوہر بھی!

آج کے موضوع یعنی بیوی ملی، تو ایسی پر گفتگو کرنے کا وعدہ مجھ سے ایک خاتون نے لیا تھا۔ خواتین سے جو وعدہ کیا جائے اُس کا نہ پورا کرنا میرے نزدیک کوئی ایسا گناہ ہی نہیں اس لیے کہ خاتون کا قانون سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، اور جہاں قانون نہیں وہاں گناہ نہیں، جس کی بعض مفسروں نے یہ بھی تعبیر کی ہے کہ جہاں خاتون نہیں وہاں گناہ نہیں یا جہاں گناہ نہیں وہاں کچھ بھی نہیں! میرا تو یہاں تک خیال ہے کہ اگر اس بارے میں کوئی قانون ہو بھی تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے سزا نہیں دے سکتا۔ اس لیے کہ اگر کسی شخص سے کوئی جرم اپنے تحفظ یا سخت اشتعال یا سراسیمگی اور مایوسی میں سرزد ہو جائے تو عدالت ملزم کو بالکل بری نہیں کر دیتی تو سزائیں یقیناً بہت کچھ تخفیف کر دیتی ہے۔ خواتین سے وعدہ کر لینا بھی کچھ اسی طرح کی بات ہے!

لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ ریڈیو کا محکمہ خواتین کے معاملہ میں اتنا سخت گیر ہوگا کہ مجھے گرفتار کر کے آپ کے سامنے پیش کر دے گا۔ ریڈیو کا کہنا یہ ہے کہ حفاظت خود اختیاری وغیرہ برحق، لیکن حماقت کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے حماقت کا پوائنٹ ایسا ہے، جسے میں نے نہایت فخر کے ساتھ تسلیم کر لیا۔ اس لیے کہ حماقت کرنا میں اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہوں، اور اسے کسی قیمت پر کسی کے حوالہ کرنا نہیں چاہتا۔ بالخصوص جہاں عورتوں کا بیچ ہو، یا پولیس بیچ بچاؤ کر رہی ہو!

میں نے ابھی ابھی بتایا تھا کہ جب بات سمجھ میں نہ آئے تو بات کرنا بہت ضروری ہوتا ہے، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کی سمجھ میں بات نہیں آپاتی۔ بے سمجھے بات کرنا اور پٹنے سے بچ جانا بڑا فن ہے، اور پٹتے جانا، لیکن بات بتائے جانا بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ اسے کوئی ''روایت'' کے نام سے موسوم کرتا ہے اور کوئی ''تجربہ'' سے، لیکن ریڈیو پر گفتگو کرنے میں ایک بڑی آسانی یہ ہے کہ آپ کو کوئی پیٹ نہیں سکتا، اور سننے والوں کا حافظہ اتنا قوی نہیں ہوتا کہ جب آپ برآمد ہوں تو ان کو یاد رہے کہ وہ آپ کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے تھے خود میرا حال یہ ہے کہ جب سے میرا حافظہ کمزور ہوا ہے، میں نے جھوٹ بولنا ترک کر دیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ

آپ میرے سچ کو کبھی جھوٹ سمجھ کر ہنستے ہوں اور میرے جھوٹ کو سچ سمجھ کر خواتین مجھے دعائیں دیتی ہوں اور آپ دونوں کو دیکھ کر بچے تالیاں بجاتے ہوں!

عام طور پر میں یا آپ (آپ کم میں زیادہ) بیوی میں وہ خوبیاں تلاش کرتے ہیں، جو مجھ میں آپ میں دور دور نہیں ہوتیں۔ ''بیوی ملے تو ایسی'' یعنی جوان، خوب صورت، تندرست، دولت مند، سمجھ دار، نیک، لکھی پڑھی اور......لاوارث، لاوارث اس لیے کہ اس کا کوئی وارث ہوا تو وہ ایسی متاع بے بہا کو میرے آپ کے سپرد کیوں کردے گا!

دنیا میں ایسی بیویاں ہوتی کہاں ہیں، ممکن ہے پیغمبر ایسے ہوتے ہوں۔ شاید اسی وجہ سے عورتوں کو پیغمبری نہیں دی گئی، لیکن اپنی یا آپ کی خاطر نہ سہی بعض بیویوں کی خاطر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان خوبیوں کی بیویاں ہوتی ہیں تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی بیویاں میری یا آپ کی نہیں ہوتیں، دوسروں کی ہوتی ہوں گی۔ اس لیے کہ اکثر دیکھا یہ گیا ہے کہ نری بیویاں تو ہمارے آپ کے حصہ میں آتی ہیں، اور ان کی خوبیاں دوسروں کے حصہ میں۔ عبادت میری حوریں آپ کی!

بیوی کی ان خوبیوں سے جو میں ابھی گنا آیا ہوں اگر شوہر کو فائدہ پہنچ جائے تو میرا آپ کا کیا چارہ، لیکن ان ساری خوبیوں کے باوجود یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ میاں بیوی کے تعلقات 'بہمہ وجوہ خیریت' کے ہوں گے۔ دیکھا تو یہاں تک گیا ہے کہ معقول مرد اور معقول عورت اچھے میاں بیوی نہ بن سکے اور نامعقول مرد اور نامعقول عورت اچھے میاں بیوی ثابت ہوئے۔

شوہر اور بیوی کا خون کا رشتہ نہیں ہوتا، قانون اور اخلاق کا ہوتا ہے، جسے مانئے تو سب کچھ اور نہ مانئے تو کچھ بھی نہیں! لیکن خون کا رشتہ مانئے یا نہ مانئے اپنا رنگ دکھا کر رہتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ محض شوہر اور بیوی ہو جانے سے دونوں کے تعلقات پائیدار اور خوش گوار ہوں۔ خواہ یہ شوہر اور بیوی غزلیات سے برآمد ہوئے ہوں خواہ بے قافیہ نظموں سے، خواہ چور بازار سے، پھر ہم میں ایسوں کی بھی کمی نہیں جو ان خوبیوں کی عورت کو بیوی بنا کر انہی خوبیوں کو کہیں اور تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ایسے لوگ تمام عمر یا تو شعر پڑھتے رہتے ہیں، یا چوراہے پر پٹتے رہتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ مرد عورت، شوہر بیوی بننے کے بعد بے نقاب ہوتے ہیں، پہلے نہیں، اور نقاب کا یہ چکر کوئی معمولی چکر نہیں ہے۔ غالب نے جو یہ کہا ہے:

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زُلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا

شاعری میں تو ممکن ہے، شادی میں نہیں!

یہ جو بتایا جاتا ہے کہ اس عمر میں اُس عمر کی بیوی موزوں یا مفید ہوتی ہے، اور اُس عمر میں اِس عمر کی، یا شوہر کے لیے بیوی جوانی میں کچھ اور ہوتی ہے اور بڑھاپے میں کچھ اور، ممکن ہے سچ ہو، یعنی بعض دواؤں کی مانند بیویاں کسی درجہ میں گرم ہوتی ہوں، اور کسی میں سرد یا کسی درجہ میں تر ہوتی ہوں اور کسی میں خشک، یا جن میں بعض پھلوں کے خواص ہوں، یعنی کم کھائے تو قابض اور زیادہ کھائے تو قبض کشا یا مُلیّن، یا صبح کھائے تو سونا، سہ پہر میں چاندی اور رات میں سیسہ۔ بہرحال کچھ ہی ہو مجھے بیویوں کا یہ ''پرچۂ ترکیبِ استعمال'' معلوم نہیں، اور معلوم بھی ہو تو میں اس پر گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے کہ آپ سب جانتے ہیں کہ جب مقدمہ زیرِ سماعت ہو تو اس پر رائے زنی کرنا توہینِ عدالت کا موجب ہوتا ہے، جو خطرہ سے خالی نہیں۔

جنسی جذبات بڑے قوی اور خطرناک ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان پر قابو رکھنے کے لیے شادی کے قوانین بڑے سخت رکھے گئے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جو مذہب جتنا قدیم ہے اس کے ہاں شادی کے قوانین اتنے ہی سخت رکھے گئے ہیں، اور جو مذہب یا مسلک جتنا جدید ہے، اس کے ہاں یہ پابندیاں اتنی ہی آسان ہیں۔ زمانہ کی ترقی کے ساتھ شادی کے قوانین کی سخت گیری کم ہوتی گئی، یہاں تک کہ اب یہ اصول مانا جا رہا ہے کہ آدمی کے اس جذبہ کی روک تھام سے نقصان زیادہ اور فائدہ کم ہے۔ سائنس کی تحقیقات فطری قوانین کا پتہ چلاتی ہے اور اس کی نوعیت بتاتی ہے۔ یہ تحقیقات انسان کا بہت بڑا کارنامہ ہے، لیکن جس طرح نوامیسِ فطرت پر قابو پانے کے لیے سائنس داں کوشش کرتے ہیں، اور کامیاب ہوتے ہیں اُسی طرح حیوانی و شہوانی جذبات کی روک تھام کے لیے مذہب و اخلاق نے قاعدے منضبط کیے ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں، جتنے کہ سائنس کے قاعدے قانون۔ چنانچہ میرا خیال یہ ہے کہ آدمی کے حیوانی جذبہ پر سے پابندیاں ہٹا لینا یا ہلکا کرتے رہنا صحیح و صالح نقطۂ نظر نہیں ہے۔ شادی کے قانون اور شہوت کے قانون میں فرق کرنا اور رکھنا ہر حال میں لازم آتا ہے۔

یہاں اس بحث کی تفصیل میں پڑنے کا نہ موقع ہے نہ ضرورت، لیکن اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ کسی بُرائی کو فطرت کا تقاضا قرار دے کر رورعایت سے کام لینا اُن بھلائیوں کے حق میں مضر ہے جو انسانیت کا تقاضا مانی گئی ہیں۔ آج کل یہی ہو رہا ہے، یعنی فطرت کے تقاضوں کو انسانیت کے تقاضوں پر ترجیح دی جارہی ہے۔ دنیا کو آج جن ہولناکیوں کا سامنا ہے، اس کا بھید یہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اپنی خلقت کے اعتبار سے عورت ماں بننا چاہتی ہے، لیکن مرد اُسے بیسوا دیکھنا چاہتا ہے۔ اس فطری المیہ کو ہلکا کرنے کے لیے قانون اور اخلاق نے شادی کا ادارہ قائم کیا پھر بھی مرد اپنی شرافت کا اتنا قائل نہیں ہے جتنا عورت کے شباب کا۔ سارا جھگڑا اتنا اور اسی کا ہے۔ اس پر چاہے پُرانی چال کے شعرا غزل لکھیں یا نئی چال کے شعرا بے نقط تصنیف فرمائیں یا یہ خاکسار ریڈیو پر گفتگو کرے بات جہاں کی تہاں رہتی ہے۔

بیوی میں طرح طرح کی خوبیاں تلاش کرنے والوں کی اکثر یا تو نیت میں فتور ہوتا ہے یا عقل میں، یعنی یا تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ بیوی اتنی بے وقوف ہو کہ وہ ان پر مرے اور یہ کسی اور پر مریں، یا یہ سمجھتے ہیں کہ بیوی کی خوبیوں کا مصرف ہی یہ ہے کہ وہ شوہر کی بدچلنی پر پردہ ڈالتی رہے۔ بیوی کا حسن و شباب شوہر کی ہوس ناکی سے کہیں زیادہ کم عمر ہوتا ہے۔ ایسے شوہروں کو یہ لطیفہ تو معلوم ہی ہوگا کہ اپنی اولاد اور دوسرے کی بیوی ہمیشہ زیادہ خوب صورت معلوم ہوتی ہے، اور محبوبہ کے عیب منکوحہ کے ہنر سے اکثر زیادہ دلکش ہوتے ہیں!

آخر میں اتنی بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ زمانہ اور زندگی کے طور طریقوں کے بدلنے سے شوہر اور بیوی کے وہ آداب بھی بدل گئے جو پُرانے زمانے سے چلے آرہے تھے۔ مشینی دور میں ماورائی باتوں کا بہت کم لحاظ رکھا جاتا ہے۔ عورت یا بیوی کے مسئلہ کو ماورائیت سے جدا کر کے دیکھنا کچھ اچھے آثار نہیں، اس مشینی دور میں عورت گھاٹے میں ہے۔ میرے نزدیک عورت کا چھوٹے سے چھوٹا نقصان بھی مرد کے بڑے سے بڑے نقصان سے زیادہ الم ناک ہوتا ہے۔ عورت کا میرا تصور کچھ اسی طرح کا ہے، عورت میرا تصوّر چاہے جیسا رکھتی ہو۔

(نشریہ: 1951۔ مطبوعہ: ترقی بنگلور (سال نامہ 52-1951)

●●●

کوئی سمجھے تو کیا سمجھے ـــــ مسکرانے سے

ایک تھے مولوی صاحب، ایک تھا یکہ بان، اور ایک تھا محلّہ، اور یہ سب یوں کہ ایک تھا میں! بہت دنوں کی بات ہے جب میں یہ سمجھتا تھا کہ سارے جہاں کا بھید بھاؤ اُس کی لمبائی چوڑائی، اُونچ نیچ کچھ اور نہ تھی۔ میرے مولوی صاحب تھے، میر محلّہ تھا، اور کچھ یکہ بان کا وہ گھوڑا جو ہر صبح جت کر کہیں چلا جاتا تھا اور ہر شام تھکا ہارا واپس آجاتا۔

مجھے اس گھوڑے سے ہمدردی تھی۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے اس گھوڑے کا کوئی نہیں! ہوتا تو یہ روتا، بولتا، کپڑے پہنتا اور اس کا تو یقین تھا کہ اس کے ماں نہ تھی۔ ورنہ یہ شام کو جب پسینہ میں تر واپس آکر زمین پر لوٹتا تو اس کی ماں اس کو ضرور گھڑکتی، مارتی، پھر ہاتھ منہ دُھلاتی، کھلاتی پلاتی اور سلا دیتی۔ یکہ بان 16-15 سال کا ایک لڑکا تھا۔ مولوی صاحب سے کتنا مختلف، ہمیشہ گاتا، ہنستا یا چھیڑتا رہتا۔ مولوی صاحب ہنستے کبھی نہ تھے، عیب نکالتے اور منع کرتے رہتے۔ مجھے کبھی کبھی کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے اس گھوڑے کی طرح ان مولوی صاحب کے بھی آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ کم از کم ماں تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ماں اور مولوی کا تصور میرے ذہن میں یکجا نہیں ہوتا تھا۔ میں گھوڑے کو مصیبت میں مبتلا سمجھ کر اس سے محبت کرتا تھا اور مولوی صاحب کو مصیبت سمجھ کر ان سے دور رہنا چاہتا تھا، لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ تمام لوگ مجھے مولوی صاحب کے قریب اور گھوڑے سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ مولوی صاحب مجھے عربی میں اردو پڑھاتے اور

میں اردو میں گھوڑے سے قریب رہنا چاہتا۔ افسوس ہو یا تعجب بہر حال ''کیوں یا کیوں کر دور اور کیوں یا کیوں کر قریب'' کے چکر میں جب سے اب تک اس طرح پھنسا ہوں کہ نکلنے کی کوئی اُمید نہ رہی، اور کون ہے جو اس طرح پھنسا ہوا نہیں ہے۔

ایک دن یکہ بان کہیں جانے کے لیے تیار تھا اتنے میں، میں پہنچ گیا۔ اس نے بغیر کسی تامل یا تکلف کے مجھے یکہ پر ساتھ بٹھالیا پھر بہت سی سواریاں بٹھائیں اور غازی میاں کے میلے میں جا پہنچا۔ گھوڑے کو اس نے ایک درخت کے نیچے کھول دیا اور میری اُنگلی پکڑ کر میلے میں داخل ہو گیا۔ ایک طرف سے کچھ عورتیں آ رہی تھیں۔ ایک عورت کی آنکھ یکہ بان پر پڑ گئی پھر معلوم نہیں عورت نے مسکرا کر گالی دی یا گالی دے کر مسکرائی۔ میرے دوست یکہ بان نے لہک کر ایک شعر پڑھا جو غالباً زندگی میں سب سے پہلے میرے کان میں پڑا۔ شعر یہ تھا:

مسکرا کر مار ڈالا ناز سے

ہاں مری جاں پھر اُسی انداز سے

شعر کی خوبی دیکھئے کہ سوچا میرے ذہن میں اُتر گیا اور میری بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ گھر پہنچتے پہنچتے صرف ایک مصرعہ یاد رہ گیا۔ جسے آج کل کے نقاد کہیں گے کہ ایک مصرعہ لاشعور میں گم ہو گیا اور دوسرا نیم شعور میں اُلجھ کر رہ گیا۔ دوسرے دن مکتب میں حاضر ہو کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ میرے قریب کے ایک لڑکے کو مولوی صاحب ڈپٹ رہے تھے کہ دفعتاً تڑاق سے ایک آواز آئی۔ مولوی صاحب نے لڑکے کو زور کا تمانچا رسید کیا تھا۔ میں قریب ہی تھا چونک پڑا۔ موصوف میری طرف جھک پڑے اور گرج کر بولے ''کیوں بے تو کیا جھک مار رہا ہے۔'' معلوم نہیں میرے کس لاشعور یا نیم شعور سے برجستہ آواز آئی۔ ''ہاں میری جاں پھر اُسی انداز سے۔'' اس کے بعد کی ہوا اور مولوی صاحب نے کس کس انداز سے مجھے مار ڈالنے کی کوشش کی اس کا اندازہ بیان کے بغیر بھی اچھی طرح سے کیا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں مسکرانے سے یہ سمجھنا چاہیے کہ میلے میں مسکرانے سے یکہ بان شعر پڑھنے لگتا ہے اور مکتب میں شعر پڑھنے سے معصوم پٹ جاتا ہے پھر وہی ہوا جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ میں یکہ بان کی عمر کو پہنچا۔ مولوی صاحب آخرت کو پہنچ گئے اور اب ریڈیو سے یہ بات

آپ تک پہنچتی ہے، اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کہاں کہاں اور پہنچے گی۔ شاید کسی شاعر تک پہنچے۔ ایک نے تو اسے یہاں تک پہلے سے پہنچا رکھا ہے۔ مثلاً:

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا

بات پہنچی تری جوانی تک! (فانی بدایونی)

مسکرانے سے کوئی کیا سمجھے اور کیا نہ سمجھے میں کیا بتاؤں کہ کیا سمجھے۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ اکثر مسکرانے والا خود بھی نہیں سمجھتا کہ وہ کیوں مسکرایا۔ غالب کو بھی یہی دقت پیش آتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے شعر کہہ کہہ کر اپنی اُلجھن دور کر لی، لیکن ہماری آپ کی اُلجھنیں بڑھا گئے۔ آپ کو یقیناً پورا شعر یاد ہوگا۔ مجھے آدھا یاد رہ گیا ہے جہاں انھوں نے فرمایا ہے:

ع سب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

تبسم ہائے پنہاں ایک اور جگہ کہا ہے۔ مثلاً:

یا میرے زخمِ رشک کو رُسوا، نہ کیجیے

یا پردۂ تبسم پنہاں اُٹھائیے!

ان اشعار کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شاعر جہاں کہیں محبوب سے تعلق کا ذکر کرے گا ہماری آپ کی خوبی یا خیریت بتانے کے بجائے اپنی کمزوری کا اظہار کرے گا۔

بعض مسکراتے ہی اس لیے ہیں کہ بات سمجھ نہیں پاتے۔ میں نے ایسوں کو بھی دیکھا ہے جو بات سننے سے پہلے اخلاقاً مسکرانا شروع کر دیتے ہیں اور بعض احتیاطاً دیر تک مسکراتے رہتے ہیں اور اس پر بھی مطمئن نہ ہو کر دفعتاً زور زور سے ہنسنے لگتے ہیں، اور یہ سب محض اس خیال سے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ جو بات کہی گئی وہ اُن کی سمجھ میں نہیں آئی، لیکن جو بات کہی گئی ہوگی وہ یقیناً ہنسی کی ہوگی۔

کبھی یوں بھی مسکراتے ہیں کہ لوگ مسکرانے والے کے شدید کرب والم یا غیظ وغضب یا مکروفریب کا پتہ نہ لگا سکیں۔ بعض اس طرح مسکراتے ہیں جیسے خدا اپنے کمزور بندوں پر مسکرا رہا ہو۔ اردو شاعری کا محبوب آئینہ کے سامنے اور اس کا جاں بہ لب مریض مسیحا پر مسکراتا ہے اور ہم آپ اکثر یوں مسکراتے ہیں، جیسے اپنے دہانہ کے گوشوں پر بار بار بیٹھنے والی مکھی کو اُڑا دینا

چاہتے ہوں۔ میں نے اپنے ایک محبوب کو اس طرح مسکراتے دیکھا ہے کہ مسکرانے کا فرض ادا ہو جائے، لیکن الزام نہ لگنے پائے یعنی لب بندر ہیں یا چھیں طویل ہوتی رہیں۔

ان دنوں ہمارے نوجوان اپنے اپنے امتحانوں کی تیاری میں مصروف ہوں گے۔ امتحانات سے میرا تعلق بڑا پُرانا اور گہرا رہا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایک ہی شعر کے مختلف زمانوں میں مختلف معنی بتائے گئے۔ کبھی نہایت درجہ مضحک کبھی نہایت درجہ بلیغ۔ میں امتحان کی کاپیوں کے جوابات اور دواؤں کے اشتہارات سے پتہ لگالیتا ہوں کہ ہم کیا ہیں، کیسے ہیں، کہاں ہیں۔ مختصر یہ کہ ہم کتنے گئے گزرے ہیں۔ گو اس کے ساتھ ساتھ میں یہ اعتراف کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ امتحان کی ان کاپیوں میں مجھے ایسے جوابات بھی ملے ہیں جن سے میں نے جتنا سیکھا، جانا اور فائدہ اُٹھایا اتنا غالبًا میرے پرچوں سے اُمیدواروں نے نہ اُٹھایا ہوگا۔ اُس زمانہ میں بھی جب مجھے اپنی فہم وفراست کی طرف سے اتنی بے اطمینانی نہیں رہی جتنی پہلے کبھی تھی، مجھے اس کا اندیشہ لگا رہتا ہے کہ امتحان میں کوئی بچکانا ایسے مزے یا پتے کی بات لکھ دے گا جو میرے حاشیۂ خیال میں نہ آسکتی تھی، اس لیے میں اس پر زور دیا کرتا ہوں کہ بوڑھوں کو نوجوانوں کی جودتِ طبع اور تازگیِ فکر کا نوجوانوں کے احترام میں نہ سہی اپنے فائدہ کی خاطر ہمیشہ مشتاق ومنتظر رہنا چاہیے۔

آج کی گفتگو کا مسکرانے سے زیادہ تعلق ہے۔ امتحان سے برائے نام۔ پھر بھی اگر کہیں مسکرانا امتحان بن جائے یا امتحان مسکرانا تو آپ ہراساں نہ ہوں بلکہ مسکراتے رہیں۔ امتحان کا سامنا ہو تو ضرور مسکرانا چاہیے۔ آپ نے اقبال کی مشہور نظم تنہائی پڑھی ہوگی۔ جس کا آخری مصرعہ ہے:

تبسّم بہ لب اُور سید و ہیچ نگفت [1]

قصہ یہ ہے کہ شاعر مختلف اجرامِ فلکی سے گزرتا ہے اور ان سے کچھ سوالات کرتا ہے۔ یہ ساکنانِ افلاک جواب نہیں دے پاتے۔ کبھی تلملا کر کبھی کسمسا کر کبھی صرف اشارہ کنایہ کرکے خاموش ہو جاتے ہیں۔ ہر انٹرویو "ہیچ نگفت" کے فقرہ پر ختم ہو جاتا ہے یہاں تک کہ شاعر خدا کے حضور میں جا پہنچتا ہے اور اس سے بھی کچھ سوالات کرتا ہے۔ خدا سب سنتا ہے، مسکرا دیتا ہے اور کچھ

1۔ ترجمہ: اس کے ہونٹوں تک ہنسی تو آئی مگر کچھ کہا نہیں۔

اور نہیں کہتا۔ فارسی کے اس مصرعہ کا ترجمہ یہ ہے۔ خدا کے لب پر ایک تبسّم نمودار ہوا اور اس نے کچھ اور نہیں کہا۔

امتحان میں سوال یہ کیا گیا تھا کہ شاعر سے یہ سارے قصے قضیے سن کر خدا کا صرف مسکرا دینا چہ معنی دارد! ایک نے یہ لکھا ''جب آپ کے سوال پر میں بے اختیار ہنس پڑا تو اقبال کے سوال پر اللہ تعالیٰ کیا کیا نہ ہنسا ہوگا۔'' مجھے رونا آ گیا اس لیے کہ میری سمجھ میں بھی وہ بات نہ آئی۔

دوسرے نے لکھا کہ ''اقبال کو خدا کے پاس جانے کی کیا ضرورت پڑی تھی، خدا تو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ بالخصوص عدالتوں میں!'' ایک نے یہ بتایا کہ ''اقبال نے جب یہ نظم لکھی تو وہ زندہ تھے اس طرح کی باتیں وہ نہ لکھتے تو ابھی اور زندہ رہتے۔ اقبال نے یہ قصہ فرضی لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ وہ جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی بڑے گناہ گار۔''

ایک صاحب نے یہ فرمایا: ''واقعہ غلط ہے کم سے کم ہماری دنیا کے حالات و حوادث دیکھ کر خدا کو مسکرانے کا شوق باقی نہیں رہا ہوگا۔'' ایک نے یہ لکھا کہ ''خدا اقبال کی سادگی اور سادہ لوحی پر مسکرایا ہوگا اور زبانِ حال سے یہ شعر پڑھا ہوگا:

تو کار زمیں را نکو ساختی　　　کہ با آسماں نیز پرداختی!''[1]

ایک نے بتایا ''تبسّمے بہ لبِ اُو رسید و ہیچ نگفت!'' مصرعہ نہیں ہے۔ خدا ہے۔ آپ جیسے مولویوں کا نہیں اقبال کا۔'' اس کے بعد فرماتے ہیں ''ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ تبسّم شاعر کا تھا یا خدا کا۔ جیسے شیطان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ خدا کی مشیت میں اس کا سجدہ تھا یا نہیں ویسے ہی آپ کے سمجھ میں بھی نہیں آتا۔ یہ بات اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ اقبال کا خدا کا تصور اتنا عظیم نہیں ہے جتنا انسان کا۔ اقبال نے خدا کی طرف اتنی توجہ نہیں کی ہے جتنی آدم کی طرف۔ اس لیے ہم کو دراصل خدا کے تبسّم میں اقبال کے تبسّم کو دریافت کرنا چاہیے۔''

ایک نے یہ حرفِ آخر پیش کیا کہ ''قواعد بغدادی میں ہم کو جن صفات کے ساتھ اللہ کے نام گنائے گئے ہیں وہ صرف ننانوے ہیں اور اس میں تبسّم شامل نہیں ہے۔ میں اس الحاقی یا الزامی صفت سے بحث کرنا تضیع اوقات سمجھتا ہوں۔''

1۔ تم نے دنیا کے کام کو خوش اسلوبی سے انجام دے دیا اور آسمان سے بھی ربط و ضبط پیدا کر لیا۔

بہر حال وہ اقبال کا مسکرانا تھا، اب میر کا مسکرانا دیکھئے۔ ان کا مشہور شعر ہے:

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا!

ایک نے لکھا "میر کو مسکرانے سے کیا کام اور فرض کیجیے مسکرائے بھی ہوں تو کیا ضرور ہے کہ ان کے سارے دیوان میں سے یہی شعر انتخاب کر کے پوچھا جائے کتاب میں لکھنے اور کلاس میں پڑھاتے تو یہ رہے کہ میر سراسر حسرت والم تھے اور امتحان میں پوچھتے ہیں، کلی نے تبسم کیا۔ واہ واہ وا!"

دوسرے نے فرمایا کہ "اس طرح کی باتیں جاگیردارانہ نظام کی پیداوار تھیں۔ جن میں ایک میر بھی تھے اور ان کا کلام بھی۔ جہاں جتنا بھوکی ہو وہاں پر خوشۂ گندم کو جلا دو۔ ہم کلی، پھول یا تبسم کا امتحان دینے نہیں آتے ہیں، آگ، خون اور بغاوت کا پیغام لاتے ہیں۔"

تیسرے فرماتے ہیں "فرائڈ کا خیال ہے کہ اس طرح کے اشعار یا تبسم کی تہہ میں چند نفسیاتی گتھیوں کا راز پوشیدہ ہے۔ کلی کا پھول میں منتقل ہونا، ایک جنسی تقاضا تھا جس سے عہدہ برآ ہونے کی میر نے کوشش کی ہے۔ زندگی کا تقاضا جنس کا تقاضا ہے۔ شاعر کا گل کے ثبات کا راز دریافت کرنا وہ بھی کلی سے، اس بات کی چغلی کھاتا ہے کہ میر کی نیت میں فتور تھا، اور کبھی کبھی نیت کا فتور جنسی میلان کے فتور کی بنا پر ہوتا ہے اور جب تک جنس کا بھاؤ بڑھتا رہے گا جنس کی بھوک بھی بڑھتی رہے گی۔"

ایک اور صاحب یوں گل افشانی فرماتے ہیں۔ "شفاف بلوریں حباب پر آفتاب کی کرن جو رنگا رنگی پیدا کرتی ہے اگر ان کو چھوایا علاحدہ کیا جا سکتا ہے تو اس شعر کا حسن بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی حسن، الفاظ میں مسخ، آواز میں مجروح، حرکت میں کاواک، رنگ میں مضمحل اور جسم میں جامد ہو جاتا ہے۔ میر اُن شاعروں میں ہیں جو حسن کی ذات اور صفت کی خود تخلیق کرتے ہیں۔ جس کو کوئی دوسرا ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ یعنی نقاد پورے طور پر واضح نہیں کر سکتا۔ میر کی درد وغم کی مصوری مسلّم ہے، لیکن کبھی کبھی وہ حسن و رنگ کی مصوری میں درد وغم کی مصوری کو بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔"

میر، غالب، اقبال کے مسکرانے کا حال دیکھ چکے، اب ذرا دوسروں کے مسکرانے کا رنگ دیکھئے:

اردو کی ایک مشہور مثنوی کا مشہور شعر ہے:

اقرار میں تھی جو بے حیائی
شرمائی، لجائی، مسکرائی

بعض طبائع نیکی لکھنے والے فرشتہ کو دھوکا دینے کے لیے اس شعر کو پڑھ یا سن کر خدا سے مغفرت کے طالب ہوں گے اور اخبارات میں ہمارے آپ کے خلاف مضامین لکھیں گے۔ ان کی اس برگزیدہ برہمی کے پیچھے ایک راز ہے جیسے اس مسکرانے کے پیچھے ایک داستان ہے۔ شاعری کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ بہت سے تکلفات و تعصبات کا تاوان وصول کر کے اپنے حریم میں کسی کو داخل ہونے دے اس لیے اس حقیقت کو نہ بھولنا چاہیے کہ کبھی زندگی کی لغزش شاعری کو دل آویز بناتی ہے، اور کبھی شاعری کی لغزش فن کی تخلیق یا تنظیم کرتی ہے۔

انسان کی ترقی کا بہت بڑا سبب اس کی لغزشیں بھی ہیں۔ ہر لغزش ایک چیلنج ہوتی ہے۔ جس چیلنج کو قبول کرنے کا شرف ساری کائنات میں صرف انسان کو حاصل ہے اس شعر میں جو مسکرانا ہے اور جس موقع پر کیفیت کو اس میں سمویا گیا ہے اُسے میری زبان سے سننے کے بجائے دعا مانگیے کہ اُسے آپ کہیں دیکھ بھی پائیں اور دیکھ رہے ہوں تو میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔

اردو شاعری میں مسکرانے کا کاروبار محبوب سے وابستہ رہا ہے۔ اس کا نتیجہ بجلی گرانا، نمک چھڑکنا، چرکے لگانا یا بے وقوف بنانا رہا ہے۔ بذاتِ خود میں محبوب کے تبسم کو جور و جفا سے تعبیر نہ کروں گا۔ اس لیے کہ اکثر دیکھا یہ گیا ہے کہ محبوب اتنا غصہ ور یا غبی نہیں ہوتا جتنا شاعر یا عاشق مریض اور مفلس۔

تبسم بڑے ظرف و ذوق کا طلب گار ہوتا ہے۔ میں نے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو دیکھا ہے کہ ان کو تبسم کرنا نہ آیا۔ ملاّ، مہاجن اور کمیونسٹ کو بھی میں نے کبھی مسکراتے نہ پایا۔ مسکرانے میں انھیں ہمیشہ احساسِ شکست کا خدشہ رہا ہے۔

آئیے اب ذرا دیر کے لیے مسکرانے سے بے تکلفی برت کر ہنسی پر اُتر آئیں اور اکبر کی میم کی ہنسی سے رجوع کریں۔ آپ نے اکبر کے یہ اشعار تو سنے ہوں گے:

بند ٹاپے میں تھے وہ بنگلے پر
صبح کے وقت ہنس پڑی اک میم
جب وہ بولے بجائے ککڑوں کوں
مرغ، شاخِ درخت لا ہو یتیم

اکبر نے اپنے عہد کا بڑا مضحک اور انتہائی عبرت انگیز نقشہ کھینچا ہے۔ ہر بڑا شاعر ہر عہد کا شاعر ہوتا ہے۔ اکبر کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے ان کے Symbols یا علامتوں کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ٹاپا، بنگلہ، میم، پھر ککڑوں کوں کے مقابل:

"مرغ، شاخِ درخت لا ہو یتیم"

بظاہر ہنسنے ہنسانے کی باتیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن ان کے اندر اُس عہد کی سوسائٹی کا کھوکھلا پن بڑی خوبی سے دکھایا گیا ہے۔ میم کی اس ہنسی کے پیچھے ہماری آپ کی اندھی تقلید کا کیسا نقشہ نظر آتا ہے۔ آج نہ اکبر باقی ہیں، نہ انگریز، لیکن اندھی تقلید جوں کی توں ہے۔ اس تقلید کو سامنے رکھ کر اکبر کے فن اور فرزانگی اور میم کی ہنسی کا اندازہ لگائیے۔

(نشریہ: اگست 1952، مطبوعہ: معیار، میرٹھ۔ اگست 1952)

●●●

ہوا کا رُخ

نذیر احمد اور راشد الخیری کا ہماری سوسائٹی اور ادب پر بڑا احسان ہے۔ عورتوں کی حالتِ زار کو بہتر بنانے میں دونوں نے اپنی بعض بڑی قابلِ قدر صلاحیتیں صَرف کی ہیں۔ اُن سے پہلے عورت کا ذکر یا تو داستانوں میں ملتا تھا یا محل سراؤں اور شبستانوں میں، نذیر احمد نے عورتوں کی گھریلو زندگی کا سب سے پہلے ذکر کیا، لیکن اُن کے ہاں بالعموم تصویر کا ایک ہی رُخ ملتا ہے راشد الخیری اس اعتبار سے اہم ہیں کہ انھوں نے دہلی کے طبقۂ اوسط کے مسلمان خاندان کی عورتوں کی بے کسی کا نقشہ نذیر احمد سے علاحدہ ہو کر کھینچا ہے۔ اس طور پر ہم تصویر کے دوسرے اور زیادہ دردناک رُخ سے آشنا ہو جاتے ہیں مگر اُس کے دکھانے میں راشد الخیری ناول کے بعض بڑے اہم فنی مطالبات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے ہیں۔

نذیر احمد نے خاندان میں عورت کی اہمیت، راشد الخیری نے اُس کی معصومیت، رُسوا قاضی عبدالغفار اور پریم چند نے سوسائٹی میں اُن کی زبونی کی طرف ہم کو متوجہ کیا۔ یہ فہرست مکمل نہیں ہو سکتی، اگر اس میں مسلم یونیورسٹی ویمنز کالج کے بانی شیخ عبداللہ کا نام شامل نہ کر لیا جائے جن کا ہندوستان میں مسلمان عورتوں کو جدید تعلیم سے بہرہ مند کرانے میں اس صدی میں بڑا بیش قیمت حصہ رہا ہے۔ مسلمان عورتوں کو تعلیم و ترقی سے آشنا کرانے میں مولوی سید ممتاز علی کے مشہور رسالے تہذیب النسواں کو بھی بڑا دخل ہے۔

راشدالخیری نے عورتوں کی سماجی درماندگی سے متعلق بے شمار ناول لکھے۔ اس لائن کے اختیار کرنے میں اُن کو اپنے پھوپھا مولوی نذیراحمد سے ترغیب بھی ملی اور ایک حد تک رہبری بھی۔ مقصد کے اعتبار سے دونوں قابلِ احترام ہیں فن کے لحاظ سے جہاں تہاں قابلِ گرفت۔ نذیراحمد کم راشدالخیری زیادہ، لیکن یہ بات بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ اُن کو ناول کے اُن پرپیچ تقاضوں کا کہاں علم تھا، جن سے اتنے دنوں بعد آج بھی ہماری ناول نگاری آسانی سے عہدہ برآ نہیں ہو پاتی۔ مقصد فن کا پیش رو بھی ہوتا ہے محرک بھی۔ اس لیے مقصد کے پیش نظر فن کا مطالبہ کبھی کبھی پورا نہ ہو پائے تو حیرت کی بات نہیں۔ میں فن کو مقصد پر قربان کر دینے کی تلقین نہیں کرتا، لیکن مقصد کو فن کا غلام بنانا نہ میرا مقصد ہے نہ فن کا۔ راشدالخیری عورت کی مظلومیت دکھانے میں اکثر ضرورت سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں اس قدر زیادہ کہ اثر قائم ہونے کے بجائے زائل ہونے لگتا ہے۔ اُن کے ناولوں کا رنگ اُن کے عہد کے مرثیوں سے ملتا جلتا ہے جن کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ فنی مطالبات پورا کرتے ہوں یا نہیں، گریہ و بکا کا مقصد پورا کرتے ہیں اور یہ کافی ہے۔ راشدالخیری اپنے ناولوں میں اس چکّر سے نہیں نکل پاتے جن میں داستانیں اسیر ملتی ہیں۔ یعنی زمین کو آسمان کا یا فطرت کو مافوق الفطرت کا دست نگر رکھنا۔ ناول میں قضیہ زمین کا اصول بڑی دور سے اور بڑی دیر میں آیا ہے۔ پھر اس سے بھی انکار نہیں کرسکتے کہ ناول، داستانوں ہی سے برآمد ہوا ہے اس لیے جہاں تہاں ناولوں میں داستانوں کی جھلک نظر آجائے تو تعجب کی بات نہیں البتہ جہاں تک ممکن ہو ایسا ہونے نہ دینا چاہیے۔

آج سے نصف صدی پیش تر عصمت دہلی سے شائع ہوا تو مسلمان عورتوں کی حالت یا مسلمان سوسائٹی کی فضا کچھ اور تھی۔ آج کراچی میں جب اُس کی پچاس سالہ جوبلی منائی جارہی ہے صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ اس لیے رسالے کو مفید اور کامیاب بنانے کے لیے وقت اور زمانے کے مطالبات کو نظر میں رکھنا پڑے گا۔ اب لڑکیاں نماز روزہ، نذر نیاز، کشیدہ کاری، چولہا ہنڈیا، ساس بہو، محرم نامحرم کا کچھ زیادہ لحاظ کرتی نظر نہیں آتیں۔ میں اس بدلے ہوئے رنگ کو سراہتا نہیں صرف ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی رنگ اور بدلے گا۔ دنیا کی ترقی یافتہ حکومتوں سے مطالبہ کیا جارہا ہے کہ ابتدا ہی سے بچّے کی دیکھ بھال، پرورش و پرداخت، تعلیم وتربیت، خوردونوش

کے انتظامات حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور والدین کو ان جھگڑوں سے نجات دلائے تاکہ وہ قومی اور ملکی سرگرمیوں میں بیش از بیش حصہ لے سکیں۔ یہ ناممکن ہے کہ موجودہ کراچی کو پچاس سال پیچھے کی دہلی میں دھکیل دیا جائے۔ گذشتہ دہلی کو موجودہ کراچی میں کھینچ لانا بھی بس سے باہر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ''عصمت'' ان بدلے ہوئے حالات سے کس حد تک عہدہ برآ ہوتا ہے۔ میری آرزوئیں اور دعائیں اُس کے ساتھ ہیں۔

(مطبوعہ: عصمت، کراچی۔ جولائی 1958)

●●●

کچھ پیروڈی کے بارے میں

فن کی حیثیت سے پیروڈی مغرب کی دین ہے، لیکن شغل کے اعتبار سے ہمارے شعروادب میں اجنبی نہیں ہے۔ اردو میں اس کی ابتدائی مثال غالبًا شاہ نامے کی جہاں تہاں سے پیروڈی میں ملتی ہے جو رکیک و سخیف زیادہ ہے پیروڈی کم ہے۔ عربی، فارسی، کلاسیکی اور مذہبی کتابوں کے تحت اللفظ اردو ترجمے کی بھی پیروڈی کی گئی جس کے نمونے ملّا رموزی کی "گلابی اردو" میں ملتے ہیں۔ غالب، حالی، انیس اور اقبال کے کلام پر بھی یہ عمل کیا گیا ہے۔ کسی شاعر یا مصنف کے کام کی پیروڈی اس امر کی دلیل ہے کہ اُس کے کلام کا غیر معمولی طور پر چرچا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ خود وہ کلام یا اس کا مصنف کس پائے کا ہے۔

کچھ دنوں پہلے ترقی پسند شاعری بالخصوص بے قافیہ نظموں کی کثرت سے پیروڈی کی گئی، پیروڈی دراصل معقول یا مقبول کو مضحک رنگ میں پیش کرنا ہے۔ یہ دراصل کسی مشہور مصنف یا شاعر کے سنجیدہ اور معروف کلام نثر یا نظم کو مضحک رنگ میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ مضحک مبتذل نہ ہونے پائے (بہ الفاظ دیگر پیروڈی ادبی رنگ کی حامل ہو) مشیخت مآبی یا حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی کو مزاح و تفنن سے معتدل کرنے اور رکھنے کا کام پیروڈی سے لیا جاتا ہے۔ علی گڑھ میں بور اور بوریت کچھ دنوں سے بڑی مقبول اصطلاحیں ہیں جن کو خود بور بڑی معصومیت سے کام میں لاتے ہیں۔ پیروڈی ان معصوموں کے حضور میں اُن کے ستم زدوں کی طرف سے

نذرِ عقیدت ہے یا یوں سمجھ لیجیے بور کو بور ہی کے حربے سے کیفرِ کردار کو پہنچانے کی مستحسن کوشش پیروڈی ہے۔

پیروڈی میں جدّت اور جودت کا ہونا ضروری ہے۔ اصل کی نقل اس طور پر کرنا یا اس میں ظرافت کا ایسا پیوند لگانا کہ تھوڑی دیر کے لیے نقاب یا پیوند کی تفریحی حیثیت اصل کی سنجیدہ حیثیت کو دبا دے پیروڈی کا ہنر ہے۔ پیروڈی ظریفانہ پیوندکاری یا مزاحیہ تصرف ہی کو تو کہتے ہیں اعلیٰ پائے کی پیروڈی اتنی ہی قابلِ قدر ہوتی ہے جتنی کہ وہ عبارت یا شعر جس کی پیروڈی کی گئی ہو۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پیروڈی کا فن کس ذہانت اور ذکاوت کا طلب گار ہوتا ہے۔

پیروڈی نگاروں میں میرے نزدیک اکبر کا درجہ سب سے بلند ہے۔ ایک زمانے میں سید محمد داؤد عباسی (علیگ) کی پیروڈی نگاری کی علی گڑھ میں بڑی دھوم تھی جو خوشی محمد خاں ناظر اور علامہ شبلی کے کلام پر طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ موجودہ دور میں اس فن میں سید محمد جعفری[1] (پاکستان) کو بڑی شہرت حاصل ہے۔

آپ نے سرکس میں مسخرے کو دیکھا ہوگا جو اپنے ساتھی بازی گر نمبر 1 کے کرتب کی نقل کرتا ہے۔ وہ اپنے طور پر وہی سب کر دکھاتا ہے جو بازی گر دکھاتا ہے۔ دونوں کے دکھانے میں صرف تکنیک کا فرق ہے۔ ایک کے کرتب پر آپ محوِ حیرت رہ جاتے ہیں دوسرے کی نقل پر ہنستے ہنستے لوٹ جاتے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ مسخرا فن کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ بازی گر کا ہم سر ہوتا ہے بلکہ بازی گر پر اُس کو یہ فوقیت حاصل ہوتی ہے کہ جو کرتب بازی گر جان کو خطرے میں ڈال کر دکھاتا ہے مسخرا محض چند قلابازیوں میں دکھا دیتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ہم بازی گر کے کرتب کا جس شوق سے مشاہدہ کرتے ہیں اُس سے کسی طرح کم شوق سے مسخرے کی قلابازی کا مشاہدہ نہیں کرتے۔ یہاں غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس کرتب کو بازی گر اپنی جان خطرے میں ڈال کر دکھاتا ہے اُسی کو مسخرا اپنی آبرو خطرے میں ڈال کر دکھاتا ہے۔ مسخرے کی آبرو کسی غیر مسخرے کی آبرو سے کم نہیں ہوتی۔

---

1 سید محمد جعفری: تاریخ پیدائش پرسر (بھرت پور) 27؍دسمبر 1907، تاریخ وفات: کراچی 7؍جنوری 1979

قلابازی تو ہم آپ بھی لگا سکتے ہیں، لیکن تماشائیوں کے ڈر سے شاید ایسا نہ کریں دراصل قلابازی میں کچھ نہیں دھرا ہوتا۔ سب کچھ مسخرے (فن کار) میں ہوتا ہے۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ مسخرا بننے سے پہلے قلابازی لگانے میں احتیاط برتیں اور مسخرا بننے میں اس سے بھی زیادہ احتیاط سے کام لیں۔

پیروڈی اور کارٹون میں مماثلت ہے۔ کارٹون بھی کسی شخص یا شے یا واقعے کی سب سے نمایاں شناخت یا پہلو کو مضحکہ خیز حد تک نمایاں کر دیتا ہے۔ چسٹرٹن کے نزدیک طنز یا تضحیک کا تصور یہ ہے کہ سور کا نقشہ اس طرح کھینچا جائے کہ وہ سور سے بھی زیادہ سور نظر آنے لگے، یہ تعریف کارٹون پر بھی چسپاں ہوتی ہے۔ اس طور پر پیروڈی کارٹون، طنز و ظرافت ایک ہی ''جذبۂ بے اختیار شوق'' کے مظاہر ہیں۔ بقولِ غالب کہیں ''نفس''، کہیں ''نکہتِ گل''[1]

نثر کی پیروڈی نظم کی پیروڈی سے مشکل ہے۔ اس سے چوں کہ سب کو اتفاق ہوگا اس لیے مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔

(سرسید ہال میگزین، (اسکالر)۔ پیروڈی نمبر 1959 (مرتبہ جمال پاشا)

---

1. ''وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے!''

برخود غلط معالج

فارسی کی ایک کہاوت ہے کہ جب موت آنے والی ہوتی ہے تو معالج سے بے وقوفی ہو جاتی ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ علاج نہ کیجیے جب بھی موت آتی ہے۔ عقل مندوں کا قول ہے کہ بے وقوفی اور موت دونوں کا کوئی علاج نہیں۔ بعض معالجوں کو یہ بھی کہتے سنا گیا ہے کہ بے وقوف مریض عقل مند مریض سے جلد صحت یاب ہوتا ہے یا کم ہوتا ہے اور عقل مند مریضوں کا بیان ہے کہ بے وقوف معالج عقل مند معالج سے زیادہ دن جیتا ہے!

مجھے معالج کی قابلیت اور اپنی عقل پر بہت کم بھروسہ رہا ہے اس لیے مرض میں مبتلا ہونے کا تو اکثر اتفاق ہوا ہے مرنے کا اب تک نہیں ہوا۔ مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ میں خود اتنا برخود غلط ہوں کہ معالج کے برخود غلط ہونے پر میری نظر بہت کم جاتی ہے اس لیے کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوا کہ قبل اس کے کہ کوئی معالج میری جان لے کر کہیں میں ہی اُس کی جان نہ لے لوں۔ اس بیان میں آپ سبب اور نتیجہ کا ربط دریافت کرنے کی کوشش نہ فرمائیں جو شخص جان لینے کی فکر میں ہوتا ہے وہ منطق کے چکر میں نہیں پڑتا!

میرے دل میں اکثر یہ خطرہ بھی گزرا ہے کہ آج کل جس کثرت سے دوائیں ایجاد ہوتی جارہی ہیں اگر اُسی رفتار سے مرض نہ پیدا کیے جاسکے تو دنیا کو کتنی بڑی ہلچل کا سامنا ہوگا! مثلاً کوئی نیا اسلحہ جنگ دریافت ہو جائے اور جنگ نہ چھیڑی جاسکے تو آپ نے دیکھا ہوگا جنگ کرنے کے لیے

ضبط کی تدابیر اختیار کرنے یا کرانے میں کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ممکن ہے آج کل کچھ اسی قسم کی دشواریوں سے سابقہ ہوا ہو جس کی وجہ سے فیملی پلاننگ کی اسکیم تصنیف کی گئی ہو۔ یعنی افزائشِ نسل کو قابو میں رکھا جائے اور یہ اس طور سے کہ والدین سے اُن کا پیدائشی حق چھین لیا جائے۔ اس میں مجھے خیریت نظر نہیں آتی، پیدائش کا حق چھیننا آسان نہیں ہے۔ اس سے ''فن برائے زندگی'' پر براہِ راست ضرب پڑتی ہے!

حق پیدائش کے ساتھ اشتہاری معالجوں کی پرورش کا مسئلہ بھی گتھا ہوا ہے۔ شمار واعداد کے ایک ماہر نے مجھے بتایا ہے کہ اولاد کی پیدائش اور اشتہاری ادویات کی کھپت میں ایک خاص تناسب ہے۔ اگر افزائشِ نسل کو روکنا مقصود ہو تو اشتہاری معالجین کی قطع نسل ضروری ہے۔ اس کے برعکس بعضوں پر اس نظریہ کو بھی اہمیت دی جاتی ہے کہ قطع نسل کا آسان وسیلہ اشتہاری دوائیں ہیں۔ ضمناً یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ افزائشِ نسل کا سب سے بڑا سبب افلاس ہے۔ فراغت میں بدکاری اور فلاکت میں نسل بڑھتی ہے۔ مفلسی سب بہار کھوتی ہو یا نہیں اس میں وہ تمام خاصیتیں موجود ہوتی ہیں جو مقوی سے مقوی ادویات یا اشتعال انگیز سے اشتعال انگیز تقریروں میں نہیں ہوتیں۔

اشتہاری معالجوں کا میں یوں بھی قائل ہوں، اس لیے کہ امراض وادویہ سے متعلق اُن کے اشتہارات اردو افسانہ نگاری میں ''حقیقت پسندی'' کے محرک ہوتے ہیں۔ ایک عرصہ سے زیادہ تر ایسے اردو افسانے میری نظر سے گزرے ہیں جن کو پڑھ کر محسوس ہوا ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے یا تو اشتہاری معالجوں کے تصنیف کیے ہوئے اشتہارات پڑھے ہیں یا ان کی تیر بہ ہدف دواؤں کا شکار ہوئے ہیں۔

اولاد کی پرورش و پرداخت نہ کیجیے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ آزاد شہری بن جائیں گے جو اکثر آزاد شہدے کا ایک خوب صورت مترادف ہے یعنی ذمہ داری تمام تر تمھاری اور اختیارات و حقوق کلیتہً ہمارے، لیکن اشتہاری معالجوں کی طرف توجہ نہ کیجیے تو الیکشن میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کامیاب ہوتے ہیں تو قوم کے معالج اور ناکامیاب ہوتے ہیں تو قوم کا مرض بن جاتے ہیں۔ مریض تو معالج کا سہارا پکڑتا ہے، یہ قومی معالج مریض کا سہارا پکڑتے ہیں۔ بر خود غلط معالج کی سب سے ہیبت ناک اور نفرت انگیز قسم یہ ہے!

خود میرا امراض سے اتنا سابقہ نہیں رہا جتنا معالجوں سے اس لیے کہ مرض کسی کے حصہ میں آئے معالج میرے حصہ میں آتا تھا وہ یوں کہ بچپن ہی سے مجھے یہ سعادت نصیب رہی ہے کہ لوگ میری خدمات سے فائدہ اُٹھاتا میرے اور اپنے دونوں کے لیے سعادت دارین کا موجب سمجھتے تھے مثلاً بوڑھیوں کو جب میٹھا کھانے کی خواہش ہوتی تو وہ اپنے بزرگوں کی ارواح کو ثواب پہنچانے کے لیے بتاشے پر فاتحہ دلانے مجھے بلاتیں۔ مجھے فاتحہ پڑھنا بالکل نہیں آتا تھا اور اس بات کو محلّہ کی ساری بوڑھیاں جانتی تھیں، لیکن اُن کو میرا جیسا سعادت مند لڑکا نہیں ملتا تھا جو ایک پیسے میں دھیلے کا بتاشا دھیلے کا مٹی کا تیل تو مول خریدے اور دو چار روڑی نمک کی ایک آدھ گانٹھ ہلدی کی، کچھ سبزی ادھر اُدھر سے مانگ لے اور تھوڑی بہت لکڑیاں راستہ سے چنتا لائے۔ کوئی اعتراض کرتا کہ جس کو فاتحہ پڑھنا نہ آتا ہو اُس سے فاتحہ پڑھانے سے کیا حاصل تو وہ جواب دیتیں کہ اس سے کیا ہوتا ہے۔ معصوم کی دعائیں بھی قبول ہو جاتی ہے۔ معاوضہ میں وہ مجھ کو ایک دو بتاشے اور بے شمار دعائیں دیتیں۔ اب میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مجھ معصوم کی دعا اُن ارواح کے حق میں مقبول ہوئی یا نہیں البتہ اُن بوڑھوں کی دعا میرے حق میں اس اعتبار سے ضرور مقبول ہوئی کہ اب تک کوئی معالج میری روح نہ قبض کر سکا۔

پھر میں نے ترقی کر کے اُن کے دل میں اتنا گھر کر لیا کہ وہ مجھے پنساری کے ہاں یہ کہلا کر بھیج دیتیں کہ فلاں کو یہ تکلیف ہے کوئی دوا تجویز کر کے بھیج دی جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بستی کے سب سے پرانے پنساری کی دوکان مشکل کشائی کا سب سے بڑا ادارہ ہوتا۔ لوگ سودا خریدنے آتے تو طبّی مشورہ اور دوا مفت حاصل کرتے۔ بوڑھا بنیا اُس زمانے میں بستی والوں کا طبّی، قانونی، مالی، خاندانی، روحانی سبھی طرح کا مشیر ہوتا۔ وہ بستی کے ہر خاندان کے افراد کا مزاج داں ہوتا۔ مجھے صرف یہ کہنا پڑتا کہ فلاں کو فلاں تکلیف ہے۔ دوا دے دو۔ پھر وہ دوائیں ایسی ہوتیں جو پنساری کی دوکان پر یا ادھر اُدھر کھیت میں یا گھوڑے پر اُگی مل جاتی تھیں، اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ پنساری کی دوکان کی بیش تر دوائیں روزمرّہ کی کھانے پینے ہی کی چیزیں ہوتیں بشرطیکہ پرانی ہو کر نا قابلِ استعمال ہو جاتی ہوں اور سب سے تعجب کی بات یعنی ڈوب مرنے کی بات یہ تھی کہ انھیں دواؤں سے جاں بر ہو کر اُس زمانے میں لوگ لیڈری بھی کرتے تھے اور عقدِ ثانی بھی!

مجھے یاد ہے کہ ایک شخص نے سودا لے کر اپنی تکالیف بیان کرنی شروع کر دیں۔ بنئے نے ایک پُڑے میں دوا باندھ کر دے دی۔ مریض نے جتنی شکایات بیان کیں جن میں زیادہ تر عدالت، فوج داری اور کچھ قدرتِ باری سے تعلق رکھتی تھیں۔ بنیا یہی بتا تا رہا کہ اس کا توڑ بھی پڑیا میں موجود ہے۔ فرق صرف ترکیبِ استعمال یا دوا کی تیاری کا تھا یعنی دوا کو جوش دے کر، بھگو کر، کوٹ چھان کر، پلاسٹر بنا کر یا جلا کر بطور دھونی استعمال کیا جائے، اور آخر میں ہمیشہ یہ کہہ دیتا کہ دیو ایک دوا ایک! ایک طرف سے چمٹا کشکول لیے ایک سادھو نمودار ہو کے بولے "ہاں بیٹا دیو ایک دوا ایک تو پھر دام بھی ایک!" بنئے نے ہاتھ جوڑ کر تعظیم دی اور ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر ایک دھیلا اُن کی کشکول میں ڈالا اور جب وہ ذرا دور نکل گئے تو بولا "کیوں نہیں رام رام جپنا پرایا مال تکنا!"

یہ قصہ اس زمانے کا ہے جب نہ معالج کی کوئی فیس تھی نہ دوا کے کچھ ایسے دام، بازار گئے ہر طرح کی بیماری یا عیاشی کی دوائیں خرید لائے۔ اس سے بحث نہیں کہ دوا فائدہ کرتی تھی یا نہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لوگ اس پر ایمان رکھتے ہوں کہ دوا استعمال کر کے انھوں نے خدا کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ چھوڑا ہو کہ وہ اُن کو اچھا کر دے اور معالج یہ سمجھتا ہو کہ جو دوا اُس نے دے دی ہے وہ اگر اپنی تاثیر نہ دکھائے تو وہ دوا خدا کو منہ دکھانے کی جرأت نہ کرے گی۔ بر خود غلط ہونے اور عقیدہ رکھنے میں کچھ یوں ہی سا فرق ہے!

اُسی زمانہ کی بات ہے کسی کے کان میں کوئی تکلیف ہوتی تو محلّہ کی بڑی بوڑھی سے لوگ رجوع کرتے اُن کے مطب کا وقت رات گئے ہوتا جب وہ اللہ کی عبادت اور گھر کے چھوٹے بڑوں پر حکومت کر کے سونے کی تیاری کرتیں۔ اُس وقت کان کے سارے مریض جمع ہوتے وہ ایک پان کھاتیں جس میں تمباکو کے سوکھے پتے کا خاصا بڑا انگڑا ہوتا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کا اُگال منہ سے براہِ راست مریض کے کان میں اس طرح ڈال دیتیں جیسے وہ کان نہیں پیک دان تھا! اس دوا کی ایک خوراک کے بعد کوئی مریض دوسری بار حاضر نہ ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ امراض میں بھی غیرت کا جذبہ ضرور ہوتا ہے جس مرض کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا گیا ہو، شاید ہی پھر کبھی وہ مرض اپنے یا مریض کے قبیلہ میں منہ دکھانے کے قابل رہ جاتا ہو!

برخود غلط معالجوں سے میرا سابقہ رہا ہے اکثر برخود غلط مریضوں اور حسینوں سے بھی حسینوں کا نام میں نے یوں لے لیا کہ اُن کا رشتہ یا اطوار و عادات کسی نہ کسی طرح اور کہیں نہ کہیں سے مریض اور معالج دونوں سے ملتے ہیں۔ میں حسینوں کو درگزر کے قابل سمجھتا ہوں اس لیے کہ وہ جس امتیاز پر فخر کرتے ہیں وہ یا تو خدا اور نہ آبرو باختہ شاعروں یا کرم خوردہ عاشقوں کا دیا ہوتا ہے، خود ان کا حاصل کیا ہوا نہیں ہوتا۔ جس چیز کے حصول میں اپنی قابلیت یا ریاضت کا دخل نہ ہو اُس پر فخر کرنا بے وقوفی کی نشانی ہے۔ حسینوں کے سلسلہ میں عاشقوں کی قابلیت اور ریاضت پر نظر کی جائے تو وہ بھی کچھ زیادہ قابل فخر نظر نہیں آتے۔ برخود غلط معالج کا تصور میرے نزدیک ایسے معالج کا ہے، جو دوسرے معالج کے مریض کو اپنی قابلیت جتائے اور اپنے مریض پر دوسرے معالج کے مجربات آزمائے۔ وہ اپنی عقل یا اپنے مطالعہ پر اتنا بھروسہ نہیں کرتا جتنا دوا کی تاثیر پر، اور دوا کی تاثیر پر اس لیے عقیدہ رکھتا ہے کہ کسی کو ایسا کہتے سنا ہے یا کسی پینشنر یا پیش امام کی بیاض میں ایسا لکھا ہوا دیکھا ہے۔ برخود غلط معالج کی واضح نشانی یہ ہے کہ وہ ہر مریض کو اچھا کر دینے کا دعویٰ کرے گا اور محض اس بنا پر کہ ہر مرض کی مجرّب دوائیں موجود ہیں!

بے شمار اچھے آلات، مجرّب دوائیں اور علاج کے ایسے طور طریقے دریافت کر لیے گئے ہیں اور ہر روز دریافت ہوتے رہتے ہیں جن کے تصرف سے امراض کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور صحت کی بحالی آسان ہو گئی ہے ایسے قوانین بنا دیے گئے ہیں۔ اتنی سہولتیں فراہم کر دی گئی ہیں اور عام لوگوں میں اتنی سوجھ بوجھ آ گئی ہے کہ پتے باز اور برخود غلط معالج کی دال اب کم گلتی ہے، لیکن اس کو کیا کیجیے مدتوں ہر طرح کی غلامی میں بسر کرنے سے ہم میں ایسی کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں جو عطائیوں کی ہمت بڑھاتی رہیں گی۔ ہماری زندگی کی سرگرمیوں مثلاً مذہب، شاعری، سیاست، تجارت، تصنیف و تالیف سب میں عطائیوں کی گرم بازاری ہے۔

میں ان تمام عطائیوں یا برخود غلط معالجوں کا ذکر نہ کروں گا جو ہماری زندگی میں دخیل ہو گئے ہیں۔ میں صرف جسمانی امراض کے ایسے معالجوں کا ذکر خیر کروں گا جو مریض کی جان پر نہیں اُس کی جیب پر نظر رکھتے ہیں۔ میں ایسے معالجوں سے واقف ہوں جو لالچی یا بے ایمان نہیں ہوتے، لیکن سوجھ بوجھ سے کام لینے کی ریاضت میں مبتلا ہونے سے بچتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ

صرف دوائیں مرض کو دور کر دیتی ہیں۔ اُن کو نہیں معلوم کہ مرض کتنا ہی معمولی یا جانا پہچانا کیوں نہ ہو مریض میں داخل ہو کر کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ میں طبیب یا ڈاکٹر نہیں ہوں، لیکن اتنا ضرور محسوس کرتا ہوں کہ جس طرح مختلف کیمیاوی اجزا کے میل سے ایک نئی چیز پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح ہر شخص کے جسم کے اندر پہنچ کر ہر مرض کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ معلّمی کا میرا تجربہ یہ ہے کہ ایک ہی علم یا ایک ہی نکتہ مختلف طلبا کے ذہن و دماغ پر مختلف طور پر اثر انداز ہوتا ہے، لیکن کیا کیجیے بر خود غلط معالج کی طرح بر خود غلط معلّم اور بر خود غلط پیغمبر تک عام ہیں!

مدت ہوئی ایک بیمار دوست کو لے کر ایک معالج کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا، مرض سخت تھا اور حالت اندیشہ ناک۔ مطب میں داخل ہوا تو انھوں نے اس غیر معمولی تپاک سے میرا خیر مقدم کیا کہ مریض کی طرف سے تو پہلے ہی سے مایوسی تھی، معالج کی طرف سے بھی مایوسی ہونے لگی۔ موصوف نے مریض کو اس طرح دیکھا بھالا جیسے وہ مرض انھیں کا بھیجا ہوا تھا اور تھوڑی دیر بعد اُس مرض کو واپس بلا لیں گے کچھ دیر تک تو اس شہر کی مصنوعات اور مقویات کا تذکرہ فرمایا جہاں سے ہم آئے تھے، لیکن ان میں سے کوئی چیز ہم راہ نہ لائے تھے اس کے بعد فرمایا۔ فلاں رئیس بھی اس مرض میں مبتلا ہوئے تھے اور مر گئے، لیکن اس لیے نہیں کہ وہ مرض ہی ایسا تھا بلکہ انھوں نے ایسے شخص سے علاج کرایا جو خدا کا منکر تھا۔ جو شافی مطلق کا منکر ہوگا اُس کے ہاتھ سے شفا کیسے ممکن ہے — ایک دن حال کہنے کے سلسلہ میں حاضر ہوا تو فرطِ محبت سے کھڑے ہو گئے اور بولے "جناب مبارک ہو۔ رات خواب میں حضرت شیخ الرئیس تشریف لائے اور آپ کے مریض کے لیے نسخہ لکھوا گئے ہیں اب صحت یاب ہونے میں کوئی شک نہیں رہا۔ نسخہ تیار ہونے کے لیے دے دیا گیا ہے۔ دوا کے کچھ دام نہیں البتہ مرحوم کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے پچاس روپے مرحمت ہوں۔" روپے دینے پڑے دوا استعمال کرنی پڑی، اور مریض جاں بحق ہو گیا۔ البتہ یہ نہیں بتا سکتا کہ اُن کے پچاس روپیوں کا ثواب شیخ الرئیس یا مریض مرحوم کو پہنچا یا نہیں!

میں ایسے تیر بہ ہدف معالج سے بہت گھبراتا ہوں جو دیکھتے ہی بتا دے کہ مجھے کیا تکلیف ہے اور تکلیف بتانے سے پہلے دوا تجویز کر دے اور دوا استعمال کرنے سے پہلے مجھ میں صحت یابی کے آثار دیکھنے لگے۔ اردو شاعری میں تو میں نے ایسی کرامات دیکھی ہیں، طب میں یہ

خرافات کہیں نظر نہ آئیں۔ میرا سابقہ ایسے معالجوں سے بھی رہا ہے جو دوا نہیں تجویز کرتے ڈاکٹر یا دیوالہ تجویز کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمارا جسم جتنے اعضائے رئیسہ یا اُن کے افعالِ قبیحہ پر مشتمل ہے اُن سب کے اسپیشلسٹ یا ماہر خصوصی جدا جدا ہیں اور جب تک اُن سب کی خدمت میں نذرانہ کی خطیر رقم پیش نہ کی جائے اس وقت تک معالج نہ آپ کے مرض کی تشخیص کرے گا اور نہ کوئی دوا دے گا! پھر ہر معالج کا دواخانہ بھی علاحدہ، جس پر صرف اس کا کنٹرول، آپ جاں بحق ہو جایئے تو یہ نہ معلوم ہو سکے کہ یہ کن مجرّبات خصوصی کا کارنامہ رہا۔ ایک معالج ہیں جو نسخہ میں دوا کے بجائے ڈاکٹر تجویز کرتے ہیں یعنی آج دانتوں کا ڈاکٹر، تو کل آنکھوں کا، پرسوں فتق کا اور کبھی کبھی کوڑھ یا کنٹھ مالے کا ورنہ کسی سینٹیوریم یا صحت گاہ کا۔ جہاں مرنے سے پہلے مریض عاشق کرتے ہیں اور اپنی ڈائری افسانہ نگاروں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔

ہر علم نے اتنی ترقی کر لی ہے اور اس درجہ شاخ در شاخ ہو گیا ہے کہ کوئی ایک شخص اس علم کے ہر جُزو سے پورے طور پر واقف نہیں ہو سکتا۔ یہی سبب ہے کہ آج کل بہ ہمہ جہت اہلِ علم و فن نہیں ملتے، یہ صورتِ حال ٹھیک ہو یا نہ ہو میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن ایک بات ضرور محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ ہر چیز پر بہ حیثیت مجموعی نظر نہ ہونے کے سبب سے اب کسی شخص میں وہ رچاؤ، وہ جامعیت اور وہ وزن و وقار نہیں ملتا جو اگلے لوگوں میں ملتا تھا۔ اُن کا علم کیسا ہی رہا ہو اُن کا ظرف گہرا اور اُن کی نظر وسیع تھی۔ اُن میں تحمل تھا، وہ انتظار کر سکتے تھے اور یہی سبب تھا کہ بہ حیثیت شخص دوسروں پر اُن کا اثر مفید اور دیرپا ہوتا تھا۔ اس طرح سے زندگی اور زمانہ کی طرف سے لوگوں میں وہ بے اطمینانی و بیزاری نہیں آئی تھی جو آج تمام دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔

(مطبوعہ: معیار، میرٹھ۔ اگست 1953)

●●●

جینے کا سلیقہ چاہیے!

ایک صاحب پٹتے بھی جارہے تھے اور ہنستے بھی جارہے تھے اور جس قدر بے تحاشا پٹتے تھے اُسی قدر بے تحاشا ہنستے تھے۔ دریافت حال کرنے پر موصوف نے بڑی مشکل سے بتایا کہ پیٹنے والا غلط آدمی کو پیٹ رہا تھا اس لیے وہ اس کی حماقت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تو حضرت یہ تو رہا پٹنے کا سلیقہ ایک دوسرے سلیقہ کا حال سنیے۔ سننے کو تو شاید آپ نے سنا ہو، لیکن ریڈیو سن کر ممکن ہے آپ اسے جھوٹ سمجھیں اس لیے زیادہ لطف اُٹھائیں تو وہ قصہ یہ ہے۔ آپ نے وہ مثل تو سنی ہوگی، اندھیر نگری چوپٹ راجا، ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا۔ ایک گرو اپنے چیلوں کو ہمراہ لے کر کسی تعلیمی یا تبلیغی ایکس کرشن پر جارہے تھے۔ اثنائے سفر میں ایک آبادی سے گزر ہوا جہاں یہ طرفہ تماشا دیکھا کہ معمولی ساگ پات اور لڈو پیڑا ایک ہی بھاؤ بکتے تھے!

گرو نے چیلوں سے کہا کہ یہاں سے فوراً بھاگو ورنہ عنقریب کوئی آفت آنے والی ہے۔ سب نے اس پر عمل کیا سوائے ایک چیلے کے جس نے کہا ''میں تو فکر و عمل کی آزادی کا قائل ہوں۔ خدا نے عقل نہیں دی ہے تو لڈو پیڑے دیے ہیں، میں ان کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔'' قافلہ چل دیا اور یہ مزے اُڑانے لگے!

ایک دن ایسا ہوا کہ ایک مجرم کو پھانسی دینے کے لیے میدان میں لائے۔ خلقت کا ہجوم تھا بادشاہ سلامت بھی موجود تھے۔ مجرم کو پھانسی کے تختے پر لے جانے لگے تو ایک مصاحب نے

عرض کیا، جہاں پناہ! مجرم بڑا کمزور ہے اور حقیر فقیر سا لگتا ہے۔ لطف تو جب تھا کہ کسی موٹے تازے ہٹے کٹے کو پھانسی دی جاتی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ مجرم کو چھوڑ دیا جائے اور اس کے بدلے کسی موٹے تازے شخص کو پھانسی دی جائے۔ تلاش کی گئی تو سب سے فربہ وہی چیلے صاحب ملے جنھوں نے عقل اور لڈو کے درمیان انتخاب کرنے میں اپنے فکر و عمل کو آزاد رکھا تھا۔ چنانچہ اُن کو کشاں کشاں پھانسی دینے کے لیے چلے۔

اتفاق سے گرو بھی اس وقت سفر سے آئے تھے اور ہجوم میں کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ چیلے کی نظر جا پڑی تو گڑگڑا کر گرو سے نجات دلانے کی اپیل کی۔ گرو پھانسی کے تختے کے قریب پہنچ کر مراقبہ میں مشغول ہو گئے اور تھوڑی دیر بعد چونکے تو خوشی میں آکر ناچنے لگے۔ یہ ماجرا دیکھ کر لوگ ان کو گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے لائے۔ دریافت حال کرنے پر فرمایا۔ ''دھرما اوتار میں نے اپنے گیان دھیان سے وچار کیا تو معلوم ہوا کہ جس کو اس شبھ لگن میں پھانسی دی جائے گی وہ سیدھا بیکنٹھ پہنچے گا جہاں اس کے سواگت کے لیے بڑا انتظام کیا جا رہا ہے۔'' بادشاہ نے جُھرجُھری لے کر فرمایا، ''اگر ایسا ہے تو ہٹے کٹے آدمی کی بجائے میں پھانسی پر لٹکوں گا۔'' چنانچہ یہی ہوا۔ بادشاہ سلامت بیکنٹھ کو سدھارے اور گرو اپنے چیلے کو ساتھ لائے۔ مرنے کا یہ سلیقہ بھی بُرا نہیں!

مار کھانے اور مر جانے کے سلیقے تو آپ نے دیکھ لیے۔ اب رہا جینے کا سلیقہ، اس کا لطیفہ بھی سن لیجیے۔ دو شخص قید خانہ کی ایک ہی کوٹھری میں بند تھے۔ رات بڑی اندھیری اور بھیانک تھی اور طوفان شدت پر۔ طوفان تھما تو دونوں کوٹھری کے دروازے پر آئے اور سلاخوں سے جھانکنے لگے۔ ایک یہ کہتا ہوا واپس گیا۔ ''اُف کس بلا کی تاریکی ہے۔'' دوسرا وہیں کھڑا رہا اور اپنے ساتھی سے بولا۔ ''دیکھنا ایک تارا بھی چمک رہا ہے۔'' لطیفہ تو ختم ہو گیا، لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ بات ختم نہیں ہوئی بلکہ اس میں جینے کا ایک سلیقہ چھپا ہوا ہے اگر اس لطیفہ کو آپ پا نہ سکیں یا اس کے قائل نہ ہوں تو ماریے گولی اس سارے قصے کو۔ میں کہتا ہوں ایسی حرکت ہی کیوں کی جائے کہ قید بھگتنی پڑے۔ طوفان آئے اور آپ کے دشمن ستاروں سے آگے (یا پیچھے) جہاں اور بھی ہیں کے پھیر میں پڑیں۔

کسی کام کو خوبی و خوب صورتی سے کرنا سلیقہ ہے۔ یوں بھی کہہ لیجیے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ کسی بات کو اس طرح کہنا یا کرنا کہ اس کا حق ادا ہو جائے سلیقہ ہے۔ اس بنا پر میں کچھ ایسا سمجھتا ہوں کہ مذہب، اخلاق، آرٹ اور علوم سب کا بہت کچھ مدار سلیقہ اور شائستگی پر ہے۔ آپ کی اسی دلّی کے ایک خاندانی طبیبؒ کا لطیفہ مشہور ہے جن سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ "حکیم صاحب آپ کے علاج سے بھی لوگ مرتے ہیں اور فلاں عطائی کے علاج سے بھی مرتے ہیں پھر آپ دونوں میں فرق کیا رہا؟" حکیم صاحب نے فرمایا کہ "کوئی فرق نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ بھڑوا بے قاعدہ جان لیتا ہے میں قاعدہ سے جان لیتا ہوں!" یہ قاعدہ بھی سلیقہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ آپ کو سلیقہ کے بارے میں میری ان باتوں سے اتفاق ہو یا نہیں، اتنا تو میں اور آپ دونوں مانیں گے کہ کچھ اور نہیں تو کتابوں میں یہ باتیں اسی طرح لکھی ہوئی ملتی ہیں۔

میر نے ایک جگہ بڑے پتے کی بات کہی ہے:

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا!

میر جس محبت کے قائل تھے، وہاں سلیقہ سب کچھ نہیں تو بہت کچھ تھا۔ میر ہی کی زبان سے سلیقہ کے بارے میں آپ ایک اور بات سننے پر آمادہ ہوں تو ان کا ایک دوسرا شعر سناؤں۔ دیکھنا یہ چاہتا ہوں کہ جدید تنقید اور جدید اسلحات جنگ کے زمانہ میں آپ پر میر کی گرفت کیسی ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا!

یہ ادب بھی سلیقہ ہی کا بھائی بند ہے۔

آپ منتظر ہوں گے کہ میں یہ بتاؤں کہ میں نے کس سلیقہ سے زندگی بسر کی ہے یا جینے کا میرے کیا سلیقہ ہے۔ میری مشکل یہ ہے کہ میں نے سلیقہ سے پہلے جینا شروع کر دیا تھا۔ اب میرا شمار بوڑھوں میں ہوتا ہے۔ یہ رتبہ مجھے بہ اعتبار ریاض بھی حاصل ہے اور بہ اعتبار ریاضی بھی!

مجھے جینے کا سلیقہ ہے یا نہیں یہ خود مجھے بھی نہیں معلوم۔ مرنے کا بھی کچھ ایسا حوصلہ نہیں جینے کا سلیقہ نہیں۔ مرنے کا حوصلہ نہیں۔ بظاہر نہایت نامعقول سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن میں نے

دیکھا یہی ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی اور موت کا پروگرام بنا کر جینا شروع کرتے ہیں وہ عموماً غبی ہوتے ہیں یا اپنی بیویوں پر فخر کرتے ہیں۔ ذہین بیویاں ہمیشہ غبی شوہروں پر فخر کرتی ہیں۔ یہ تحقیقات آپ کے سپرد کرتا ہوں کہ شوہر غبی ہوتے ہیں اس لیے بیوی پر فخر کرتے ہیں یا بیوی پر فخر کرنے سے غبی ہو جاتے ہیں۔ البتہ میرے نزدیک یہ امر مسلّم ہے کہ کوئی بیوی آج تک غبی نہیں دیکھی گئی۔

خود میں نے کوئی جینے کا سلیقہ نہیں برتا، لیکن زندگی نے میرا ساتھ بڑے سلیقہ سے دیا ہے۔ زندگی کو جس شخص پر اعتماد ہو جاتا ہے تو وہ اس شخص سے کبھی دخل فصل نہیں کرتی۔ یہی بات شخص کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ اگر شخص زندگی کا احترام کرے اور اسے ایک قیمتی امانت اور آزمائش سمجھے تو وہ ایسا سلیقہ وضع کرے گا جو زندگی اور خود اس کے شایانِ شان ہوگا۔ زندگی کا یہ پھیر ہمیشہ یاد رکھیے کہ وہ ہر شخص سے ایک ہی قسم کا سمجھوتا نہیں کرتی۔ اس لیے یہ ناممکن ہے اور نامناسب بھی کہ امریکہ سے کوئی جینے کے بنے بنائے بے شمار سانچے تیار کرا کے اپنے ووٹروں میں تقسیم کردے۔

ہر شخص کے جینے کا سلیقہ بھلا ہو یا بُرا اس کا اپنا ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو زندگی بسر کرنا محال ہو جائے۔ ایک رندِ خرابات سے ملّائے مسجد کی زندگی بسر کرنے کو کہیے یا ملّا سے کہیے کہ وہ رند خراباتی بن جائے تو ظاہر ہے دونوں کا انجام دردناک ہوگا، اور یقیناً اس کا انجام بھی کچھ قابلِ رشک نہ ہوگا جو اس طرح کے اصول کی وکالت کرے یا اس قسم کا کوئی قانون نافذ کرے۔ جینے کے سلیقہ کا تمام تر دارومدار شخص کے حوصلہ یا ہوس ناکی پر منحصر ہے۔ ٹریجڈی وہاں ہوتی ہے جہاں حوصلہ اور ہوس ناکی کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنے میں بے ایمانی راہ پا جاتی ہے۔ میں بے ایمانی کی جگہ بے وقوفی کہنا چاہتا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ کوئی شخص اپنا نفع سوچنے میں بے وقوفی نہیں کرتا اور بے ایمانی سے نہیں چوکتا۔

مجھے تمام عمر نہ اس کی فرصت ملی نہ اس کا حوصلہ ہوا کہ اپنی ذمہ داریوں اور اپنی دلچسپیوں کے علاوہ کسی اور کی ذمہ داری یا دلچسپی میں حصہ لیتا۔ اگر اپنی ذمہ داریوں میں دلچسپی لی جائے اور اپنی دلچسپیوں کی ذمہ داری کا احساس ہو تو دوسرے کے پھٹے میں پاؤں ڈالنے کی عبادت کی

ضرورت باقی نہیں رہتی، لیکن اگر کسی نے دوسرے کے پھٹے میں پاؤں ڈالنے ہی کو اپنے لیے جینے کا سلیقہ بنالیا ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ اس طرح کے لوگ اکثر اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس حرکت سے وہ خود اپنے بہت سے نفسیاتی امراض کو بڑے مضحک طور پر بے نقاب کرتے رہتے ہیں۔

میں سمجھتا رہا اور اب بھی سمجھتا ہوں کہ میں اس دنیا میں ایک محدود حلقہ میں ایک محدود زمانہ تک ایک محدود خدمت کے لیے پیدا کیا گیا۔ اس لیے اللہ نے مجھے اتنی ہی عقل اتنا ہی حوصلہ اور اسی قسم کی شکل وصورت دی ہے کہ میں اپنا کام چلاتا رہوں، اور کسی ایسے چکر میں نہ پڑوں جو میرے بوتے کا نہ ہو۔ اگر کسی کی بیوی اپنے شوہر کے دونوں کان پکڑ کے صبح وشام جھنجھوڑ دیتی ہو تو میرے کان پر جوں نہ رینگے گی۔ بشرطیکہ وہ شوہر میں ہی نہ ہوں، اور خدا نہ کرے ایسا ہو بھی تو میں زیادہ سے زیادہ یہ کروں گا کہ کسی اچھے سرجن سے اپنے دونوں کان ترشوا کر ان نیک بخت کے حوالہ کردوں گا۔ اس طرح کی زندگی بسر کرنے سے مجھے بڑا نفع ہوا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو میری جیسی محدود اور معمولی استعداد رکھتے ہوں اور ان کو اتنی زیادہ نعمتیں میسّر ہوئی ہوں جتنی کہ مجھے۔ اس لیے کبھی کبھی اس سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ دنیا اب بھی کتنی معصوم اور سادہ ہے کہ میں اور مولوی دونوں ولادتِ اطفال اور سعادتِ دارین میں حصہ لیتے رہتے ہیں۔ اس طرح کی زندگی بسر کرنے کی سب سے بڑی نعمت جو مجھے نصیب ہوئی وہ یہ تھی کہ میں اُس موذی مرض میں کبھی مبتلا نہ ہوا جسے جلنا کہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ مجھے تمام عمر یونیورسٹی کی فضا، علم وادب کا مطالعہ، شریف نوجوانوں کا ساتھ سیکھنے سکھانے، سلجھنے سنورنے، اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے کے مواقع میسّر رہے۔

مجھ میں کمزوریاں بھی ہیں جو مجھے بہت عزیز ہیں اگر یہ نہ ہوتیں تو وہ خوبیاں جو مجھ میں ہیں کبھی اُجاگر نہ ہوتیں۔ مجھے اکثر یہ محسوس ہوا کہ بڑے اور اچھے کام کے لیے حوصلہ اور شوق کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ پلتے اور پنپتے ہی ہیں بعض کمزوریوں کے سائے میں غالب کا مطلب رہا ہو یا نہیں مجھے اپنے اُلٹے سیدھے عقیدہ کو اپنائے رکھنے کے لیے اس مصرعہ سے بڑا سہارا ملتا ہے۔

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی!

جینے کا میرا دوسرا سلیقہ یا تصور یہ ہے کہ زندگی نادر، نا قابلِ فہم، مقدس، اعلیٰ ارضی یا غیر ارضی کچھ ہی کیوں نہ ہو، بے نہایت مزے کی چیز جسمانی، ذہنی، روحانی اور اخلاقی سبھی اعتبار سے زندگی کا اس سے بہتر کوئی اور تصور ہو نہیں سکتا۔ مزے کی چیز سے میری مراد شراب و شاہد و شعر وغیرہ قسم کی چیز سے نہیں ہے بلکہ دوسری اور بہت سی چیزیں ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہم اپنی خوبیوں سے دوسروں کی خامیوں کی اصلاح اور تلافی کر سکتے ہیں۔ کسی شے یا حالت کو بہتر بنا دینے کی قابلیت اور حوصلہ سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا نعمت ہو سکتی ہے۔

خدمت کرنے کا میرا تصور بہت ہی معمولی اور مختصر ہے وہ اس لیے کہ میری یہی اور اتنی ہی بساط ہے، چنانچہ جتنا بڑا اپنے نزدیک میں ہوں اس سے بڑا بننے کے لیے مارا مارا پھرنے، جیل خانے جانے، لوگوں پر عافیت حرام کر دینے یا شہادت پا جانے کے پھیر میں کبھی نہیں پڑا۔ میں خدمت کرنے کو ایک ایسا قرض اُتارنے کا مترادف سمجھتا ہوں جو بغیر لیے بھی عائد رہتا ہے۔ چنانچہ مرنے کے بعد اس دنیا میں کوئی موریل بنوانے یا بہشت میں قصرِ زمرّدیں حاصل کرنے کی تمنا میں نے کبھی نہ کی۔ بہشت کی تمنا میں نے اکثر ایسے ہی لوگوں کو کرتے پایا جو دنیا میں دوسروں کی زندگی جہنم بنا چکے ہوتے ہیں۔

جینے کا ایک سلیقہ یہ بھی ہے کہ خط بڑھا ہو، چپل ٹوٹی ہو، ہاضمہ ٹھیک اور شاعری کا واک ہو اور ادب برائے نفضیحت اور فضیحت برائے زندگی کے قائل ہوں۔

میں نے چاہے جس سلیقہ سے زندگی بسر کی ہو یا اب کرنی پڑے، ایک چکّر میں اکثر مبتلا رہا ہوں۔ وہ یہ کہ جب اولاد ناتواں اور ناسمجھ تھی تو میرا تمام وقت آرام، توجہ اور ذرائع اور وسائل اس پر صَرف ہوتے کہ وہ اچھی تعلیم، تہذیب اور تندرستی سے بہرہ مند ہوں۔ اس سلسلہ میں ان کی جیسی نگرانی کرنی پڑتی ہے، وہ ان کی ناسمجھی کی بنا پر اُن پر کتنی گراں گزرتی تھی وہ مجھے خوب معلوم ہے۔ اس لیے کہ میں خود اس مرحلہ سے گزرا ہوں، لیکن اب جب کہ میں بوڑھا اور وہ جوان ہوئے تو ان کی توجہ اس پر صَرف ہونے لگی کہ میں اپنے آپ کو اُن کی پسند کی ہوئی تربیت و تہذیب میں دے دوں، مثلاً یہ کہ بش شرٹ، نیکر اور چپل پہن کر جدید تنقیدی، جدید شاعری اور فلم اسٹارس کے کارناموں کا وظیفہ پڑھوں اور نوجوان عورتوں کو خواہ وہ میری یا میرے اعزا اور احباب ہی کی

لڑکیاں کیوں نہ ہوں اور میرے سامنے پیدا ہوئی اور بڑھی ہوں سلام کروں اور تعظیم دیتا پھروں، اور ایسا نہ کروں تو وہ میری بدتوفیقی اور اپنی رسوائی پر کڑھیں۔ بعض اوقات مجھے اس پر بڑی ہنسی آتی ہے کہ یہ نوجوان اپنی اور اپنی بیوی بچوں کی اصلاح وانجام کی فکر کرنے کی بجائے اپنے باپ دادا کی اصلاح وانجام کی فکر میں کیوں پڑتے ہیں۔ بچپن کے بعد جوانی آتی ہے، جب الیکشن، آرٹ، اغوا وغیرہ کا سامنا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر والدین اپنے بچوں کو نیچ اونچ دکھاتے سمجھاتے رہیں تو کوئی ایسی بُرائی نہیں لیکن بڑھاپے کے بعد کیا آنے والا ہے جس کے لیے یہ اولاد والدین کو تبلیغ وتنبیہ کرتی ہے!

پھر بھی میری رائے ہے کہ جب والدین بوڑھے اور اولاد جوان ہو جائے تو والدین کو میدان چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ میدان چاہے خاندان کا ہو، چاہے علم وادب کا، چاہے حکمت وفن کا، چاہے اخلاق ومذہب کا۔ بوڑھوں کا نئی نسل سے اپنی منوانے کی ہوس میں مبتلا رہنا میرے نزدیک ٹھیک نہیں ہے، اور بوڑھوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ نوجوان کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا تو دنیا تباہ ہو جائے گی۔ میری اس رائے کو تقویت پہنچتی ہے ہندوؤں کی اس قدیم روایت سے کہ گرہست آشرم کا زمانہ ختم کر کے دنیوی کاروبار سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔ البتہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں کہ ایک گرہست آشرم کو ختم کرنے کی بجائے کوئی شخص دوسرا تیسرا گرہست آشرم شروع کر دے بہرحال یہ شعر اپنی جگہ مسلّم ہے۔

رہرو راہِ محبت (یا ضعیفی) کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں!

آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ جینے کا سلیقہ ہماری اپنی زندگی خود فراہم کرتی رہتی ہے۔ اس کے لیے بالکل ضروری نہیں ہے کہ کتابوں کا مطالعہ کیا جائے، کسی پیر فقیر سے مشورہ کیا جائے یا جلسوں اور اخباروں میں زہر اُگلا جائے۔ ایک صبح سے دوسری صبح تک کائنات اپنی تمام نیرنگیوں کو جس جس انداز سے پیش کرتی رہتی ہے، ہم جس سوسائٹی میں رہتے ہیں، اس میں جتنے معمولی یا غیر معمولی واقعات ہوتے رہتے ہیں، ہمارے ذہن ودماغ میں جتنی چھوٹی بڑی لہریں ہر آن اُبھرتی مٹتی رہی ہیں ان سے نبٹتے رہنا کبھی ان کے قابو میں چلے جانا کبھی ان کو قابو میں رکھنا بے شمار

ایسے اشارے ہیں جن سے جینے کا سلیقہ سیکھ سکتے ہیں۔ وہ ساری کائنات جو ہم دریافت کر سکے ہیں یا جو ہماری دریافت سے باہر ہو یا جو ہمارے لیے ہو یا ہم اس کے لیے یا دونوں کسی اور کے لیے یا کوئی کسی کے لیے نہ ہو، معلوم نہیں کس کے سلیقہ کے ترجمان ہیں۔ ممکن ہے یہ سب صرف ایک عظیم الشان اور نا قابلِ بیان سلیقہ ہی ہو جس کو ہم نے طرح طرح کے نام دے رکھے ہیں!

لیکن خدا کے لیے اس موقع پر مسکرا کر یا آہِ سرد بھر کے یہ شعر نہ پڑھنے لگیے گا:

فلک کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں [1]

اس لیے کہ ایسے مواقع پر پٹے ہوئے اشعار بالخصوص اس شعر کے پڑھنے سے میں اپنے آپے میں نہیں رہتا اور ڈر کے مارے شعر پڑھنے والے سے تعرض نہیں کرتا، لیکن غیر شعوری طور پر بعض ایسی حرکتیں ضرور سرزد ہو جاتی ہیں جو میرے نامۂ اعمال میں خود بخود درج ہو کر اس کی سیاہی میں اضافہ کر دیتی ہیں۔

(علی گڑھ میگزین، علی گڑھ۔ طنز و ظرافت نمبر 1953)

●●●

نیا سال اور پامال اشعار

جہاں مذہب کا چرچا ہوگا وہاں اولاد کی کثرت ہوگی اور جہاں یہ دونوں ہوں گے وہاں شاعری کی وبا پھیلے گی۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں جہاں آبادی کی کثرت ہوگی وہاں روزی کی قلت ہوگی اور جہاں روزی کم ہوگی وہاں شعرا زیادہ ہوں گے اور جہاں ایسا ہوگا وہاں روس یا امریکہ بھی ہوگا۔ اس لیے کہ روس میں شاعری کا دخل نہیں اور امریکہ میں روزی کی کمی نہیں۔ ایسے موقع پر ہم غیر مذہبی جمہوریہ زادوں کو بے اختیار یا تو خدا یاد آتا ہے یا اردو کے اشعار، کبھی کبھی دونوں مثلاً یہی:

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے![1]

شعر ہماری زبان پر ویسے ہی بے تکلف یا بے لگام آتا ہے جیسے جھوٹ۔ معلوم نہیں کس پلان یا شرم دان کی زد میں آکر ہم نے کبھی شعر گوئی یا شعر خوانی شروع کی تھی کہ بقول اقبال (باندکِ تصرف):

کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں شعر
دشت و در میں، کوہ میں، گلشن میں، ویرانے میں شعر

---

1 مکمل شعر:

زندگی اپنی کچھ اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے زندگی اور ادب میں شعر پڑھے لکھے بغیر سانس لینا محال ہو۔ ''دنیا جہان'' میں شاید ہی کوئی ایسی قوم یا ادب ملے جس کے اعصاب پر اشعار اس طرح سوار ہوں جیسے ہمارے ہاں، اسی اعصاب پر سوار ہونے کو دیکھ لیجیے، کن دشواریوں سے اقبال کے مشہور شعر کو یہاں پڑھنے لکھنے سے اپنے کو باز رکھ سکا ہوں جہاں انھوں نے عورت کو یہاں کے شاعروں اور صورت گروں پر سوار بتایا ہے کچھ اسی طرح جیسے اردو کی پرانی جنتریوں میں ''نوروز عالم افروز'' موش یا مینڈک پر سوار عالمِ غیب سے برآمد ہوتے دکھائے جاتے ہیں۔ لباس کا رنگ کچھ ہوتا، رُخ کسی جانب ہوتا اور دونوں ہاتھوں میں بھی کچھ ''متفرقات'' ہوتے۔ جناب نوروز کو اس عالم میں دیکھ کر اختر شناس کچھ اس طرح کا حکم لگاتے کہ کہاں لڑائی ہوگی، کہاں قحط پڑے گا، طلبا کس طرح نعرے لگائیں گے، والدین کتنے فاقہ کریں گے اور مزدور کیسے فلمی گانے گائیں گے۔ عشاق بتوں سے اور ہم آپ روس یا امریکہ سے کیا فیض پائیں گے! شعر خوانی کے اسی آشوب سے بچنے بچانے کے لیے اب اس طرح کے اشعار کو رواج دیا جارہا ہے جس کے لیے نہ شاعر کو اعصاب کی ضرورت پڑے نہ سامع کو مثلاً آزاد نظم وغیرہ!

معلوم نہیں وہ کون سی ساعت تھی جب کسی نے چند ایسے بدنصیب اشعار کہہ دیے جن کو بعد میں آنے والوں نے اس طرح چرخ پر رکھا کہ مقررہ ساعت یا موقع کے آنے کے ساتھ اس شعر کا الارم یا اعلان خود بخود ہونے لگتا ہے، یہی نہیں بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ موقع اور موضوع کی صرف بھنک مل جائے مقررہ شعر کہیں کسی حال میں ہوگا کھینچ بلایا جائے گا، اور ''عرض'' کردیا جائے گا۔ یہ مرض لکھنے ہی میں نہیں بات چیت کرنے میں بھی نمایاں ہے! آپ تھوڑی سی توجہ سے کام لیں تو تحریر میں کم سے کم آٹھ دس سطر پہلے اور تقریر میں دو تین منٹ پہلے بتادیں گے کہ مقالہ نگار یا مقرر کون سا شعر لکھنے یا پڑھنے والا ہے جس کے لیے یہ تمام چہرہ باندھا جارہا ہے۔ اگر اس موقع پر آپ کے ذہن میں ایک سے زیادہ اشعار آئیں تو یقین رکھیے کہ وہی شعر استعمال میں آئے گا جو نسبتاً زیادہ پامال ہوگا!

اس طرح کی حرکت بات چیت میں بھی ملے گی۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ پامال اشعار اور کلمات اس فخر کے ساتھ استعمال کرتے ہیں جیسے ان کے مصنف وہ خود تھے اور ان کو

استعمال کرنے کے بعد وہ دوسروں سے بدرجہا ممتاز ہو گئے۔ دراصل یہ بڑے اچھے اشعار ہوتے ہیں، لیکن سطحی ذوق رکھنے والوں کے ہاتھ رسوا ہو جاتے ہیں جس طرح شریفوں کی محفل میں نامعقول اور ناملائم الفاظ کا استعمال بُرا ہے اسی طرح ان کی صحبت میں بندھے ٹکے اشعار پڑھنا اور اسی طرح کے فقروں کو کام میں لانا بھی بدمذاقی ہے۔ البتہ میں ان لوگوں کا احترام کرتا ہوں بلکہ ان پر رشک کرتا ہوں جو غیر معروف اور تقریباً اَن سنے اشعار اس درجہ برمحل استعمال کرتے ہیں کہ پہلے سے اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ان میں اتنی جان تھی! بڑائی اس میں ہے کہ اپنے ذوق و ذہانت سے گم نام کس مپرس اور معمولی اشعار میں جان ڈال دی جائے نہ یہ کہ اپنی بدتوفیقی سے (جو نادانستہ بھی ہو سکتی ہے!) اچھے اور مشہور اشعار کو سر بازار بے وقعت کر دیا جائے۔

تقسیم ملک کے بعد بعض تحریکوں کا بروئے کار آنا دلچسپی سے خالی نہیں مثلاً ''آوارہ گرد اشعار'' کا پتہ لگانا کہ یہ کس شاعر کے ہیں یا کس شاعر سے منسوب ہو گئے ہیں۔ اس کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ ''آوارہ گرد اشعار'' کے ساتھ شعرا بھی ''کیا تم نہیں دیکھتے وہ شعرا وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔'' آوارہ گرد ہوتے جا رہے ہوں اور ہمسایہ ملکوں میں ان کی نقل و حرکت اور روٹی کپڑے کا مسئلہ بین الاقوامی پیچیدگی کا موجب بنتا جا رہا ہو۔ اس کا بھی اندیشہ ہو سکتا ہے کہ ان آوارہ گرد شعرا کا قبیلہ بنی اسرائیل کے بعض قبیلوں کی طرح لاپتہ ہو جائے اور ان کا سراغ لگانا تاریخ یا بشریات کے طالب علم کے لیے دردِ سر بن جائے۔

اب جب کہ لاسلکی، ہوائی جہاز، کلچرل ڈیلی گیشن اور انفلوائنزا نے دنیا کی طنابیں کھینچ کر ہر ہر قوم اور ملک کو ایک دوسرے کا پڑوسی بنا دیا ہے، ایک کو دوسرے کے پھٹے میں پاؤں ڈالنے کا بھی حق پیدا ہو گیا ہے اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ طاقت ور ہمسائے کے ہاں 'مردے از غیب'' کی طرح حق ناحق سے برآمد ہو جاتا ہے، اور ''کارے بکند''! شعرا کی درآمد برآمد پر ہر ملک پابندیاں عائد کرنے پر یوں مجبور ہے کہ دنیا کا کوئی قانون شعرا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، شاید اس لیے کہ شعرا کا سب کچھ پہلے سے بگڑا ہوتا ہے، اور خود یہ دنیا کے جس قانون کو چاہیں بگاڑ دیں۔ اس خطرے کا احساس کر کے بعض حلقوں میں ایسے بدمذاقوں کی مانگ بڑھ گئی ہے جو کسی شاعر کے شعر کو بار بار اور بے ضرورت پڑھ لکھ کر اس شعر کے اثر اور اس کے مصنف کی حیثیت کو یکسر غارت کر سکتے ہیں۔

اس طرح آپ دیکھیں گے شعرا یا شاعری کی سمیّت کو سوسائٹی کے نظام جسم میں باطل کر دینے کے لیے وہی اصول برتا جانے لگا ہے جو انجکشن کا ہے یعنی ہر مرض کے فرعون کے لیے اسی کا موسیٰ نظامِ جسم میں پیدا کر دیا جائے!

یہ تو رہا اشعار اور شاعروں کا قصہ تقسیم ملک کے بعد اور اس کے نتیجہ کے طور پر ایک تحریک اور برسرکار ہے، یعنی جس طرح مغویہ عورتوں کا پتہ لگا کر ان کے وطن اور ورثا کے ہاں پہنچا دیتے ہیں، اسی طرح زبانوں میں اس کا پتہ لگایا جائے کہ کون کون سے اور کتنے الفاظ ایسے ہیں جن کو اغیار یا اقربا بھگالے گئے ہیں یا لے بھاگے ہیں یا جنھوں نے خود کچھ شعور تھوڑا بہت نیم شعور اور بقیہ لاشعور کی زد میں آ کر غیر کفو سے ناتا جوڑا ہے۔ ایسوں کو بھی دھوپ دھونی دے کر اپنانے کی کوشش کی جائے ورنہ اس کا حقہ پانی بند کر دیا جائے!

کسی شاعر کی اہمیت اور شہرت کا اندازہ اس سے بھی کرتے ہیں کہ اس کے کتنے اشعار زبان زد ہو گئے ہیں۔ اسی طرح ان اشعار کی بدنصیبی کا بھی اندازہ کیا جاتا ہے جو بے شمار ایسے لکھنے یا تقریر کرنے والوں کا تختۂ مشق بن گئے ہیں جن کے خوش مذاق ہونے کے بارے میں بہ مشکل کلمۂ خیر کہا جاسکتا ہے۔ یہ ہماری ذہنی کم مائیگی کی دلیل ہے کہ خود سوچنے اور نئی راہیں دریافت کرنے کے بجائے ڈھرّے پر لگ رہنے کے خوگر ہو گئے ہیں۔ جس طرح نوجوان لڑکے لڑکیاں مشہور ایکٹر ایکٹرسوں کی سج دھج لباس اور اس قسم کی دوسری باتیں اختیار کر کے ''نقل مطابق اصل'' نہیں بلکہ ''اصل مطابق نقل'' کے قائل ہو جاتے ہیں، اسی طرح معمولی شعرا مشہور شعرا کی نکالی ہوئی زمین یا ان کے اختیار کیے ہوئے عنوان کو سامنے رکھ کر طبع آزمائی کرتے ہیں اور ہم سے آپ سے پوچھے بغیر یقین کر لیتے ہیں کہ انھوں نے ان شعرا کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رکھا! لیکن اس پر غور کرنے کے لیے بالکل آمادہ نہیں ہوتے کہ وہ خود دوم یا سوم درجے کے شاعر نہ ہوتے تو اوّل درجے کے شعرا کی نقل کیوں کرتے۔ اس کہنے سے یہ مقصود نہیں کہ ایک ہی بحر قافیہ ردیف یا موضوع پر دو یا زائد شاعروں کو طبع آزمائی نہ کرنا چاہیے اس طرح کی مثال صفِ اوّل کے شعرا کے ہاں بھی ملتی ہے اور کثرت سے ملتی ہے۔ بڑے شعرا کی پیروی کرنا بھی بُری بات نہیں۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ اس طرح کی پیروی کو نہ تو پیشہ بنانا چاہیے نہ اپنے بارے میں غلط رائے قائم کرنے کا

وسیلہ! جوش کی مشہور نظم پروگرام (رنداں میں ملے گا احزاں میں ملے گا) لوگوں کو ابھی بھولی نہ ہوگی۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف سے ہر طرح کے شعرا طبع آزمائی یا قسمت آزمائی کے لیے اس طرح ٹوٹ پڑے جس طرح دعوت میں کھانوں پر ندیدے گرتے ہیں بالخصوص لکھے پڑھے کھاتے پیتے ندیدے! اور سب نے اس یقین کے ساتھ فکر سخن فرمایا کہ اس کے بعد تمام دوسرے شعرا (جوش سمیت) منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ جائیں گے، لیکن ہوا صرف اتنا کہ فانی کی نظم کے علاوہ جوان کے رنگ میں منفرد تھی بقیہ تمام دوسرے شعرا کی نظموں کا ''طعام و قیام'' کسی دوسرے کے حافظے میں چند دنوں تک بھی نہ رہ سکا —— شاید ان کی اپنی نظموں کا خود ان کے حافظے میں بھی!

اس کے ساتھ ایک دوسرا سانحہ بھی کچھ کم دلچسپ یا عبرت انگیز نہیں ہے جس زمانے میں مسلم لیگ اور کانگریس کا مناقشہ شدت پر تھا اور قائدِ اعظم اور مہاتما جی کی خط و کتابت جاری تھی۔ اخبارات میں کسی نہ کسی کی طرف سے اس طرح کا اعلان ہوتا رہتا کہ دوسرا اپنے بیان سے انحراف کر رہا ہے۔ اگر فلاں وقت تک فلاں امر کی وضاحت نہ کی گئی تو پوری خط و کتابت شائع کر دی جائے گی۔ ایک دن اردو کے ایک ''واحد'' اخبار میں کیا دیکھتا ہوں کہ اپنے ہی یہاں کے ایک صاحب کا (جن کی حیثیت کیا بتاؤں کہ کیا تھی) قائدِ اعظم اور مہاتما جی میں سے ایک کے نام خط شائع ہوا ہے۔ جس کا مضمون یہ تھا ''ہر گاہ میں نے آپ کو متعدد خطوط لکھے، آپ نے کسی کا جواب نہ دیا، اگر آپ نے مزید پہلوتہی کی اور ایک ہفتہ کے اندر جواب موصول نہ ہوا تو میں خط و کتابت (خط ہی نہیں کتابت بھی!) شائع کر دوں گا!''

اقبال کا وہ شعر ہم سب کو یاد ہے جس میں انھوں نے چمن میں ''دیدہ ور'' پیدا کرنے کے لیے نرگس کو ہزاروں سال سے رونے پر مامور کر رکھا ہے۔ مقرر یا مقالہ نگار جن صاحب کو بڑا دکھانا چاہتے ہیں (جس میں کبھی کبھی خود اقبال شامل کر لیے جاتے ہیں) اس کی شان میں یہ شعر پڑھ یا لکھ دیتے ہیں! وہ صاحب رات ہی بھر میں کیوں نہ بڑے بن گئے ہوں۔ غریب نرگس کے رونے کی ہزار سالہ مدت میں کوئی تخفیف نہیں کی جاتی۔ لکھنے والا اور اس کا ہیرو دونوں کتنے ہی گئے گزرے کیوں نہ ہوں یہ شعر ضرور پڑھا جائے گا۔ اس لیے کہ کسی دعویٰ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے پامال شعر سے زیادہ بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس طرح آپ دیکھیں گے شعرا یا شاعری کی ہیئت کو سوسائٹی کے نظامِ جسم میں باطل کر دینے کے لیے وہی اصول برتا جانے لگا ہے جو انجکشن کا ہے یعنی ہر مرض کے فرعون کے لیے اسی کا موسیٰ نظامِ جسم میں پیدا کر دیا جائے!

یہ تو رہا اشعار اور شاعروں کا قصہ تقسیم ملک کے بعد اور اس کے نتیجہ کے طور پر ایک تحریک اور برسرِ کار ہے، یعنی جس طرح مغویہ عورتوں کا پتہ لگا کر ان کے وطن اور ورثا کے ہاں پہنچا دیتے ہیں، اسی طرح زبانوں میں اس کا پتہ لگایا جائے کہ کون کون سے اور کتنے الفاظ ایسے ہیں جن کو اغیار یا اقربا بھگا لے گئے ہیں یا لے بھاگے ہیں یا جنھوں نے خود کچھ شعور تھوڑا بہت نیم شعور اور بقیہ لاشعور کی زد میں آکر غیر کفو سے ناتا جوڑا ہے۔ ایسوں کو بھی دھوپ دھونی دے کر اپنانے کی کوشش کی جائے ورنہ اس کا حقہ پانی بند کر دیا جائے!

کسی شاعر کی اہمیت اور شہرت کا اندازہ اس سے بھی کرتے ہیں کہ اس کے کتنے اشعار زبان زد ہو گئے ہیں۔ اسی طرح ان اشعار کی بدنصیبی کا بھی اندازہ کیا جاتا ہے جو بے شمار ایسے لکھنے یا تقریر کرنے والوں کا تختۂ مشق بن گئے ہیں جن کے خوش مذاق ہونے کے بارے میں بہ مشکل کلمۂ خیر کہا جا سکتا ہے۔ یہ ہماری ذہنی کم مایگی کی دلیل ہے کہ خود سوچنے اور نئی راہیں دریافت کرنے کے بجائے ڈھرّے پر لگ رہنے کے خوگر ہو گئے ہیں۔ جس طرح نوجوان لڑکے لڑکیاں مشہور ایکٹر ایکٹرسوں کی سج دھج لباس اور اس قسم کی دوسری باتیں اختیار کر کے ''نقل مطابق اصل'' نہیں بلکہ ''اصل مطابق نقل'' کے قائل ہو جاتے ہیں، اسی طرح معمولی شعرا مشہور شعرا کی نکالی ہوئی زمین یا ان کے اختیار کیے ہوئے عنوان کو سامنے رکھ کر طبع آزمائی کرتے ہیں اور ہم سے آپ سے پوچھے بغیر یقین کر لیتے ہیں کہ انھوں نے ان شعرا کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رکھا! لیکن اس پر غور کرنے کے لیے بالکل آمادہ نہیں ہوتے کہ وہ خود دوم یا سوم درجے کے شاعر نہ ہوتے تو اوّل درجے کے شعرا کی نقل کیوں کرتے۔ اس کہنے سے یہ مقصود نہیں کہ ایک ہی بحر قافیہ ردیف یا موضوع پر دو یا زائد شاعروں کو طبع آزمائی نہ کرنا چاہیے اس طرح کی مثال صفِ اوّل کے شعرا کے ہاں بھی ملتی ہے اور کثرت سے ملتی ہے۔ بڑے شعرا کی پیروی کرنا بھی بُری بات نہیں۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ اس طرح کی پیروی کو نہ تو پیشہ بنانا چاہیے نہ اپنے بارے میں غلط رائے قائم کرنے کا

وسیلہ! جوش کی مشہور نظم پروگرام (رنداں میں ملے گا احزاں میں ملے گا) لوگوں کو ابھی بھولی نہ ہوگی۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف سے ہر طرح کے شعرا طبع آزمائی یا قسمت آزمائی کے لیے اس طرح ٹوٹ پڑے جس طرح دعوت میں کھانوں پر ندیدے گرتے ہیں بالخصوص لکھے پڑھے کھاتے پیتے ندیدے! اور سب نے اس یقین کے ساتھ فکرِ سخن فرمایا کہ اس کے بعد تمام دوسرے شعرا (جوش سمیت) منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ جائیں گے، لیکن ہوا صرف اتنا کہ فانی کی نظم کے علاوہ جوان کے رنگ میں منفرد تھی بقیہ تمام دوسرے شعرا کی نظموں کا "طعام وقیام" کسی دوسرے کے حافظے میں چند دنوں تک بھی نہ رہ سکا —— شاید ان کی اپنی نظموں کا خود ان کے حافظے میں بھی!

اس کے ساتھ ایک دوسرا سانحہ بھی کچھ کم دلچسپ یا عبرت انگیز نہیں ہے جس زمانے میں مسلم لیگ اور کانگریس کا مناقشہ شدت پر تھا اور قائدِ اعظم اور مہاتما جی کی خط وکتابت جاری تھی۔ اخبارات میں کسی نہ کسی کی طرف سے اس طرح کا اعلان ہوتا رہتا کہ دوسرا اپنے بیان سے انحراف کر رہا ہے۔ اگر فلاں وقت تک فلاں امر کی وضاحت نہ کی گئی تو پوری خط وکتابت شائع کر دی جائے گی۔ ایک دن اردو کے ایک "واحد" اخبار میں کیا دیکھتا ہوں کہ اپنے ہی یہاں کے ایک صاحب کا (جن کی حیثیت کیا بتاؤں کہ کیا تھی) قائدِ اعظم اور مہاتما جی میں سے ایک کے نام خط شائع ہوا ہے۔ جس کا مضمون یہ تھا "ہر گاہ میں نے آپ کو متعدد خطوط لکھے، آپ نے کسی کا جواب نہ دیا، اگر آپ نے مزید پہلوتہی کی اور ایک ہفتہ کے اندر جواب موصول نہ ہوا تو میں خط وکتابت (خط ہی نہیں کتابت بھی!) شائع کر دوں گا!"

اقبال کا وہ شعر ہم سب کو یاد ہے جس میں انھوں نے چمن میں "دیدہ ور" پیدا کرنے کے لیے نرگس کو ہزاروں سال سے رونے پر مامور کر رکھا ہے۔ مقرر یا مقالہ نگار جن صاحب کو بڑا دکھانا چاہتے ہیں (جس میں کبھی کبھی خود اقبال شامل کر لیے جاتے ہیں) اس کی شان میں یہ شعر پڑھ یا لکھ دیتے ہیں! وہ صاحب رات ہی بھر میں کیوں نہ بڑے بن گئے ہوں۔ غریب نرگس کے رونے کی ہزار سالہ مدت میں کوئی تخفیف نہیں کی جاتی۔ لکھنے والا اور اس کا ہیرو دونوں کتنے ہی گئے گزرے کیوں نہ ہوں یہ شعر ضرور پڑھا جائے گا۔ اس لیے کہ کسی دعویٰ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے پامال شعر سے زیادہ بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔

دس گیارہ سال ہوئے جب ملک میں سیاسی ہیجان وطغیان انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اقبال کے دو اشعار کا بڑا چرچا تھا ایک تو وہ جس میں انھوں نے بندوں یا نوجوانوں کو کچھ اس قسم کی بشارت دی تھی کہ وہ اپنی خودی کو بلند کرلیں تو خدا ہر تقدیر سے پہلے ان کی رضا حاصل کرلیا کرے گا۔ نوجوانوں نے اس بشارت کی کہاں تک پابندی کی، یہ تو نہیں معلوم ہوا یہ البتہ محسوس ہونے لگا کہ یا تو نوجوانوں نے اس شرط کا لحاظ کرنا ترک کردیا تھا یا پھر خدا نے شرط واپس لے لی تھی۔ بات تعجب کی نہ تھی اس لیے کہ لڑائی کے زمانے میں ارباب حکومت اور محکمہ تعلیمات دونوں تعلیم وتربیت کا معیار اور مدت دونوں کم کردیتے ہیں تاکہ کام کرنے والے جلد جلد اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں میسر آسکیں۔ انجینئرنگ، میڈیکل اور فوجی کالجوں میں ایسا دیکھا گیا ہے۔ چنانچہ خودی کا معیار گھٹاتے گھٹاتے ختم ہی کردیا گیا ہو تو کیا عجب جنگ کے تقاضے سب کچھ کراتے ہیں!

محاربے کی شدت اور موت بڑھی تو فوجی پالیسی اور پروگرام کے رو سے بھرتی ہونے والوں کی عمر بھی بڑھادی گئی۔ چنانچہ نوجوانوں کے ساتھ ان کے چچا ماموں خسر اور خالو وغیرہ بھی جن کی خودی یا خواری پہلے سے مکمل ہو چکی تھی، میدان میں آگئے اور اپنی تقدیر اپنی رضا کے مطابق بنانے کے علاوہ دوسروں کی تقدیر بگاڑنے کا مزید منصب اختیار کرلیا۔ اب صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کی رضا کا خواستگار نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ خود اپنی رضا کا اعلان کرکے دفتر سے اس کی نقل اللہ تعالیٰ کے پاس بھیج دیتے۔ یہ اقبال کے دوسرے شعر کا دور تھا۔ جس میں انھوں نے بشارت دی تھی کہ "مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔" اس شعر کے مبلّغوں نے غریب نہتے معصوم بچوں پر جو تباہی ڈھائی، نوجوانوں کو جس طرح برباد اور بوڑھوں کو بے والی ووارث کیا اور بے شمار خاندانوں کی جان مال اور آبرو جس بے دردی سے لٹی ہے ممکن ہے کچھ اس کا مرثیہ اسی طرح لکھا جائے جیسا دلّی کا لکھا گیا ہے۔ اس زمانے میں ان دونوں اشعار سے اردو کا کوئی اخبار، رسالہ، تقریر، خط وکتابت، گفتگو، اُٹھنا بیٹھنا خالی نہ تھا۔ قطع نظر اس تباہی کے جس سے کتنے بے گناہوں کو گزرنا پڑا، موقع بے موقع ہر کس وناکس کی زبان اور قلم پر آنے سے ان دونوں اشعار کی وقعت مضحکہ خیز حد تک گر گئی یہ دو ایک مثالیں صرف اقبال کے کلام سے دی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ کافی تعداد میں دوسرے شعرائے اردو اور فارسی کے اسی طرح کے اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں، لیکن

ایسا کیا گیا تو یہ سلسلہ بہت طویل ہو جائے گا۔ خود ناظرین کے ذہن میں اس قبیل کے بے شمار اشعار ہوں گے جن کی بدنصیبی یا ان کو آنکھ بند کر کے استعمال کرنے والوں کی بدتوفیقی پر یقیناً ماتم کیا جاسکتا ہے۔ ذیل میں اس طرح کے کچھ اشعار ضرب الامثال فقرے یا مصرعوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً یزداں، بکمند آورا ے، ہمتِ مردانہ، للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطری خواست، ہر خوشۂ گندم کو جلا دو، بلتیں جب مٹ گئیں، بنی آدم اعضائے یک دیگر اند، شاعری جز دیست از پیغمبری حدی را تیز تر می خواں، نہ ہر زن زن است، نہ ہر مرد، مرد، کعبہ میں گاڑو برہمن کو، بیمار کا حال اچھا ہے، آفاق میں کافر کا اور مومن میں آفاق کا گم ہونا وغیرہ، سالِ نو کی تہنیت پیش کرتے ہوئے میں اپنے عزیز طالب علموں سے درخواست کروں گا کہ کچھ اور نہیں تو سالِ رواں کے آخر تک پامال اشعار اور کلمات کے استعمال سے جہاں تک ممکن ہو باز رہیں اور اپنے ساتھیوں کو بھی ترغیب دیں کہ وہ باز رہیں۔ ایک دفعہ میں یہ اقرار کرنا چاہتا ہوں کہ یہ اشعار بڑے اچھے ہیں، صرف بے تکے اور بے تکان استعمال سے ''انیمک'' ہو گئے ہیں یعنی تازہ اور کافی خون کی کمی کے مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں اگر ان کو کچھ دنوں آرام کرنے کا موقع دیا جائے تو اُمید کی جاتی ہے، ان کی صحت بحال ہو جائے گی۔

(مطبوعہ: 1۔ مجلّہ عثمانیہ حیدرآباد دکن 58-1957، 2۔ تعمیر، پندرہ روزہ، علی گڑھ، 7 جنوری 1958)

●●●

ڈسپلن

"بارے آموں" کی طرح ڈسپلن کا کچھ بیان ہو جائے۔ ڈسپلن کسے کہتے ہیں اس کا مجھے علم ہے اور کسے نہیں کہتے وہ آپ بتاتے رہتے ہیں۔ اس کا سیدھا سادا مفہوم میرے نزدیک ایک شائستہ اور صحت مند معاشرے میں باہم دگر زندگی بسر کرنے کے آداب مقرر اور ذمہ داری عائد ہے۔ اُن سے حتی الوسع خوبی اور خوش دلی سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ ڈسپلن ساز بھی ہے اور ستیز بھی۔ ساز اور ستیز کو سمجھنے کے لیے بھی ڈسپلن کی ضرورت ہے۔

ایک بار انگلستان پر دشمن کا بڑا سخت حملہ ہوا۔ سارے انتظامات درہم برہم ہو گئے۔ ہر طرف شکستِ فاش کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ انگریز جنرل نے اپیل کی کہ اس وقت انگلستان اپنے ہر فرد سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنے فرائض بجالائے گا۔ ایسے نازک وقت میں ایسی مختصر اور ولولہ انگیز اپیل انگریز جنرل انگریزوں ہی سے کرسکتا تھا۔ اس اعلان نے آپ کے ندوہ کے بانی مولانا شبلی مرحوم و مغفور کے مطابق "کردیا ذرۂ افسردہ کو ہم رنگِ شرار" مطلع صاف ہوا تو معلوم ہوا کہ انگریز کرائسس جیت گئے تھے۔ یہ ڈسپلن کا معجزہ تھا۔ ہر زندہ قوم کی تاریخ میں یہ معجزے ملتے ہیں شرمندہ ہونے کی بات یہ ہے کہ آج کل ہم ڈسپلن کے مظاہرے دیکھتے اور دکھاتے رہتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ جن عناصر اور عوامل پر مشتمل ہے اُن سب کے ان ڈسپلن کے شرم ناک مظاہرے زیادہ دن نہیں گزرے ہم دیکھ چکے ہیں کس منہ سے اُن کا ذکر کروں اور کیسے کہوں کہ آپ اُن پر فخر کریں۔

طالب علموں کی اِن ڈسپلن یا بے راہ روی کے اسباب میں یہ بتایا جاتا ہے کہ عام حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ نوجوانوں پر نہ تو والدین کا قابو رہا ہے، نہ اساتذہ کا نہ معاشرے یا حکومت کا۔ والدین کو اولاد خاطر میں نہیں لاتی۔ اساتذہ کو طالب علم قابلِ اعتناء نہیں سمجھتے۔ معاشرے کی کوئی ساکھ نہیں اس لیے اس میں وہ کشش نہیں جو نوجوانوں کو اپنے سائے میں اُمید وعزت کی جگہ دے سکے۔ حکومت کو اپنے مصائب ومکروہات سے کہاں فرصت کہ وہ نوجوانوں کے لیے اچھی تعلیم، مناسب روزگار، یا اعلیٰ مشاغل کے سامان یا سہولتیں فراہم کرے۔ ان نوجوانوں کو دیکھ کر عظیم ریپ وان ونکل کی اولاد کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے جن کو دیکھ کر کسی نے کہا تھا: ''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کسی کی ملکیت نہ ہوں۔''

یہ حال صرف یہیں کا نہیں ہے دوسرے ملکوں کے نوجوان بھی اسی طرح کی بے اطمینانی اور ناآسودگی میں مبتلا ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ساری دنیا کا نظامِ معیشت و معاشرت اور اخلاق و مذہب متزلزل ہو چکا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایک جگہ کی خوبی دوسری جگہ کی خوبی نہیں بنتی، لیکن ایک جگہ کی خرابی دور اور نزدیک تمام مقامات میں پھیل ہی نہیں، بلکہ پائیدار ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ صورت زیادہ تر ناترقی یافتہ ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ جہاں افزائشِ نسل، افلاس، امراض اور جہالت کی لائی ہوئی شدید قباحتوں کا سامنا ہوتا ہے یہ صحیح ہے، لیکن ترقی یافتہ ملکوں کے نوجوان بھی زندگی سے کچھ کم ناآسودہ اور برہم نہیں ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ نفس کی ناآسودگی کی وبا مغرب ہی سے مشرق کو آئی ہے۔ ممکن ہوا تو اس پر آئندہ گفتگو آئے گی۔ فی الحال کہنا یہ ہے کہ ڈسپلن کا تمام تر مدار فرائض کے احساس پر ہے اور یہ احساس پائیدار اور موثر اُسی وقت ہوتا ہے جب اُس کی اساس ''کلمۂ گیتی نورد'' پر ہو۔ اقبال نے ملت کی تعمیر اور توثیق اسی کلمۂ گیتی نورد سے کی ہے جس کا اُن سے پہلے ایک بدوی کر چکا تھا۔

ڈسپلن کے مسئلے پر گفتگو کرنے کا پہلو یا مقصد یہ بھی ہے کہ طلبا کو ملک کی سیاسی سرگرمیوں میں کتنا اور کیا حصہ لینا چاہیے۔ ایسا کرنا اُن کے حق میں مفید ہوگا یا مضر۔ ماہرین کا محتاط مشورہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ طلبا کو عملی سیاست میں حصہ نہ لینا چاہیے حالاں کہ جس سیاست کے پیشِ نظر یہ سوال کیا جاتا ہے وہ عملی سیاست ہوتی ہے۔ ورنہ پولیٹیکل سائنس پڑھانے اور سیاسی موضوعات پر

قیل و قال (ڈبیٹ) کے ادارے اور کلب کس کالج اور یونیورسٹی میں نہیں ہوتے۔ میں تمام عمر سیاست کے میدان اور مکائد سے دور اور طلبا کی خیر و عافیت سے بہت قریب رہا ہوں وہ بھی علی گڑھ کے طلبا سے جو مجھے خاص طور سے عزیز رہے ہیں، لیکن یہ تعلق شاگرد اور استاد کا اتنا نہ تھا، جتنا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر اُس سے مل کر یا اُس کا خیال کر کے بے ارادہ بھی چوکنا رہتے کہ ایسی کوئی بات نہ ہونی چاہیے جو ہم کو ایک دوسرے کی نظر میں ہلکا کر دے ایسا ہوا تو علی گڑھ کی سبکی کا باعث ہوں گے، جو ہماری آرزوؤں اور کارناموں کا امین اور آئینہ دار تھا —— اس طریق فکر و عمل کے لیے ہم نہ پارٹی بناتے نہ نعرے لگاتے نہ کوئی عبادت یا ورزش کرتے۔ بس ساتھ رہتے سہتے کھاتے پیتے کھیلتے اور ہنستے بولتے تھے۔ کسی میں کوئی ہنر دیکھتے تو اس طرح خوش ہوتے جیسے اُس کے حصول میں ہم بھی معین رہے ہوں اور وہ ہمارے لیے بھی ہو۔ نقص پاتے تو اس طرح مذاق اُڑاتے کہ وہ راہ راست پر آ جاتا۔ طالب علم شوخی اور شرارت کرتے، لیکن استاد اور نگراں اُن کو بھی اس طرح نظر انداز کرتے یا چشم نمائی سے کام لیتے کہ شوخی اور شرارت کا بھی مزہ آ جاتا اور منفعل بھی ہوتے۔ جس شخص نے ایسوں میں زندگی گزاری ہو، آخر عمر میں مبردص و متعفن سیاست کو سر بازار برہنہ رقص کرتے دیکھا ہو وہ طالب علموں کو اور نوجوانوں کو ایسی سیاست میں شریک ہونے کا مشورہ یا اجازت کیوں کر دے سکتا ہے۔ زیادہ دن نہیں گزرے سیاست کے میدان میں جس لفنگے پن کا مظاہرہ کیا گیا اُس سے طالب علموں کی نیک نامی اور اُن کی ذہنی یا اخلاقی نشو و نما کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ اس کا احساس اور اعتراف کرنے میں طالب علموں کے خیر اندیش سہل انگاری یا خوش گمانی سے کام نہ لیں تو بہتر ہوگا۔ ایسی مسموم فضا میں نوجوانوں کو دھکیلنے کا نتیجہ بڑا ہی اندوہناک ہوگا۔ ہم میں کیسے نالائق موجود ہیں جو طالب علموں کو نقصان پہنچا کر نفع کما رہے ہیں۔ ایسوں کو یقیناً وہی سزا ملنی چاہیے جو ملک سے غداری کی مقرر ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ نوجوانوں کو مصنوعی ماحول میں رکھنا درست نہیں بلکہ آئندہ جس زندگی سے وہ دوچار ہونے والے ہیں، اس کو سنبھالنے اور اس طرح اپنے کو سنوارنے اور استوار کرنے کی آزادی اور موقع دینا چاہیے۔ یوں بھی بطخ کے بچوں کو مرغی کب تک سمندر آزمائی کے لیے روک سکتی ہے، لیکن طالب علموں کو علم و ہنر اور تربیت اخلاق سے بہرہ مند کرنا بھی لازم آتا ہے۔

اس کے بغیر وہ زندگی کے جہاز کو طرح طرح کے طوفانوں سے کس طرح بچا کر لے جائیں گے۔ اعلیٰ اقدار کے سائے اور روشنی میں طالب علم کی سیرت اور شخصیت کی تربیت اور استحکام معاشرے اور حکومت کے اوّلین فرائض میں سے ہیں۔

سوسائٹی میں افراتفری راہ پا گئی ہو تو اچھی باتوں کی طرف دھیان بہت کم جاتا ہے اس لیے ہر شخص کو یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ معلوم نہیں کب کیا حادثہ پیش آ جائے، اس لیے جو ہاتھ لگے اسے سمیٹ لو وہ خطرناک سے خطرناک اور ناواجب سے ناواجب اقدام کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ زیادہ تر اس میں نوجوان مبتلا ہوتے ہیں اس لیے کہ وہ سب سے زیادہ حال کے قائل ہوتے ہیں۔ ماضی یا مستقبل پر کم نگاہ رکھتے ہیں۔ نوجوان جن کی نمائندگی بالعموم طالب علم کرتے ہیں یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے لیے اطمینان اور عزّت کی جگہ نہ معاشرے میں رکھی گئی ہے نہ حکومت میں، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ حکومت ان کے مسائل نہیں حل کرتی۔ ان کو طرح طرح کی رشوت مختلف شکلوں میں دیا کرتی ہے جس کا گوارا نام اس نے مراعات رکھ دیا ہے۔

امتحان میں ہر طرح کی بدعنوانی میں رعایت، تاخت و تخریب میں ڈھیل، جنسی روابط اور تفریح و تماشے کی بے لگام آزادی ایسے مسکرات منہیات ہیں جو نوجوانوں کو اچھی اور اعلیٰ صلاحیتوں کو معطل اور مسخ کر جاتی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آج کل کے نوجوان والدین اپنے بچوں کو طرح طرح کے بہلاوے دے کر نوکروں یا محلّے والوں کے رحم کرم پر چھوڑ کر خود تفریح کے لیے نکل جاتے ہیں۔ بچے اسے پورے طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ ان کے والدین کیا کھیل کھیل رہے ہیں۔ چنانچہ سیانے ہو کر وہ بھی یہی سلوک مع سود پہلے والدین سے اس کے بعد دوسروں سے ہر سطح پر کرتے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ وقت ایسا آ گیا ہے کہ اس طریق کار سے مفر نہیں، لیکن اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جب ایمرجنسی (اندیشہ ناک صورت حال) کا اعلان کر دیا جاتا ہے تو وہ سب کرنا پڑتا ہے جو نارمل زندگی میں ناممکن (بلکہ ناواجب تک سمجھا جاتا ہے) اور کون نہیں جانتا کہ سیاسی اور ملکی ہی ایمرجنسی یا کرائسس نہیں ہوا کرتا اخلاقی ایمرجنسی یا کرائسس بھی ایک حقیقت ہے۔

ڈسپلن کا مطالبہ یہ ہے کہ آپ جہاں رہیں جن میں رہیں جس طرح رہیں اور جس لیے رہیں وہ سب کسی اعلیٰ عقیدہ مقصد تصوّر کی خاطر ہو۔ ذمہ داری کی زندگی بسر کرنا ڈسپلن ہے۔ اگر

آپ مسلمان کی ذمہ داری سے واقف ہیں تو آپ کو ڈسپلن کا مفہوم یا ماہیت سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی۔ بجز ذات سے ہٹ کر آپ کو چند موٹی باتوں کا دھیان دلانا چاہتا ہوں۔ ان سب کا تعلق ڈسپلن یا آپ کی سیرت (کیریکٹر) کی پرداخت پر ہے۔ آپ پڑھنے لکھنے اور اچھی باتیں سیکھنے اور برتنے میں اس طرح کوشش کریں جیسے آپ وہ فرض اُتار رہے ہوں جو آپ کے سرپرست عزیز یا دوست روپے پیسے سے یا شفقت و محبت سے (اور معلوم نہیں کتنی سختیاں جھیل کر) آپ کو فراغت اور عزت سے زندگی بسر کرنے کے لیے سامان اور سہولتیں فراہم کرتے رہتے ہیں جو موجودہ دور میں متوسط و بالعموم تنگ دست گھرانوں کے لیے بہت دشوار ہے۔

صحت کو برقرار اور حفظِ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور نارمل زندگی گزارنے کی عادت ڈالیے۔ صاف ستھرے، سادے خوش قطع کپڑے پہنیے خواہ ان میں پیوند ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر کالج کی طرف سے کوئی مناسب یونی فارم مقرر کردی گئی ہے تو بہتر ہوگا۔ یونی فارم کا احترام کیجیے اور یہ جذبہ طالب علم کو بے راہ روی سے روکتا ہے۔

اگر آپ کسی خوش منظر ڈائننگ ہال، کیفیٹریا، یا ہوٹل میں کھانا کھا رہے ہوں تو ان آداب کو ضرور ملحوظ رکھیے جو کھانے کے دوران میں مہذب لوگ برتتے ہیں۔ مثلاً خوش کلامی، ایک دوسرے کا پاس خاطر، نوکروں اور بیروں سے نرمی اور عزت کا سلوک۔ ایسا نہ ہو کہ کھانا پسند نہ آئے یا کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو آپ کے ہاتھوں نہ آپ کی آبرو محفوظ رہے اور نہ دوسروں کی۔ ہاتھ یا زبان کو بے قابو ہو جانے دینے سے اپنا نقصان فی الفور یقینی ہوتا ہے۔ دوسروں کا بالکل نہ ہوتا ہو عجب نہیں۔ علاوہ بریں اس کی احتیاط ہونی چاہیے کہ کھانا کھانے اور غسل یا ورزش کرنے میں فرق ہے۔ کھانا کھانے سے پیٹ بھرنا ہی مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ شائستگی اور دل نوازی کا نمونہ بھی پیش کرنا ہوتا ہے۔ میزبان اور مہمان کے الگ الگ کچھ آداب مقرر ہیں ان کو کسی حال میں نظر انداز نہ کیجیے اور آپ بُرا نہ مانیں تو نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ جان جوکھوں ہی کا معاملہ ہو تو دسترخوان اور میز کے جدید آداب کو نظر انداز کیجیے۔ کہیں پڑھا تھا کہ شراب تنہا مت پیو یہ طریقہ یہود کا ہے میں صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ ممکن ہو تو کھانا بھی تنہا مت کھائیے چاہے یہ شیوہ کسی کا نہ ہو۔ مسلمانوں میں تنہا خوری یوں بھی پسند نہیں کی جاتی۔ آپ ہر روز دیکھتے ہوں گے کوئی مسلمان خواہ وہ کتنا ہی معمولی حیثیت کا

کیوں نہ ہو اپنے روکھے پھیکے کھانے کی مختصری پوٹلی کھولے گا تو حاضرین سے خواہ وہ قدر و منزلت کے کسی مقام پر ہوں ماحضر میں شرکت کی دعوت ضرور دے گا، اور یہ روایت وادئ غیر ذی زرع کے ان خانماں بردوشوں کی قائم کی ہوئی ہے جن کو آسانی سے پیٹ بھر روٹی میسر نہیں آتی تھی۔

تعلیم گاہوں کی عمارتوں میں میدانی باغات اور سبزہ زار بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ پُر فضا ماحول اور صحت بخش فضا، اچھی کتابوں، عمدہ لیکچروں اور بہتر ساتھیوں اور اچھے اساتذہ سے اہمیت میں کسی طرح کم نہیں ہے۔ ماحول کا اثر براہِ راست اور غیر شعوری طور پر طلبا کے ذہن اور ذوق پر پڑتا ہے۔ ذمہ دار اصحاب کو یہ نکتہ برابر ذہن میں رکھنا چاہیے۔ آپ کا ادارہ اسلامی ہے۔ مسلمانوں کی مخصوص اور ممتاز روایات سے زیادہ اور کون واقف ہوگا۔ مسلمان جہاں گئے یا جائیں گے خوش نما عمارات، باغ، نہروں، آبشار اور چورس سڑکوں کے بغیر نہیں رہیں گے۔ مسلمانوں کی تمام خدمات نظر انداز ہو جائیں یا کر دی جائیں تو بھی ان کے ذوق کو ذہن کے اس رجحان سے ان کے تمام کارکنوں کی بازیافت از سرِ نو ہو سکتی ہے۔

اس سلسلے میں کچھ لطیفے بھی پڑھیے۔ جنگِ عظیم میں جرمنی کو دوبارہ شکست ہوئی اور کیسی شکست۔ میر کے صحن چمن کی طرح برلن نمونہ "یوم الحساب" تھا۔ ہر طرف شکست و ریخت، ہیبت و ہلاکت، عفت و عزت، جان مال، بچے، بوڑھے سب فاتحین کے نفس کے بدترین تقاضوں کی آسودگی کے لیے ہر طرف بکھرے ہوئے، لیکن جہاں کہیں تعلیم گاہیں اور ان کے ارد گرد خیابان اور سبزہ زار ملتے وہاں سے ان کا گروہ گزرتا تو خاموشی سے کترا کر دوسری طرف نکل جاتا۔ کسی تعلیم گاہ اور اس کے سبزہ و چمن کی حرمت شمہ برابر کہیں سے مجروح نہ ہوتی۔ یہ اس ڈسپلن کا اعجاز تھا جو تعلیم گاہ اور اس کا صحت مند فرحت افزا اور دل آویز ماحول ہمارے اور آپ کے ارادے کے بغیر ہمارے دلوں میں راسخ کر دیتا ہے۔

دوسرا قصہ یوں ہے کہ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے ڈاک کے تھیلے عموماً ہرکارے اپنے اپنے حلقوں میں لے جاتے تھے ــــ ان کی لاٹھی ہوتی تھی جس کے ایک سرے پر نیزے کا پھل لگا ہوتا۔ اس کے نیچے ایک گھنٹی آویزاں ہوتی، ہرکارہ چلتا رہتا اور گھنٹی بجتی رہتی۔ جیسے سفر میں ایک دوسرے کی دل داری کر رہے ہوں۔ جاپان میں چیری کے پھولنے کا موسم بڑا دل کش ہوتا ہے۔ وہاں کی زندگی میں اس کو تیوہار کی سی حیثیت حاصل ہے۔ مختلف مقامات کے علاوہ سڑکوں اور شاہراہوں کے

دونوں طرف دور دور تک خوش نما پھول سے لدے ہوئے درخت ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے فطرت نے جاپان میں پھول والوں کی سیر منائی ہو۔ اس زمانے میں ایک ہرکارہ ڈاک کا تھیلا اپنی گھونگرو دار لاٹھی میں آویزاں نیم دلکی انداز میں گھونگرو کی تال پر بے خبر چلا جا رہا تھا۔ سامنے چیری کی شاہراہ تھی، جسے پھولوں نے حسن کا تقدس یا تقدس کا حسن دے رکھا تھا۔ ہرکارہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔ بڑی احتیاط سے کندھے پر سے لاٹھی اور تھیلا اُتارا، گھونگرو کو ہاتھ سے مضبوط تھام لیا، تا کہ چلنے میں آواز برآمد نہ ہو۔ پھر تھیلے کو دوسرے سرے پر لٹکا کر بڑے ادب سے دبے پاؤں آگے بڑھا اور جب تک چیری بلاسم کا سلسلہ ختم نہ ہو گیا اسی خاموشی اور عقیدت سے چلتا رہا، پوچھنے پر بتایا کہ اس اہتمام کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ چیری اس فردوس میں دیوتاؤں کی عبادت و عافیت میں گھنٹی کی آواز مخل ہوتی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ خوب صورت قدرتی مناظر میں طالب علم کبھی بے راہ نہیں ہو سکتا۔

طلبا کے خیالات و جذبات کی صحت و صفائی کے لحاظ سے تعلیم گاہوں میں یونین کلب یا انجمن اتحاد کو میں وہی حیثیت دیتا ہوں جو انسانی جسم میں پھیپھڑے کو حاصل ہے۔ طلبا کی نارمل زندگی میں یونین کلب کی ایسی ہی ضرورت ہے، جیسے کھانے پینے، نہانے دھونے، ورزش تفریح اور سیر و سفر کی۔ اچھے یونین کلب کی خوبی اور خوب صورتی یہ ہے کہ وہاں نوجوان کو جس جرأت اور وقار کے ساتھ اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی ہوتی ہے۔ اس طرح تحمل اور بردباری سے فریق مخالف کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی پابندی ہوتی ہے۔ اگر کوئی یونین یا اس کے اراکین اس خصوصیت کو پورا نہیں کرتے تو پھر وہ یونین یونین نہیں ہے، نااہلوں کا اژدہام ہے!

بے شک یونین میں ہر موضوع پر اظہار خیال کی آزادی ہونا چاہیے، لیکن اس آزادی کو کسی حال میں ذمہ داری کے حدود سے تجاوز کرنا چاہیے۔ اگر کسی دباؤ کے سبب یونین مباحثے کے بجائے مجادلے کو اپنا شعار یا مقصد بنالے تو پھر اس کی حیثیت درس گاہ کے حق میں دسپٹک اسپاٹ (مرکز تعفن) کی ہو جاتی ہے اور اس کا تدارک لازم آجائے گا۔ پچھلے دنوں اس طرح کے سانحے کثرت سے دیکھنے میں آئے، لیکن اس صورت حال سے بد دل نہ ہونا چاہیے۔ لعنت بھیجنے میں اس فتنہ و فتور کو دخل ہے جو ان کے بزرگوں کے نامۂ اعمال میں کالے ہیرے کی طرح جگمگا رہے ہیں۔

(مطبوعہ: 1۔ نقش، کراچی۔ شمارہ: 21، 1969، 2۔ شبیر، الٰہ آباد 1970) ●●●

ایک سڑک، ایک ستون، ایک اسکول

بعضوں کا خیال ہے کہ گھر کے سامنے کی سڑک زیرِ تعمیر ہے، دوسرے کہتے ہیں شکست و ریخت کی زد میں ہے۔ غزل گویوں کا کہنا ہے کہ اس "تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی" نظم کے شیدائی فرماتے ہیں یہ سڑک نہیں ایک سمبل (علامت) ہے جدید شاعری میں "تازہ بہ تازہ نو بہ نو" تحریکوں یا بقول بعض تفریحوں کا! میں نے اس کو اتنی کروٹیں بدلتے یا قلابازیاں کھاتے دیکھا ہے کہ نہ اپنے ذہنی توازن پر اعتبار رہا نہ قوتِ فیصلہ پر، البتہ کبھی کبھی محسوس کرنے لگتا ہوں کہ یہ ساری قیاس آرائیاں بیک وقت صحیح ہوں تو کیا عجب! یہ نہ صرف کسی وقت بنائی اور دوسرے وقت بگاڑی جانے لگتی ہے بلکہ اس پر ہر وقت لعنت پڑتی رہتی ہے۔ ان کی طرف سے جو اس سے بچ کر پہلو کے گرد سے اَٹے ہوئے راستے سے گزرتے ہیں اور ان کی طرف سے بھی جو اس سڑک پر کسی سانحے کی زد میں آکر جا پڑتے ہیں۔

جہاں تک حافظہ ساتھ دیتا ہے سڑک کا اہتمام لگنے سے پہلے یہ میکوہن لائن قسم کی کوئی چیز تھی کبھی موجود کبھی موہوم۔ یہاں وہاں ہر جگہ بقول غالب "سیمیا کی سی اک نمود!" یہ سمجھوتہ معلوم نہیں کب سے چلا آرہا تھا۔ آس پاس بسنے والے اس پر کوڑا کرکٹ اور دور دراز رہنے والی بھنگنیں آنکھ بچا کر کبھی آنکھ میں دھول ڈال کر اس پر غلاظت ڈال دیا کرتی تھیں جن کو مرغیاں اور آنے جانے والے روندتے بکھیرتے یا ہموار کرتے رہتے۔ کبھی کبھی یہ دونوں بھی اس پر کچھ گفتنی،

باقی ناگفتنی کا اضافہ کر دیا کرتے۔ اس طرح اِدھر اُدھر کے مکانوں اور اس خطے میں رہنے بسنے والوں کی صفائی اور گندگی کا توازن قائم رہتا۔ پھر ایسا ہوا کہ اس پر دور دور سے کوڑا لا کر جمع کیا جانے لگا اور انواع و اقسام کے مرد، عورت، بچے، مرغیاں، کتے، بکری، گدھے، گداگر کے علاوہ گندگی کی موریاں نمودار ہونے لگیں اور جلد ہی ایک پُر رونق سلم (Slum) آباد ہو گیا۔

معدی امراض اور مفلس کے قرضے یا اولاد کی طرح یہ مخلوقات تیزی سے بڑھنے لگیں۔ کبھی سورج کی روشنی ماند پڑ جاتی یا بادل چھائے ہوتے تو دور سے یہ تمیز کرنا دشوار ہو جاتا کہ کون کیا ہے، کہاں ہے اور کیوں ہے؟ ایک دن محکمہ حفظانِ صحت کے 'جی میں کیا آیا'' کہ اس نے سارے کوڑے کرکٹ کو دور تک قاعدے سے پھیلا دیا۔ غالباً اسی مقصد کے پیشِ نظر جس سے گرم اور ریشمی کپڑے کو کیڑوں سے بچانے کے لیے دھوپ میں پھیلا دیا کرتے ہیں۔ ایسا کرنا تھا کہ یہ خبر عام ہو گئی کہ سڑک بننے والی ہے یا بن گئی۔ اس خوش خبری کو سن کر سڑک کے حوالی اور حواشی پر اسٹاف کے لیے مکانات اور طالب علم کے لیے بورڈنگ ہاؤس بنا ڈالے گئے اور آباد ہونے لگے۔ بجلی کے کھمبوں کی بھی داغ بیل ڈالی جانے لگی۔

آبادی اور گندگی کے اس طرح بے تحاشا بڑھنے سے اندیشہ پیدا ہوا کہ سڑک کسی معدی بیماری میں نہ مبتلا ہو جائے۔ فلکیات کے پنڈتوں نے حکم لگایا کہ یا تو یہ سڑک اُشٹ گرہ کی زد میں ہے یا خود اُشٹ گرہ اس سڑک کے نشانے پر آ چکی ہے۔ اس پر ماورائیات کے دانش وروں نے یہ حکم لگایا کہ یہ سب قربِ قیامت کی دلیل ہے۔ پھر کچھ دنوں یہ بحث چھڑی رہی کہ سڑک کو اُشٹ گرہ کی زد سے محفوظ رکھنا بہتر ہوگا یا اُشٹ گرہ کو سڑک سے۔ قربِ قیامت کے حامیوں کا اصرار تھا کہ دونوں میں سے کسی ایک سے بھی تعرض نہ کیا جائے اس سے قربِ قیامت کی توہین ہوتی ہے۔ بالآخر یہ قرار پایا کہ تینوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک دوسرے کے راستے سے ہٹا دیا جائے اور کسی پر تو بس نہیں چلتا تھا اس لیے سڑک کو کسی صحت گاہ کی طرف منتقل کرنے کی فکر ہوئی۔ اس کے لیے گدھوں کی خدمات طلب کی گئیں۔ ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ کوڑے کی اس کہکشاں پر ہر مزاج کے گدھے، کہیں مشاعرے، کہیں معانقے میں مصروف یا جا بجا مراقبے میں کھڑے ہیں اور میرِ مشاعرہ دوڑ دوڑ کر سامعین اور شعرا دونوں کو ڈنڈے سے خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔

گدھوں کا قاعدہ ہے کہ وہ کہیں کسی حال میں ہوں جس میں خاموشی سے کھڑا رہنا، چرنا، چگنا یا کسی اور تپسّیا میں مصروف ہونا ہو اور بے تحاشا اور بے قصور پٹتے رہنا بھی شامل ہے، دفعتاً نعرے لگانے لگیں گے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہ اعلان مظلومی کا ہے، شادمانی یا صرف نالائقی کا۔ بالکل جس طرح سیاسی جلسے جلوس میں نعرے لگائے جاتے ہیں بغیر یہ جانے ہوئے کہ خود ڈر رہے ہیں، دوسروں کو ڈرا رہے ہیں یا صرف شریفوں کے امن و عافیت میں خلل انداز ہونا مقصود ہے۔ یہ صورتِ حال دیر تک قائم نہ رہی۔ محلّے کے بچّے جو تعداد، تنوع اور ذہانت و شرارت میں ان سے بہت آگے تھے معلوم نہیں کہاں کہاں سے نکل پڑے اور کوڑے میں شامل ہو کر ان پر لد گئے اور فرطِ مسرّت سے ان کی پٹائی بھی شروع کر دی۔ گدھوں نے نہ کبھی اس قسم کے کوڑے اُٹھائے تھے نہ ان سے اس طرح کا جارحانہ سلوک ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گدھوں کا نعرۂ فتح یابی ختم ہو گیا اور جب تک جس طرح کے کوڑے اُٹھاتے رہے ہر موسم اور موقع کے شوقیہ گانوں سے باز رہے اور باوجود طرح طرح کے اشتعال کے انھوں نے کسی ایسے شغل میں حصہ نہ لیا جس سے پاس پڑوس کے باشندوں یا سڑک کے قریب سے گزرنے والوں کو پریشانی یا پشیمانی ہوتی۔

کوڑا اُٹھ گیا تو معلوم ہوا کہ اس کے بعض صحت بخش اجزا زمین میں نفوذ کر چکے ہیں اس لیے حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کے لیے ایک سیمینار منعقد کیا گیا جس کے افتتاح کے لیے ایک ایسے بزرگ کا انتخاب ہوا جن کے خلاف یہ درخواست عدالت میں گزری تھی کہ ان کا الیکشن بے قاعدہ ہوا تھا۔ دوسری بے قاعدگیوں کے علاوہ ان پر یہ الزام بھی قائم کیا گیا تھا کہ جلوس میں انھوں نے پھولوں کے ایسے ہار پہن رکھے تھے جو اس سے پہلے مورتیوں اور مزارات پر چڑھائے گئے تھے اور جو شخص مورتیوں اور مزارات کے ہار پھول چُرا سکتا تھا وہ مورتیوں اور مزارات کے چُرانے میں کب تامّل کر سکتا تھا۔ اس طرح ایک ایسے زمانے میں جب گناہوں کی افراط ہے اور توبہ کا دروازہ تقریباً بند ہو چکا ہے یا بند ہونے والا ہے یا محض برائے نام کھلا رہ گیا ہے جیسا کہ سیاسی مسائل کی گفتگو کے دوران میں دروازے کی حیثیت رکھی جاتی ہے، توبہ کرنے یا دعا مانگنے کا جو ظاہری وسیلہ ہے اس سے بھی یہ شخص عامۃ الناس کو محروم کرنے کی جرأت کرتا ہے۔ گناہ بڑھنے اور خدا سے معافی مانگنے کے وسائل ختم کیے جاتے رہیں گے تو معاشرے میں سخت فساد اور ابتری پھیلے

گی اس لیے ایسا شخص اسمبلی یا پارلیمنٹ میں دخل پانے کے بجائے حراست یا مچلکہ اور ضمانت پر رکھے جانے کا سزاوار تھا۔

ایک عرصہ تک ''امورِ تنقیح طلب'' پر بحث شروع ہوتی اور واک آؤٹ یا فیڈ آؤٹ پر ختم ہوتی رہی۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ فیصلہ صادر کر دیا جائے۔ امورِ تنقیح طلب اس کے مطابق طے ہو کر شاملِ مسل کر دیے جائیں گے۔ یہ تجویز متفقہ طور پر تسلیم کر لی گئی اس لیے کہ اراکین فیصلہ صادر کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ حقیقت تک پہنچنے کی نہ ان میں صلاحیت تھی نہ اس قسم کی کوئی ہدایت دی گئی تھی۔ صحتِ عامہ اور امنِ عامہ دونوں کے پیشِ نظر رپورٹ کو شائع نہیں کیا گیا۔ کچھ اس خیال سے بھی کہ جن ممبروں نے جو کچھ مادری زبان میں لکھا تھا وہ دوسروں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اور جنھوں نے غیر مادری زبان میں لکھا تھا اس کو پڑھنا قومی وقار کے منافی تھا۔ رپورٹ داخلِ دفتر کر دی گئی اور سارے ممبران اس طرح کے کارِ خیر سے ہمیشہ کے لیے معزول کر دیے گئے۔ معاملہ عدالت تک پہنچا اور بہت سے ماتمی جلوس اور مجاہدانہ نعروں کے بعد فیصلہ یہ کیا گیا کہ معزز اُمیدوار تا الیکشن ثانی معزول نہیں معطل رکھے جائیں، یعنی اسمبلی یا پارلیمنٹ میں بیٹھ سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں نہ ووٹ دے سکتے ہیں۔ اس خلفشار میں مورتیوں اور مزاروں کا قصہ زیادہ لمبا ہو گیا۔

یہ سب ہو ہی رہا تھا کہ کسی گدھے یا گدھے والے نے یہ سنسنی پھیلا دی کہ آس پاس جو نئے مکانات تعمیر ہوئے تھے ان میں کرسی نہ تھی۔ برسات کا پانی، باہر کا کوڑا اور طرح طرح کی غیر ذمہ دار مخلوقات کے اندر آنے سے بے پردگی، بے غیرتی اور بیماری کا اندیشہ تھا۔ وہ لوگ جنھوں نے یہ مکانات ''ضربِ کلیمی'' یا ''آہِ سحرگاہی'' سے حاصل کیے تھے گدھوں کی پھیلائی ہوئی اس تخلیقی تنقید سے بڑے متفکر ہوئے، چراغ پا بھی۔ چنانچہ اس کے لیے قضیۂ زمین برسرِ زمین کے اصول پر ''گلپ پول'' (Gallup Poll) (ایک طرح کی سرسری رائے شماری) کی طرح ڈالی گئی اور اردگرد کے حاضرین اور تماشائیوں اور آنے جانے والوں سے جو وہاں تفریحاً جمع ہو گئے تھے، استصوابِ رائے کیا گیا کہ صورتِ حال پر کس طرح قابو پایا جائے۔ اس پر ایک بار پھر جھگڑا شروع ہو گیا۔ اعتراض یہ کیا گیا کہ جن سے رائے لی جانے والی تھی وہ یا تو خود گدھے تھے یا

گدھوں سے مل گئے تھے جن کی رائے کی قانونی وقعت کوئی نہ تھی جمہوری ہو تو ہوا کرے۔ جواب میں کہا گیا کہ قانون سے کیا ہوتا ہے۔ رائے عامہ کی تو تائید حاصل ہے جو کسی وقت قانون یا اعضا شکنی کر سکتی تھی۔ قانون شکنی بجائے خود ایک قانونی طاقت یا نکتہ تھا جو سمجھ میں نہ آنے کے سبب سے بالاتفاق منظور کر لیا گیا اور طے یہ پایا کہ کرسی کو اونچا کرنے کے لیے ملحقہ زمین دور تک نیچی کر دی جائے۔ چنانچہ مکانوں کے آس پاس کی زمین کی مٹی نکالی جانے لگی۔ گدھے پھر طلب کیے گئے اور مٹی ڈھونے اور بوقتِ ضرورت مشورہ دینے کے منصب پر فائز کر دیے گئے۔

یہ ہو چکا تو کسی ستم ظریف نے یہ شوشہ چھوڑا کہ چاروں طرف کی مٹی نکال دینے سے یہ مکانات خشک سمندر میں جزیرے بن گئے ہیں۔ اب تک ایسے عجوبے نہ دیکھے گئے تھے نہ سنے، چنانچہ جوق در جوق تماشائی آنے لگے اور جزیروں کو دیکھنے کے بجائے اہلِ جزیرہ کو اس طرح دیکھنے لگے کہ موخرالذکر بگڑ کھڑے ہوئے۔ نقضِ امن کے اندیشہ سے پولیس کو فون کیا گیا جس کا جواب یہ آیا کہ پولیس کے پاس اس وقت نہ باجے تھے نہ ڈنڈے، اس لیے تاوقوع حادثہ حاضری سے معذور سمجھا جائے اس کے بعد جن سے سمجھنا ہوگا سمجھ لیا جائے گا۔

یہ معلوم ہونے پر گدھوں نے اس خاکی سمندر میں لوٹ اور حاضرین نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ چنانچہ ایک بار پھر ماہرینِ فن بلائے گئے اور یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا گیا کہ برسات آئی اور مکانوں کے اردگرد سمندر نمودار ہوا تو کیا ہوگا۔ جزیرے کے باشندوں کو کھانے پینے کا سامان اور بڑے آدمیوں کے ہمدردی کے پیام کس طرح پہنچائے جائیں گے۔ رفتہ رفتہ علاقے کے باشندوں میں سراسیمگی پھیلنے لگی۔ مٹی کو پھر سے بھرنا ممکن نہ تھا۔ جب کوئی اور صورت نظر نہ آئی تو ''یک شخصی'' کمیشن مقرر کر دیا گیا اور طرح طرح کی آئینی پیچیدگیوں اور غیر آئینی اصلاحات یا اصطلاحات سے بچنے کے لیے کمیشن کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ جو مناسب سمجھے کر ڈالے۔ اس کا فیصلہ آخری اور ناطق ہوگا۔ یہ کمیشن کچھ عرصہ مراقبے میں رہا۔ ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ مکانات کے حاشیے پر ایک پتلی لمبی خندق کھود ڈالی گئی ہے جس سے سمندر کے پانی کی نکاسی ہو جایا کرے گی یعنی ایک ایسی خاکنائے بنا دی گئی جو برسات میں آبنائے کا کام دے سکے۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس برساتی سمندر کا پانی سڑک کی دوسری سمت کے سمندر میں ڈال دیا گیا تو وہاں بھی آباد جزائر کافی تعداد میں تھے لیکن کوہ جودی[1] دور دور نہ تھا۔ طوفانِ نوح میں پسرانِ نوح کا کیا حشر ہوگا۔ اس دشواری کا حل دریافت کرنے کے لیے ایک نہایت ذی اختیار ذی اقتدار کمیشن مقرر کیا گیا جسے انگریزی میں ''ہائی پاور'' اور ہندی میں ''مہابلی'' کہتے ہیں۔ منصب کی حیثیت سے اس کا صدر دیسی بقیہ تمام ماہرین بدیسی رکھے گئے۔ ایجنڈے میں صرف ایک مد رکھی گئی غالباً اس بنا پر کہ جب ایک شخصی کمیشن مقرر کیا جاسکتا ہے تو یک مدی ایجنڈا بھی ہوسکتا ہے۔ یوں بھی تعزیت یا تہنیت کے ایجنڈے میں صرف ایک مد رکھی جاسکتی ہے اور اس کمیشن کا مقصد بھی وقت آجانے پر مظلومین سے ہمدردی اور معاونین کا شکر یہ تھا۔

کمیشن کو خفیہ ہدایت بطور حکم یا حکم بہ شکل ہدایت یہ دی گئی کہ اگر عالمی بینک، ریڈکراس یا کوئی فاؤنڈیشن بروقت بے تکلف اور بے تکان امداد دینے پر آمادہ ہو جائے تو نہ سمندر کے مسئلے پر زور دیا جائے نہ جزیروں میں رہنے بسنے والوں کی عافیت و عاقبت پر سوچنے میں وقت اور روپیہ ضائع کیا جائے بلکہ کوئی ایسا کثیر المقاصد منصوبہ تصنیف کیا جائے جس سے دباؤں سے زیادہ دوٹرس کو قابو میں لایا جاسکے۔

چوں کہ اس صورتِ حال کے پیدا کرنے میں ماہرینِ فن اور گدھوں کا برابر کا حصہ تھا اس لیے یہ دونوں کمیشن کے سامنے شہادت کے لیے طلب کیے گئے۔ انھوں نے یہ بیان دیا کہ قوم، یہ ادارہ اور ''قبیلے کی آنکھ کا تارا'' یعنی ہم سب معرضِ خطر میں تھے اس لیے وہ تدابیر عمل میں لائی گئیں جن کی شکایت کی گئی ہے۔ مکانات سے متوازی ایک لمبی پتلی اور گہری کھائی کھودنا ضروری تھا تاکہ ایک سمندر کا پانی دوسرے سمندر میں چلا جائے اور موخر الذکر سمندر کے پانی کو اس کا حق حاصل ہو کہ وہ جہاں چاہے چلا جائے اور ٹھہرنا چاہے تو اپنی ذمہ داری پر ٹھہرا بھی رہ سکتا ہے البتہ جزیروں (مکانوں) کی چھت پر جائے پناہ بنادی جائے تاکہ اگر پانی کے ساتھ مکان بھی بیٹھنے لگے تو لوگ چھت پر پناہ لے سکیں۔ ان سفارشات پر کمیشن نے تصدیق کی مہر لگادی۔

1۔ کوہ جودی (ف۔ مذکر) وہ پہاڑ جس پر حضرت نوح کی کشتی طوفان کے ختم ہو جانے پر ٹھہری تھی۔

خندق کھود دی گئی، لیکن اس کے ظرف کے مطابق بارش نہ ہوئی۔ سمندر خشک رہے، خندق البتہ خس پوش ہوگئی۔ چنانچہ جیسا کہ جنگ کے زمانے میں شہری خندقوں (یا ہوائی حملے سے جائے پناہ) کا نصیب رہا ہے ان کو تقاضائے بشریت اور کتّوں کی افزائشِ نسل کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اندھیرے، بے خبری یا بدحواسی میں کوئی بدقسمت ناواقف ادھر سے گزرتا تو خندق اور اس کی مشمولات کے طفیل اس پر جو گزر جاتی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ نالی کو اردگرد کی جھاڑیوں نے گھاس سے اس طرح ڈھک دیا ہے کہ دن میں بھی پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ نالی کہاں سے شروع ہوکر کہاں ختم ہوتی ہے۔ اس نواح کے برساتی سمندر کا پانی اس نالی سے گزر کر طعام و قیام کے لیے پاس ہی کے دوسرے سمندر میں ٹھہرے گا تو وہاں کے باشندوں کا کیا انجام ہوگا وہ ابھی دیکھنا باقی ہے البتہ اس کا اندیشہ ضرور ہے کہ وہاں والوں کو فلش سسٹم سے جو ہر جزیرے (گھر) میں موجود ہے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ذکر کر رہا تھا سڑک اور سمندر کا بات پہنچی فلش سسٹم تک۔ بہت کوشش کی کہ کسی طرح سڑک کو قیامت اور فلش سسٹم کو اپنی یا ناظرین کی نوجوانی تک پہنچا دوں، لیکن اردو شاعری کے قواعد اور اپنی نارسائی و نالائقی نے چُول نہیں بیٹھنے دیا۔ حالاں کہ ایسے طرفہ طرازوں کی ہم میں کمی نہیں جو اردو شاعری میں ہر طرح کی چول یا ہر طرح کی چول میں اردو شاعری کو بٹھا دیتے ہیں۔ جب کبھی اس طرح کی کوشش کرتا گدھے سامنے آ جاتے جسے اپنے اور ناظرین دونوں کے خلاف احتجاج ورنہ بدشگونی سمجھ کر ارادہ ترک کر دیتا۔ قصہ یہ ہوا کہ بعض مکانوں کے فلش سسٹم میں امتلا کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ جس طرح آتش فشاں پہاڑ یک بہ یک لاوا اُگلنے لگتے ہیں، یہ فلش سسٹم بھی اپنے مقویات اُگلنے لگا۔ کچھ رقبہ زد میں آ گیا اور یہ افواہ پھیلی کہ جس طرح طوفانِ نوح کسی تنور سے برآمد ہوا تھا کچھ اسی قسم کی چیز دوسری طرح کے تنور سے برآمد ہونے والی ہے۔ بارے خیریت گزری فلش کی برہمی دور ہوگئی البتہ اس کی لائی ہوئی زرخیزی سے دوسری قسم کا کام لینے کا پروگرام مرتب کر لیا گیا۔ اس سے محلّے کی بوباس میں فرق ضرور آیا، لیکن اتنا فائدہ ہوا کہ ڈاکیہ آسانی سے خطوط اور رکشا والے بآرام تمام سواریاں گھروں پر پہنچا دیتے تھے اور کسی کو کسی کا پتہ لگانے میں دقت نہیں ہوتی تھی۔

راستے کو کھود کر ہموار کر چکے تو اس پر اینٹیں بچھائی جانے لگیں جنھیں بڑے بڑے ٹرک اس طرح شور مچاتے لاتے اور اس دھاکے سے گراتے جیسے سڑک پر اینٹیں نہ جمع کی جا رہی ہوں بلکہ اینٹیں فراہم کرنے کے لیے آس پاس کے مکانات ڈائنامائٹ سے اُڑائے جا رہے ہوں پھر ان کو چُرانے کی عبادت شروع ہوگئی۔ گھروں کے اندر ان اینٹوں سے مرغیوں کے ڈربے بنائے جانے لگے جن میں وقت آنے پر تھوڑی سی ترمیم اور صفائی کے بعد مہمان ٹھہرائے جاسکتے تھے۔ دور و نزدیک ہر مکان کی پشت پر رضا کارانہ محنت سے اوپن ایر (Open air) بیت الخلا بھی بنا دیے گئے۔ اس طرح سلم (Slum) کا توسیعی پروگرام بروئے کار آنے لگا۔ ایسے سلم جہاں ہر طرح کے جراثیم اور جرائم کو پنپنے اور محکمۂ حفظانِ صحت پر تنقید کے مواد فراہم ہوتے رہیں۔ چنانچہ کثرت سے تخلیق و تنقید یا تخلیقی تنقید کے نمونے ملنے لگے۔ انھی میں سے بعض نیاریوں نے سائنٹفک تنقید کے فن پارے بھی دریافت کر لیے۔

کچھ دنوں تک جس تندہی سے اینٹیں بچھائی جاتی رہیں اسی اطمینان کے ساتھ یہ شغل ترک کر دیا گیا۔ جب لوگوں کو یقین آچلا کہ یہ سڑک صرف سرخ اینٹوں کی ہوگی اور روس اور ایشیا کی شیرازہ بندی کا کام دے گی تو اس پر ہولی، شب برات اور شادی بیاہ کے پٹاخے چھوڑے جانے لگے اور طرح طرح کی دھوم مچائی جانے لگیں۔ ایسی سڑکیں کم دیکھنے میں آئی ہوں گی جہاں ہر صورت و سیرت کی اینٹیں "جیو اور جینے دو" کی ذہنی یک جہتی کے ساتھ محو استراحت ہوں! یہاں تک کہ بعض حلقوں میں اس کو "کنارآب چوپاٹی و گل گشت اپالو" کی حیثیت حاصل ہونے لگی، سوا اس معمولی فرق کے کہ اپالو اور چوپاٹی میں سمندر "ٹھاٹھیں" مارتا ہے، یہاں جا بجا گندی موریاں موجزن تھیں اور سڑک کے دونوں سمت بقول غالب "ہجوم درد غریبی" کے سر پر ڈالنے کے لیے:

"وہ اک مشت خاک کہ صحرا کہیں جسے"

موجود تھی گرد و پیش کے رقبے کو دیکھ کر اکثر یہ خیال آیا کہ یہاں کے نشیب و فراز جو گرد یا گندے پانی سے لبریز رہتے ہیں اس کا سبب کیا ہے۔ یعنی اس جگہ پر کبھی کوئی سمندر تھا جو بتدریج خشک ہو رہا ہے یا ریگستان تھا جو سمندر میں تبدیل ہونے والا ہے۔

اپالو (Apollo) یا منروا (Minerva) کی معلوم نہیں کس برہمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن زور کا دھماکہ ہوا اور اس گلگشت پر اینٹ کی روڑیوں کی بارش ہونے لگی اور سڑک پر پاؤں کے بل چلنے کے بجائے اکثر لوگ دوسرے اعضا کے بل چلتے یا چلتے رہنے کی کوشش میں مصروف پائے گئے جیسے کسی تالاب میں نہیں بلکہ سڑک پر پڑی ہوئی روڑیوں میں پیرا کی سیکھنے کی کوشش کر رہے ہوں یا اس کا کرتب دکھا رہے ہوں۔ چنانچہ قانون کی نظر میں اس جرم کے مرتکب پائے گئے کہ سڑک جو پبلک کی آسائش کے لیے تعمیر ہو رہی تھی اس کو درہم برہم کرنے یا اس پر لوٹ لگانے سے فلاحِ عامہ میں خلل انداز ہو رہے تھے چنانچہ ''نوٹس بنا بر دکھانے وجہ کے'' جاری کیا گیا کہ ان پر مقدمہ کیوں نہ چلایا جائے!

پہلے تو محلّہ والوں نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی، لیکن فلاحِ عامہ کے کارندے مقدمہ قائم کرنے اور اس کو داخلِ دفتر کرا دینے کی زحمت کا حق المحت طلب فرمانے لگے تو محلّے کے ایک گرگِ باراں دیدہ وکیل نے جو تحفظِ فلاحِ عامہ کے نہیں بلکہ تحفظِ قانون کے علم بردار تھے یہ جوابی الزام تراشا کہ شاہ راہ کو ایسی حالت میں کیوں رکھا گیا کہ عہدِ آزادی کے صلح پسند اشراف کے اعضاو جوارح کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے کا امکان بڑھ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باشندگانِ محلّہ بالخصوص مجروح و مضروب کو ایک کے بجائے دوسرے کو حق المحت ادا کرنا پڑا۔

جیسا کہ ہمارا قاعدہ ہے ہر وہ بات جو ہم اپنے بچپن میں کیا کرتے تھے، اس پر خوش ہوتے اور فخر کرتے تھے، اپنے بچوں میں دیکھ کر اپنے سے کڑھتے اور ان کو کاٹ کھانے دوڑتے ہیں اور اسے کسی آفتِ ارضی یا سماوی کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں، لیکن آج تک کسی نے نہ تو گناہ سے منہ موڑا نہ یہ جہان تہ و بالا ہوا پھر بھی بہ نظرِ احتیاط ہم نے کمرے اور برآمدے میں افطار و سحری کے چارٹ کے ساتھ فیملی پلاننگ کے چارٹ اور اس سے متعلق پند و نصائح جہاں تہاں آویزاں کر دیے اور اپنے گناہوں کو یاد کر کے اپنی اولاد کے گناہوں کو بھی نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ یہ سب اور وہ بھی جو ان کے باوجود ہوتا رہتا ہے ہوتا رہا۔

ایک اندھیری رات کے بعد صبح کے وقت جسے یقیناً خوش گوار نہیں کہہ سکتے باوجود اس کے کہ انگریزی محاورے میں ہر حادثے کا وقت بالعموم ''خوش گوار صبح'' (One fine morning) ہوا کرتا ہے، پردۂ غیب سے ایک اسٹیم رولر ایک خاص غیر جانب دارانہ وقار کے ساتھ روڑے

روڑیوں کو ہم بزمی و ہم طرحی کا درس دیتا ہوا اور سے نمودار ہوا اور ان کو اس طور پر ہموار، ہم نفس اور تو من شدی من تو شدم، کرتا چلا آ رہا ہے جیسے مضافات سے یکہ پر آنے والے دیہاتی مرد، عورت اور بچے ایک دوسرے میں مدغم نظر آتے ہیں۔ ان سواریوں کو میں کبھی گن نہ پایا۔ جب کبھی اس کی کوشش کی کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے مرد، عورت، بچے علاحدہ علاحدہ نہ ہوں ایک دوسرے سے اُگے ہوں جس طرح کسی گلاب پر طرح طرح کی قلمیں چڑھادی گئی ہوں۔ یہ مسافر کافی گرد آلود، لیکن جاندار ہوتے ہیں۔ اگر ان پر تھوڑا سا پانی چھڑک دیا جائے تو منزلِ مقصود تک پہنچتے پہنچتے ایک دوسرے سے جڑ جائیں گے اور پھر ایک ایسا عجوبہ روزگار ہم کو نظر آ جائے گا جس کی تلاش میں ہم سیارگانِ فلک کا چکّر کاٹتے رہتے ہیں۔

محلّے کے معلوم نہیں کتنے بچے جن کے جسم پر لباس کے بجائے پیشانی پر صرف 'ستارۂ بلندی' چمک رہا تھا انجن کے اردگرد دھوم مچاتے اور آپس میں تفریحاً گالی گلوج اور مار پیٹ کرتے رواں دواں نظر آنے لگے جیسے یہ کوئی انجن نہ تھا بلکہ کسی لیڈر کو جیل خانے پہنچانے، ووٹ دلانے یا امن قائم کرنے کے لیے جا رہے ہوں۔ لڑکوں کی اس یورش اور طرح طرح کی فرمائش کو غریب ڈرائیور ہر طریقے سے ٹالتا۔ کبھی چمکار کر، کبھی دھتکار کر، یا دھمکا کر، کبھی گالی دے کر بالآخر روہانسا ہو کر، لیکن کچھ کارگر نہیں ہوتا تھا۔ ڈرائیور کو یہ فکر کہ کہیں یہ متحرک روڑے ساکت روڑیوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائیں اور نادانستگی میں ان پر سے رولر گزر جائے، لڑکوں کو یہ ضد کہ اس عجیب الخلقت اور عجیب الحرکت انجن کے ساتھ جب تک وہ سلوک نہ کر لیں گے دم نہ لیں گے جو اگلے زمانے میں کبھی ان کے پیش روؤں نے شیطان کے ساتھ کیا تھا جو کتب کے لڑکوں کو شرارت میں آزمانے کے لیے ان کے سامنے گدھے کی شکل میں نمودار ہوا تھا۔ وہ اس کی تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے ان لڑکوں کو شیطان کا لقب کس نے دیا اور کیوں دیا؟ چنانچہ اپنے ''کاپی رائٹ'' کو منوانے اور اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے آیا تھا، البتہ اُس بے وقوف کو یہ نہیں معلوم تھا کہ گدھے کی شکل میں نمودار ہو کر اسی کی آواز میں صدائے احتجاج بلند کرنا نرا گدھا پن تھا۔ اس مہم میں شیطان پر کیا گزری سب جانتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس حادثے کے بعد ان لڑکوں سے وہ اتنا بے تکلف نہیں رہا جتنا ان کے والدین سے۔

یہ سڑک اتنی سرخ اور لہو رنگ نظر آنے لگی کہ اس میں کسی اور حکومت کے "دستِ غیب" کا شبہ ہونے لگا۔ چنانچہ سڑک کو نیک نام اور محلّے کو نظرِ بد سے محفوظ رکھنے کے لیے اُس پر خاک ڈالی جانے لگی مثلاً " خاک بر سر کن غمِ ایام را" یا "یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔" عام خیال یہ ہے کہ اس سڑک یا محلّے کو گزند نہیں پہنچ سکتا اس لیے کہ اس کا حدود اربعہ نظر بد کے لیے نہایت درجہ ہمت شکن ہے۔ اس پر ایسے سرد و گرم چشیدہ بوڑھے، دین دار نوجوان، خاکستری بچے، آوارہ کتے، غلاظت در کنار بھنگیں رواں دواں رہتی ہیں۔ بالخصوص ایسی گندی موریاں ان کی بو باس اور خواص ہیں کہ ان کے سامنے فلیٹ اور ڈی ڈی ٹی دونوں کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی ہے اس لیے کہ ان کے خلاف مچھر اور مکھیوں نے اَمنیت حاصل کر لی ہے۔ یہاں تک کہ حفظانِ صحت کے اکثر محققین اور ماہرین، مختلف جراثیم کش دواؤں کے بجائے اب ان موریوں کے مقوّیات کام میں لانے لگے ہیں۔ تجربہ نے یہاں تک ثابت کر دیا ہے کہ ان کے خلاف کسی قسم کے جراثیم، یہاں تک کہ بین الاقوامی مسائل بھی اَمنیت نہیں حاصل کر سکتے جن کو ہر طرح کی اَمنیت سے محفوظ رکھنے کی کوشش بلیغ کی جاتی ہے۔

بعض لوگ کتنی ہی صفائی کیوں نہ ملحوظ رکھیں ان میں کچھ نفسیاتی خواص ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے چہرے پر اور ان کے آس پاس مکھیاں بھنبھناتی رہتیں یا طرح طرح کے بھنگے چکّر کاٹتے رہتے ہیں۔ ان پر بھی اس کی ہلکی پھوہاریں ڈال دی جائیں تو ان مکھیوں اور بھنگیوں کی کیا حیثیت! کتنے لوگ ان کے قریب آنے سے باز رہیں گے۔ ان مقوّیات کا اطبا کوئی نسخہ اب تک دریافت نہیں کر سکے ہیں نہ ماہرینِ کیمیا کوئی فارمولا، اس لیے کہ یہ ایسے اجزا سے مرکب ہیں جو نا قابلِ شناخت اور نا قابلِ گرفت ہیں۔ اب تک یہ بھی نہیں دریافت کیا جا سکا ہے کہ یہ جراثیم کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں یا ایسا نہیں کہ انھوں نے وائرس (Virus) کی حیثیت حاصل کر لی ہو۔ مختصر یہ کہ یہ سڑک اور اس کے تمام مشمولاتِ منقولہ و غیر منقولہ جس حال میں ہیں ان کے ہوتے ہوئے اسی کو نہیں یونیورسٹی کے پورے رقبے کو نہ کسی نظر بد کا اندیشہ ہے نہ نظریۂ بد کا۔

سڑک کی تعمیر کی ابتدا ہوئی تو برقی روشنی کے لیے آہنی ستون نصب کیے جانے لگے تا کہ سڑک پر روشنی کا انتظام ہو جائے اور غیر محتاط آنے جانے والوں سے سڑک یا ستونوں کو صدمہ نہ پہنچ سکے۔

کھمبے نصب کر دیے گئے اور ان پر روشنی کے قمقمے بھی رونق افروز ہو گئے۔ روشنی آ گئی سڑک کے کنارے جتنے مکانات تھے ان کے صحن برآمدے اور کمرے تک روشن ہو گئے۔ اس شدت سے جیسے مکان کے در و بام ہی نہیں مکان میں رہنے بسنے والوں کے سینے میں چھپے ہوئے راز بھی عالم آشکار ہو جائیں گے۔ روشنی کے اس سیلاب میں صحن و برآمدہ میں سونا، بیٹھنا دشوار ہو گیا ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی کو سرِ راہ دوپہر کے وقت دھوپ میں لیٹ رہنے پر مجبور کیا جائے۔ درخواست کی گئی کہ قمقمے کسی قدر نیچے کر دیے جائیں یا ان پر مناسب شیڈ لگا دیے جائیں کہ روشنی سڑک اور متوازی راستوں کو اور زیادہ روشن کر دے۔ اس طرح گھر میں رہنے والوں کو عافیت مل جائے گی۔ ہمارے لیے سرو و ہمسایہ (باشکالِ مختلف) کیا کم آفت ہے کہ روشنی طبع کی طرح بجلی کی یہ روشنی بھی ہم پر مسلّط ہو گئی۔ جواب یہ ملا کہ روشنی سے حکامِ متعلقہ کا معاہدہ ہو چکا ہے کہ اس نے جس بلندی پر فائز رہنا منظور کر لیا ہے اس کو کسی حال میں کم نہیں کیا جا سکتا اور ایسا کرنے کی محکمۂ تشریفات (Protocol) اجازت نہیں دے سکتا اس لیے محلّہ والوں کو "قدِ یار کا عالم" دیکھنا اور "معتقدِ فتنۂ محشر" ہونا پڑے گا۔

ہر روز اور ہر وقت پھیری لگانے والے بے شمار خوش حال پیشہ ور گداگروں کی طرح طرح کی صداؤں میں سے ایک صدا "دعائے فقیراں رحم اللہ" بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوتی ہو یا نہیں، بچوں میں سے چند کو پسند آ گئی۔ جن کے پاس ہوائی بندوق تھی انھوں نے اُس سے، دوسروں نے غلیل اور ڈھیلوں سے نشانہ لگانا شروع کر دیا اور قمقموں اور آنے جانے والوں کا ناک نقشہ خطرے میں پڑ گیا، لیکن واحسرتا! کہ یونیورسٹی کی فضا کثرتِ اولاد ہی کے لیے سازگار نہیں ہے بلکہ قبل از وقت ان کو عاقل اور بالغ کر دینے میں بھی معین ہوتی ہے۔ بچے زیادہ دن تک بچے نہیں رہے جلد ہی جوان اور بے ردیف و قافیہ کے شاعر بن گئے اور اندھیرے اُجالے کے بہتر مواقع ان کی دلچسپی کے مرکز بن گئے اور ہم روشنی میں آتش بجاں رہنے اور اپنے اپنے گھروں میں رات کے وقت چوروں کی نگرانی کرنے لگے۔

جس طرح محبوب کی پذیرائی کے لیے غالب کو انہی کے گھر کی دربانی سونپی گئی تھی ہم کو چوروں کے اعزاز میں یہ خدمت سپرد کی گئی۔ یہ قضیہ "حکامِ عالی مقام" کی خدمت میں پہنچایا گیا تو پولیس والوں نے احتجاج کیا کہ روشنی پر پابندی عائد کی گئی تو چور، چوکیدار اور مالکِ مکان ایک

دوسرے کو پہچانیں گے کیوں کر؟ ممکن ہے ایسے حادثے پیش آجایا کریں کہ غلط شخص، غلط شخص کا تعاقب کرنے لگے یا ایک دوسرے کو زدوکوب کر رہا ہو۔ آج کل جب کہ باہر پولیس کو پبلک سے اور اندر بیوی کو شوہر سے تعلقات خوش گوار رکھنے پر زور دیا جا رہا ہے اور بین الاقوامی افق تاریک سے تاریک تر ہوتا جاتا ہے اس طرح کی جارحانہ غلطیوں سے بچنا چاہیے۔

بایں ہمہ یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ جو شخص نہ چور ہے نہ چوکیدار وہ رات بھر جاگنے کے عذاب میں کیوں مبتلا کیا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ آزادی حاصل ہونے سے پہلے دیسی ریاستوں میں بالعموم ایسا ہی ہوا کرتا تھا کہ رات میں سارے کام انجام دیے جاتے اور دن میں سویا کرتے تھے اس سلسلے میں ایک بزرگ کا قول یاد آیا جو کچھ اسی قسم کا تھا۔ کسی ستم شعار حکمرانِ وقت نے ان سے اپنے لیے نصیحت کی درخواست کی۔ بزرگ نے فرمایا کہ "تمہارے لیے سب سے بڑی نصیحت اور عبادت یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سوئے رہا کرو۔" بعد میں کسی نے اس کی مصلحت دریافت کی تو فرمایا کہ "جب تک یہ شخص سوتا رہے گا خلق اللہ اس کے جور و ستم سے پناہ میں رہے گی۔" ممکن ہے والیانِ ریاست نے بھی اس نصیحت کا لحاظ رکھا ہو، لیکن اس کا کیا علاج کہ انھوں نے دن اور رات کا مفہوم ہی بدل دیا ہو۔

ایک دن معلوم ہوا کہ سڑک کی چھاتی پر مونگ دلنے کے بجائے پتھر کے وہ روڑے ڈالے جانے والے ہیں جو اس کی دونوں طرف مدت سے محوِ خواب تھے یا جن کے پہلو میں سڑک "آرامیدہ" تھی! اب اس سڑک پر چلنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ چوڑائی میں ان کو پار کرنا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی سوا ان سائیکل سواروں کے جو دوستوں سے عاریتاً سائیکل مانگ کر کام میں لا رہے ہوں یا کہیں سے لے بھاگے ہوں اور ان کا تعاقب کیا جا رہا ہو۔ کچھ لوگ اس تصور سے بھی خوش یا خائف تھے کہ کسی شامِ اودھ یا صبحِ بنارس میں اسلامی قانون نافذ ہو گیا تو بعض جرائم کی سزا سنگ ساری سے اسی سڑک پر دی جایا کرے گی۔ اس لیے کہ تول اور تعداد میں اتنے مناسب حال سنگ پارے آسانی کے ساتھ کہیں اور دستیاب نہیں ہو سکتے تھے۔

بعضوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر "حجِ بدل" کی کوئی اور قسم دریافت ہو گئی یا مان لی گئی اور ہندوستان کی سرزمین پر بھی حج ہونے لگا تو شیطان کی خبر کنکریوں کے بجائے ان سنگ ریزوں سے

لی جایا کرے گی جس کے لیے حاجیوں کو شیطان کی مرمت کرنے علی گڑھ آنا اور اس سڑک سے گزرنا پڑے گا البتہ حاجیوں کا ان سنگ ریزوں پر سے گزرنا شیطان کے سنگ سار ہونے سے کم تکلیف دہ نہ ہوگا۔ پھر یہ کہ لڑکوں کے علاقے میں اوّل تو یوں بھی شیطان کم آتے جاتے ہیں دوسرے یہ کہ یہاں کے شیطان اتنے بے وقوف بھی نہیں کہ جہاں اتنے پتھر کے روڑے اور قوم کے چشم و چراغ اکٹھا ہوں اور سودیشی حج کا زمانہ ہو تو وہ ادھر کا رُخ بھی کریں گے۔

سننے میں تو یہاں تک آیا ہے کہ جب سے عرب میں تیل کے چشمے اور امریکہ کے ٹھیکہ دار دریافت ہوئے ہیں وہاں کے شیطان ویرانوں اور ریگستانوں میں (خاص طور پر حج کے زمانے میں) بھٹکتے ہوئے نہیں ملتے بلکہ سرد خانوں میں چلے جاتے ہیں اس طور پر وہاں کی حکومت کو یہ دقت محسوس ہو رہی ہے کہ حاجیوں کے لیے اتنے شیطان کہاں سے فراہم کیے جائیں جن کی کنکریوں سے خبر لی جایا کرے۔ امریکہ اس دشواری پر بھی غور کر رہا ہے، لیکن شیطانوں کی درآمد میں بین الاقوامی قوت کے توازن بگڑنے کا بھی خطرہ لاحق ہے۔ اس مسئلہ کو انجمن اقوام کی متعلقہ کونسل یا کمیٹی کے سپرد کیا جانے والا ہے کہ ہر ملک سے شیطان کی درآمد و برآمد کے مسئلے پر غور کر کے یہ بتائے کہ انجمن اقوام کس طرح اس ذمہ داری سے سبک دوش ہو سکتی ہے اور وقت آنے پر کون کون سے ممالک اس کارِ خیر میں شریک ہو سکتے ہیں۔ ایک تجویز یہ بھی ہے کہ ہر ملک کا حاجی سنگ سار کرنے کے لیے اپنا شیطان ساتھ لائے۔

اس اندیشے کی تائید ایک عزیز کے قول سے بھی ہوتی ہے کہ اگر علما میں 'بدعت' اور امرا میں ''ثقافت'' کی یہی کارفرمائی رہی جیسا کہ دیکھنے میں آ رہی ہے تو کسی نہ کسی بہانے حج بھی جگہ جگہ ہونے لگے گا۔ خاص طور پر علی گڑھ میں جہاں کی سالانہ نمائش اور ہر وقت کی مسلم یونیورسٹی مشہور ہے کچھ اس طرح کا بھی خیال ہے کہ اگر ہمارے یہاں کے شیطانوں کی طرح عرب کے شیطان بھی ''سیفٹی فرسٹ'' کے قائل ہو گئے تو وہ حج کے زمانے میں اپنے قیام و طعام کا انتظام حدودِ کعبہ سے کافی دور رکھتے ہوں گے۔

تار کے ستونوں کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اب دن رات کا مشغلہ یہ رہ گیا ہے کہ ہر بچہ دن بھر کھمبوں پر پتھر پھینکتا رہتا ہے اور ٹن ٹن کی آواز سے خوش ہوتا ہے۔ بعضوں نے اس نیک کام

کے لیے ڈنڈے بھی حاصل کر لیے ہیں اور کھمبا بجانے سے دل سیر ہو جاتا ہے تو ڈنڈے بجانے لگتے ہیں۔

ان بچوں کے والدین کو نہ اس کی فکر نہ اتنی استطاعت کہ ان کو اسکول بھیج سکیں یا کسی مکتب میں بٹھا دیں جہاں کچھ اور نہیں تو یہ مدرّسوں کے ہاتھ سے مسلسل پٹتے اور ان کے گھر کا کام کاج کرتے رہیں۔ پھر مدرسے میں ان سے زیادہ ذات شریف لڑکوں کی یکجائی جہاں تعلیم و تربیت یا تہذیب سے بہرہ مند ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ یہ لڑکے حعدّی امراض میں خود گرفتار ہوتے ہیں اور دوسروں کو مبتلا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جتنے ناپسندیدہ خصائل ان میں راسخ ہو جاتے ہیں وہ پھر کبھی نہیں جاتے اور معاشرے کے لیے ایک مستقل خطرہ بنے رہتے ہیں۔

جن گھرانوں میں اولاد اور پیسے کم ہوتے ہیں وہاں تیج تیوہار بالعموم زیادہ دھوم سے منائے جاتے ہیں۔ غالباً اس خیال سے کہ اس سے مقدس ارواح یا دیوتا اولاد اور پیسے کا توازن برابر کر دیں گے۔ یہ مدعا پورا ہوتا ہے یا نہیں آج تک نہ معلوم ہو سکا البتہ اتنا ضرور دیکھنے میں آیا کہ پیسے اور کم ہو جاتے ہیں جن کی کمی اولاد سے پوری کرنی پڑتی ہے۔ معلوم نہیں غریب کا یہ فارمولا کب سے مانا ہوا چلا آ رہا ہے کہ ہر کمی اولاد کی افزائش سے پوری کی جا سکتی ہے۔ شب برات اور دیوالی میں بچوں کے والدین گولے پٹاخے نہیں فراہم کر سکتے، ان کے بچے یہ کمی ان کھمبوں سے پوری کر لیتے ہیں اور شب برات اور دیوالی کی آمد و رفت سے کئی دن پہلے اور بعد تک کھمبوں کی زد و کوب سے پٹاخے کا کام لیا جاتا ہے۔ ملکی مصالح کی کمی کی بنا پر اس سال بارود پر یقیناً کنٹرول ہوگا اور بازار میں آتش بازی مہنگی ملے گی۔ اس کی کسر محلّے کے بچے براہِ راست ان کھمبوں سے نکالیں گے۔

یہ لڑکے کسی مدرسے میں پہنچ بھی جاتے ہیں تو وہاں کے مدرّسین کا حال بھی کچھ زیادہ اُمید افزا نہیں ہوتا جس کی طرف اوپر اشارہ کر آیا ہوں کہ یہ کس طرح ان بچوں سے بالعموم پیش آتے ہیں۔ ان مدرّسوں کے فیضان سے یہ لڑکے اسکول چھوڑ کر بازاروں، سینما اور اسٹیشنوں پر جیب کترنے لگتے ہیں یا اتنے ذہین اور مَن چلے نہ ہوئے تو اسکول سے غیر حاضر رہنے کی تفریح میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اسکول کے مقررہ مطالبات کے علاوہ والدین ایک بھاری رقم غیر حاضر رہنے کی

مد میں ادا کرتے ہیں۔ پرائیویٹ ٹیوٹر کا ماہانہ بل اوپر سے۔ اسکول کی تعلیم کا جدید ترین اصول یہ معلوم ہوا ہے کہ ہر طالب علم کا پیدائشی ورنہ قانونی حق یہ ہے کہ اس کے لیے کوئی پرائیویٹ ٹیوٹر ضرور مقرر کیا جائے جس کے ناموس اور ناک کان کے سالم وثابت رکھنے کی ذمہ داری والدین پر ہو۔ کچھ تعجب نہیں جلد یا بہ دیر کوئی قانون اس طرح کا نافذ کردیا جائے کہ لڑکا اسکول میں پڑھتا ہو یا نہیں یا والدین سرے سے اولاد ہی سے کیوں نہ محروم ہوں، پرائیویٹ ٹیوٹر ضرور رکھا جائے۔

اسکول میں اب لڑکوں کی تعلیم، تربیت وتہذیب پر زور دینے کے بجائے تفریح، تفنن، آزادی اور ایک گونہ بے راہ روی پر زیادہ زور دیا جانے لگا ہے اس لیے کہ جدید نظریہ یہ ہے کہ بچوں کی ذہنی و اخلاقی درستی پر براہِ راست زور دینے کے بجائے توڑ پھوڑ، جوڑتوڑ بالفاظ دیگر دست کاری وضمناً دست درازی پر توجہ دی جائے تاکہ آگے چل کر وہ سیاسی ومعاشی سرگرمیوں اور بالآخر اسی قبیل کی بدکرداریوں میں طاق ہوجائیں۔

میں نے اکثر ان کو مدرسے آتے جاتے دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے کہ ان اداروں کے طور طریقے کس دردناک حد تک پست ہوچکے ہیں اور وہ لوگ جوان بچوں کی تعلیم وتہذیب کے لیے مقرر کیے گئے ہیں اپنے فرائض کی انجام دہی میں (خواہ کسی سبب سے) کتنے بے بس یا بے پرواہ ہیں۔ یہ حال ان بچوں ہی کا نہیں ہے بلکہ کافی تعداد میں یونیورسٹی کے طلبا بھی ایسے ملیں گے جن کی وضع قطع، اطوار وگفتار کو دیکھ اور سن کر کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی غبی، سخت پوست یا مردم بیزار کیوں نہ ہو یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ کس درخت کی شاخیں ہیں اور کن ''ڈالیوں کے ثمر۔''

ایک ابتدائی مدرسے کے بچوں کا حال جن میں بعض نسبتاً سیانے ہیں اکثر دیکھنے میں آتا رہتا ہے۔ ان میں چند ایسے ہوتے ہیں جن کو ان کی ماؤں نے باوجود تنگ حالی نہلا دھلا، صاف کپڑے پہنا، بالوں میں تیل کنگھا کرکے بہت سی اچھی باتیں سکھا بتا کر بھیجا ہے۔ صاف سا ایک جزدان ہے جس میں ان کی سلیٹ اور کتابیں ہیں۔ ممکن ہے ناشتے کے لیے بھی کوئی روکھی پھیکی چیز کاغذ میں لپیٹ کر رکھ دی ہو۔ بُرے لڑکوں سے علاحدہ رہنے کی تاکید اور ان کی گالی گلوج سے بچنے کی بھی ہدایت کردی ہوگی اور اس کی بھی تاکید کردی ہوگی کہ اسی صفائی ستھرائی اور سلیقے کے ساتھ اسکول سے فارغ ہوکر براہِ راست گھر واپس آجائیں جس سے وہ بھیجے جارہے ہیں وغیرہ۔

ان کو شریر اور نامہذب ساتھیوں سے بچ کر اسکول جاتے دیکھا ہے۔ یہ تمام تر کے ان کو طرح طرح سے ستاتے، شوروغل مچاتے، گالی گلوج اور ہاتھا پائی کرتے، میلے پھٹے کپڑوں میں راستے کی دُھول عمداً اُڑاتے جاتے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پھٹی پرانی کتابوں اور کاپیوں کا وہی نقشہ نظر آتا ہے جیسے یہ کتابیں نہ ہوں مُردہ گلہریاں اور چوہے ہوں جن کو انھوں نے راستہ میں پالیا ہو اور اس سے تفریح کرتے چلے جارہے ہوں۔ ننھے اوباشوں کا یہ ہجوم نیک خصلت بچوں کو اس طرح ستاتا ہے کہ وہ سہمے ہوئے چپ چاپ سڑک کے حاشیہ پر چلنے لگتے ہیں اور اسی طرح ہر احتیاط ملحوظ رکھتے ہیں جیسے ان کو احساس ہو کہ ان کی مائیں ان کو دیکھ رہی ہیں۔

تقریباً 90-80 فی صدی یہ بے راہ بچے ایسے ہوتے ہیں جن کے طور طریقے دیکھ کر دل لرزنے لگتا ہے کہ معاشرے کے نالائق اور خطرناک افراد بننے کے لیے یہ کیسی ٹریننگ دی جارہی ہے۔ بسا اوقات مجھے کسی جنگی محاذ کا خطرہ یا ذمے داری اتنی نہیں محسوس ہوتی جتنی بچوں کے اس محاذِ تعلیم کی! اس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے گھر کی فضا کیسی ہے۔ ان کے والدین ان کا کتنا خیال رکھتے یا رکھ سکتے ہیں۔ یقیناً یہ افلاس کا کرشمہ ہے، لیکن یہاں اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کرسکتے کہ ایسے ہی بچے اسی تعداد میں اسکولوں کی گرفت سے آزاد دیہاتوں میں والدین کی محنتِ شاقہ میں ان کا ہاتھ بٹاتے اور ان کا سہارا بنتے ہیں، لیکن شہری بچے غریب والدین پر بار ہی نہیں ہوتے بلکہ سوسائٹی کے لیے خطرہ بنتے جاتے ہیں۔ دیہی اور شہری معاشرے کا یہ فرق نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا اعتراف کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ میں نے آس پاس چپراسی، بہشتی، خانساماں اور دوسرے محنت کشوں کے بھی بعض مکانات دیکھے ہیں جو اپنے گھر کو اتنا صاف ستھرا اور گھر کی پوری ڈسپلن کو اس درجہ استوار رکھتے ہیں کہ ان پر خود مجھے رشک آیا ہے۔

سب سے الم ناک منظر وہ ہوتا ہے جب اسکول سے یہ گروہ چیختا چلاّتا، دھول اُڑاتا، اُودھم مچاتا، فحش بکتا چھٹی کے بعد مدرسے سے واپس آتا ہوتا ہے۔ جن بچوں کو اس سے قبل جتنا صاف ستھرا آسودہ حال جاتے ہوئے دیکھا تھا ان کو اتنا ہی اُجڑا ہوا، سراسیمہ، مایوس اور سر لٹکائے واپس آتے دیکھا جیسے ان سے وہ سب چھین لیا گیا ہو جو وہ گھر سے لے کر گئے تھے اور سوچ رہے

ہوں کہ ماں کو کیا جواب دیں گے، لیکن غریب ماں ان کو پھر سے Rehabilitate (اُجڑے ہوئے بوٹے کو پھر سے آباد کرنا اور کام سے لگانا) کرے گی۔ یہ ہر روز کا اور ہر جگہ کا قصہ ہے جسے ہم دیکھتے اور ''ایوان ہائے عالیہ'' میں زندگی کا معیار اونچا اور دشمن کو نیچا دکھانے کی بلند بانگ تقریریں سنتے رہتے ہیں۔

بچوں کو کھمبے سے یہ تفریح کرتے ہوئے کتّوں نے دیکھا تو انھوں نے بھی اس کو اپنا ہدیۂ محقر پیش کرنا شروع کر دیا۔ کوئی کتا آزاد شہری کی مانند یا ناخواندہ مہمان کی حیثیت سے کسی گھر کے اندر سے ضربِ شدید یا خفیف کھا کر فریاد کرتا ہوا برآمد ہوتا تو ایک فطری تقاضے کو ایک خاص اسٹائل سے پورا کرنے کے لیے اسی کھمبے یا اس کے بھائی بند کسی دوسرے کھمبے کا سہارا لیتا اور پٹائی کی شست و شو کر لیتا۔ پھر کسی دوسرے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے تازہ دم ہو کر کسی اور طرف نکل جاتا۔ بچوں کی دیکھا دیکھی راستے سے گزرنے والے یونیورسٹی کے طالب علم بھی کھمبے کی تواضع سنگ ریزوں سے کرنے لگے ہیں جیسے ان کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا ہو کہ پتھر سے کھمبے کی خبر لینا تمام دن خیریت اور خوشی سے گزارنے کے لیے ایک نیک شگون ہو۔

جس طرح یہ بچے باہر کھمبے سے پیش آتے ہیں اسی طرح گھر کے اندر ان کے ماں باپ یا یہ خود ایک دوسرے سے سلوک کرتے ہیں۔ اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ پلی ہوئی مرغیوں اور بطخوں سے تنگ آکر بددعا دیتے ہوئے سب کو کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر ہانک کر اندر سے دروازہ بند کر لیتے ہیں، ویسے ہی ان بچوں کو مار پیٹ کر مکان سے باہر کر دیتے ہیں تاکہ خود ان کو چین لینے کا تھوڑا سا موقعہ اور ان کی سرگرمیوں کے لیے ایک وسیع اور زرخیز تر جولاں گاہ مل جائے۔

گھر کے تاریک سے تاریک خاموش اور دور افتادہ گوشے میں کیوں نہ پناہ لیجیے کتّوں کی یورش کھمبے کی مسلسل فریاد اور محلّے کے نونہالوں کے باہمی ''دشنا ییئے یا فجا ییئے'' سے نجات نہیں۔ کبھی کبھی جذبۂ انتقام سے بے اختیار ہو کر سر سے کفن باندھ کر نکلیے (یہ کفن باندھنا تجہیز و تکفین کی سہولت کی خاطر اتنا نہیں ہوتا جتنا فضا میں بھٹکے ہوئے سنگ ریزے سے بچنے کے خیال سے ہوتا ہے) اور کھمبے کو بچوں اور کتوں کی تفریح کی زد میں دیکھیے تو شہید یا غازی بننے کا جذبہ

اُبھرتا ہے، لیکن ایمرجنسی کے احترام میں غصہ کو تھوکنا اور اپنی یادداشت اور احتیاط دونوں پر نفریں کرتے ہوئے پسپا ہونا پڑتا ہے۔

اب ان روڑوں کو یکساں و یک جہت کرنے کی خاطر ایک بار پھر اسٹیم رولر کا انتظار کیا جارہا ہے سیارگانِ فلک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض "سفرنصیب" اپنے محور پر ایک جگہ سے گزر جاتے ہیں تو ہزاروں لاکھوں سال بعد بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت میں اس جگہ پر دوبارہ نظر آتے ہیں۔ یہ معمولی چاند تاروں کی مانند نہیں ہوتے جو تقریباً ہر روز دکھائی دے جاتے ہیں۔ یہ انجن اوّل الذکر سیاروں کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ دیکھئے اس محلّے کے محور پر پھر کب نظر آتا ہے۔

اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی!

سنگ خارا کے ان ٹکڑوں کو دیکھ کر دہلی کے قرول باغ کی آس پاس کی پہاڑیاں یاد آتی ہیں جہاں راجستھان کی غریب عورتیں روڑے روڑیاں توڑتی ہوتی ہیں۔ مئی جون کی تپتی ہوئی دھوپ اور ہر تری کو خشک کردینے والی لُو میں اپنے شیرخوار مضغۂ گوشت، جگر گوشوں کو برائے نام ایک سمت سے آڑ کر کے دہکتے ہوئے پتھر پر اپنے قریب لٹائے سنگ پاروں کو توڑتی ہوتی ہیں اور انگلیوں میں چیتھڑے باندھے ہوتی ہیں کہ پتھر کی نوک اور دھارے سے اُنگلیاں زخمی نہ ہونے پائیں۔ ان بے نور، محنتی اور غیور عورتوں کو اس شغل اور ان کے معصوم شیرخوار بچوں کو اس حال میں دیکھ کر دنیا کے ہر فلاحی ادارے پر لعنت بھیجنے اور خود اپنے آپ کو جہنم میں دیکھنے کی بے اختیار خواہش ہوتی ہے۔

جس سوسائٹی میں جسم و جان کو اکٹھا رکھنے کے لیے عورتوں کو ایسے بھیانک حالات میں مزدوری کرنی پڑتی ہو اور اس کے معاوضے میں جتنا کم اور روکھا پھیکا کھانے کو ملتا ہو اس پر جتنی پھٹکار ہو کم ہے۔ انسانی کارناموں کی زد میں فلک کے سارے ثوابت و سیار کیوں نہ ہوں اگر وہ اپنے گرد و پیش کی فلاکت و نامرادی پر قابو نہیں پاسکا ہے تو اس کو اپنے کسی کارنامے پر فخر کرنے کا حق نہیں ہے۔ تعجب راجستھان پر آتا ہے کہ اس کی عورتیں اس طرح پیٹ پالنے پر مجبور ہوں اور اپنا وطن چھوڑ کر قرول باغ کی پہاڑیوں کے اس جہنم زار میں اس مشقت پر مجبور ہوں جس کی تاب شاید بھیم، ارجن، نکل اور سہ دیو وغیرہ بھی نہ لاسکتے۔

تردد اس امر کا ہے کہ محلّے میں آ کر کسی دن بیویوں، بچوں یا مرغیوں کی حمایت میں یہاں کے باشندے ایک دوسرے سے طبع آزمائی پر آمادہ ہو گئے تو اس سڑک کی کیسی بے حرمتی ہوگی، اس لیے کہ وہ تمام سنگ ریزے جو اس کے ناموس کے محافظ ہیں وہ گھروں میں یا ایک دوسرے پر دور اور نزدیک میزائل کے طور پر پھینکے جا چکے ہوں گے اور اس حادثے پر غور کرنے کے لیے اقوامِ متحدہ کو ایک مخصوص محفلِ مشاعرہ طرحی غزلوں یا بے قید نظموں کی منعقد کرنی پڑے گی اس لیے کہ کچھ دنوں سے انجمن کے منتظمین یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ مشاعرے کو مقبول بنانے اور محفل کی رونق بڑھانے کے لیے طرحی غزلوں کے علاوہ بے قید نظموں کو بھی انجمن کے پروگرام میں داخل کرنا چاہیے جن پر نظم کا اطلاق ہوتا ہو یا نہیں مقصد کا ہوتا ہو۔ اصرار یہ ہے کہ شعر سے مقصد کا اظہار نہ ہوتا ہو تو پھر مقصد کا اس طور پر اظہار کرنے میں کیا ہرج جس پر شعر کا اطلاق نہ ہوتا ہو۔

قاعدہ کچھ ایسا بن گیا ہے کہ کسی شخص سے برہم یا بیزار ہوتے ہیں تو راون کی طرح اس کا چھوٹا بڑا ڈھانچہ یا پُتلا بنا کر جلسۂ عام منعقد کرتے ہیں، لاؤڈ اسپیکر کی مدد سے اس پر لعنت بھیجتے ہیں، پھر اسے لے کر شہر میں گشت لگاتے ہیں اور آخر میں اس میں آگ لگا کر فارغ ہو جاتے ہیں اور اطمینان کا سانس لیتے ہیں کہ ملعون کو اس کے کیفرِ کردار تک پہنچا دیا اور مزید تقویت حاصل کرنے کے لیے کان پر سے اَدھ جلی بیڑی اُتار کر لمبے لمبے دو ایک کش لے لیتے ہیں۔

ان سے کہیں زیادہ حمیّت اور جرأت کا مظاہرہ (جو یقیناً ناروا اور بے محل ہوتا ہے) بعض اقوام کی وہ عورتیں کرتی ہیں جو شوہر یا اس کے ماں باپ سے ناراض ہو کر اپنی معصوم اولاد کو گود میں لے کر کنوئیں میں کود کر جان دے دیتی ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ دونوں طریقے نامعقول ہیں اس لیے اس خدمت کی ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں کہ اگر کبھی کسی کو خفگی یا خودکشی کا خیال ذہن میں آئے تو اپنے دشمن یا رقیب روسیاہ کا نام، پتہ، حلیہ اور پاسپورٹ سائز کا فوٹو میرے پاس بھیج دے میں اسے بجنسہٖ اس کھمبے سے آویزاں کر دوں گا۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ اس کی رسوائی کتنی عام اور عبرت ناک ہوتی ہے اور کچھ تعجب نہیں کہ آپ کے اس ارادہ سے مطلع ہوتے ہی وہ (جنس کی کوئی قید نہیں) آپ کے در نہ میرے قدموں پر آ گرے۔

بعض مقامات پر بجلی کے ایسے کھمبے یا کھمبوں کا ہجوم دیکھا گیا ہے جن کے اردگرد مضبوط آہنی حلقہ ہوتا ہے اور کچھ اس طرح کی ہدایت نمایاں حروف میں لکھی ہوتی ہے کہ کھمبے کو نہ چھوڈیا اس کے قریب مت جاؤ ورنہ جان کا خطرہ ہے۔ کیا اس سڑک کے کھمبوں پر ایسا کوئی نوٹس آویزاں نہیں کیا جا سکتا کہ ملاقاتیوں کو آنے کی اجازت نہیں، کھمبا جاں بلب ہے اس کے لیے دعائے خیر مانگیے!

(مطبوعہ: نقوش، لاہور۔ شمارہ: 98، جون 1963)

●●●

سوچتا ہوں کہ زندگی کیا ہے؟

سوچتا ہوں کہ زندگی کیا ہے تو معلوم ہوا کہ زندگی کے ساتھ سوچنے کا سلوک اب تک نہیں کیا تھا۔ زندہ رہنے، کام کرنے اور ان سے انعام پانے کی اتنی مسرّت و مصروفیت رہی کہ زندگی کو کام کرنے، خوش رہنے اور خوش رکھنے سے کبھی علاحدہ محسوس نہیں کیا۔ جیسے بھی زندگی کا مقصد ہو۔ یہ تو نہیں کہتا کہ زندگی کے بارے میں سوچنا نہیں چاہیے، لیکن اس شغل میں خطرہ یہ ہے کہ اگر سوچنے والے کی نیت بخیر اور صحت اور سمجھ قابلِ اعتبار نہ ہو تو پھر وہ ساری عمر سوچتا اردو میں تنقیدیں لکھتا یا پالیٹکس میں دھکّے کھاتا رہتا ہے۔

زندگی کے مصرعہ طرح پر انسان نے ابتدائے شعور سے اب تک جتنی غزلیں اور شہرآشوب تصنیف کیے ہیں اتنے شاید ہی کسی اور موضوع پر کیے ہوں گے، اور جب اس صورت حال کو بھی پیش نظر رکھیں کہ زندگی پر سوچنے کا راستہ پہلے خدا تھا اور اب خواتین ہیں تو یہ موضوع اور زیادہ فکرانگیز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بحیثیت مجموعی جدید زندگی میں جسے عام طور پر سائنس اور ٹکنالوجی کا عہد کہتے ہیں، ہم خدا کی طرف اُس تکریم سے نہیں جھکتے جس توقع سے خواتین کی طرف! چنانچہ ترکیب، تشکیل اور تہذیب کے اعتبار سے ہم موجودہ عہد کو سائنس اور ٹکنالوجی کے علاوہ خواتین کا عہد یا عطیہ کہیں تو بے محل نہ ہوگا۔ گو قحط اور افزائشِ اولاد سے اعتقاد اور عشق دونوں کا بازار بھاؤ بہت گر گیا ہے۔

انسان نے سب سے پہلے اور بغیر ارادے کے اپنی ہی زندگی کو زندگی سمجھا ہوگا۔ یوں بھی ہر زندگی اپنی حفاظت کے شعور کے ساتھ وجود میں آتی ہے۔ فطرت کی طرف سے یہ انتظام نہ ہوتو حیات بخشی فطرت کا بے معنی و مصرفانہ عمل بن کر رہ جائے۔ آج جب کہ مذہب، علم، تہذیب، سائنس اور ٹکنالوجی معراجِ کمال کو پہنچ چکے ہیں۔ انسان میں ہمہ خواہی، ہمہ گیری اور تنہا خوری کا اصول بدستور کارفرما ہے۔ ممکن ہے اپنی ہی زندگی کو زندگی اور ہر چیز کو جو خارج میں پائی جاتی ہے اپنے ہی لیے وقف سمجھنے سے نظامِ معیشت و معاشرت میں خلل واقع ہونے لگا ہوتو انسان یہ سوچنے اور ماننے پر مجبور ہوا کہ اپنی خیریت منظور ہے تو دوسروں کی خیریت کا بھی احترام کرے اور اسی انکشاف کا اعتراف اردو خطوط نویسی کے پرانے اسلوب میں کیا جاتا ہے ''یعنی میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت درگاہِ خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں!''

علم واخلاق کی ترقی کے ساتھ زندگی اور زندہ رہنے کا مقصد و محور بھی بدلا اور انسان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ زندگی زندہ رہنا ہی نہیں ہے بلکہ زندہ رہنے دینا بھی ہے —— اتنا ہی نہیں بلکہ کسی اعلیٰ مقصد کے لیے زندگی سے ہاتھ دھولینا زندگی کا سب سے بڑا شرف ہے۔ بہت دنوں تک مذہب ہی ہر ترقی کا سرچشمہ رہا ہے، لیکن آبادی بڑھی زندہ رہنے اور زندگی کو آسان و آرام دہ بنانے اور رکھنے کی ضرورت اور اُس کے ساتھ ساتھ حوصلے اور وسائل بڑھے تو دین کی جگہ دانش نے لینی شروع کردی۔ چنانچہ سائنس اور ٹکنالوجی نے زندگی کو نئے عزائم اور نئے ساز و سامان فراہم کیے۔ اب اس نے قوانینِ فطرت سے ڈرنے کے بجائے اُن کو قابو میں لانا شروع کیا یہاں تک کہ سائنس اور ٹکنالوجی نے انسان کی اس درجہ خدمت کی اور زندگی کی قوتوں، نعمتوں اور ضمناً ایسی نعمتوں سے بھی آشنا کرایا کہ آج ہم آپ ان علوم وفنون کے اتنے ہی محتاج نہیں جتنے گھر کے پُرانے نوکر یا اسی طرح کی نیک بخت کے!

زندگی کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور کہاں ہے؟ ان مسائل پر غور کرنے کی ضرورت اُس وقت پیش آئی جب انسان کو موت کے ناگزیر اور ناقابلِ تسخیر ہونے کا قائل ہونا پڑا۔ اگر زندگی کا سفر جلد یا بہ دیر موت پر ختم نہ ہوتا تو انسان اُن اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ افکار، اعمال اور عقائد پر کاربند نہ ہوتا جس کے نتائج ہر طرف طرح طرح کی شکلوں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

زندگی کے مسئلے پر غور کرنے میں یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ وہ چاہے جس طرح وجود میں آئی ہو اس کا کوئی مقصد بھی ہے یا نہیں، یقیناً ہے۔ اس لیے کہ جب دنیا کی حقیر سے حقیر شے بھی خواہ وہ دنیا میں کیسی اور کتنی ہو ہر چھوٹے بڑے مقصد کی تکمیل و تعمیل میں لازم آتی ہے اور اس میں معین ہوتی ہے تو زندگی کی اہلیت و عظمت سے کون انکار کرسکتا ہے جب کہ وہ ہر مذہب و ملت کے خدا کی سب سے زیادہ سمجھ میں آنے والی صفت اور ذات دونوں ہے! خدا کی ہیشگی زندگی میں، با مقصد و باعظمت زندگی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ زندگی کے بے شمار مظاہر و ممکنات میں خدا کی ذات وصفات کی تصدیق ملتی ہے۔

یہاں پہنچ کر ہم دین و دانش دونوں کی قلمرو میں بیک وقت داخل ہو جاتے ہیں یہ دونوں علاحدہ علاحدہ خانوں میں تقسیم نہیں ہیں۔ اس لیے کہ دونوں کا عرفان وانکشاف انسان نے عظیم مسائل و مقاصد کے پیش نظر کیا ہے اور دونوں نے انسان کی بہترین توقعات و مقاصد کی تکمیل وتصدیق کی ہے، اس وقت زندگی سے مراد انسان کی زندگی ہے اور انسان سے بہتر و برتر مخلوق کا اب تک ہم پتہ نہیں لگا سکے ہیں اس لیے زندگی کے حسن وخوبی اور صداقت کی تائید اور تصدیق انسان کی سب سے بیش قرار ذمہ داری اور اس کا سب سے بڑا مقصد قرار پاتا ہے۔ خوب کہا ہے ایک عزیز نے:

"اعتبار جہاں ہے انساں سے"

دنیا میں اسی انسانی زندگی کی تعبیر، تصدیق اور ترفع کے لیے مذاہب وجود میں آئے جنھوں نے اس زندگی کے سرچشمہ اور اس کے مقاصد نیز سفر اور منزل متعین کیے اور ان کی طرف رہنمائی کی ان میں مرکزی حیثیت انسانی اعمال کے خوب و زشت اور ان کی جواب دہی کو حاصل ہے۔ انسان اپنے کو جتنے صحیح سیاق وسباق میں سمجھنے کی کوشش کرے گا اتنا ہی زندگی اور اس کے مقاصد کی اہمیت و عظمت کو تسلیم کرے گا۔ دوسری بات ذہن میں رکھنے کی یہ ہے کہ انسان کو اپنے اعمال کی جواب دہی اپنی یا کسی دوسرے کی بنائی ہوئی عدالت میں نہیں کرنی ہے، جس کی تعمیل سے وہ انحراف بھی کرسکتا ہے، بلکہ اس کو ایک ایسی عدالت میں جواب دینا ہے جس کے فیصلے سے وہ روگردانی نہیں کرسکتا، اس لیے کہ اس کا فیصلہ غلطی سے یکسر پاک اور تمام تر انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ جس میں اکثر رعایت ورحمت بھی شامل ہوتی ہے جو کلی انصاف ہی کا ایک پہلو ہے۔

انسان کا اپنے احسنِ تقویم سے انکار اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا ذہن اور وجدان کسی خلقی یا نفسیاتی نقص کا شکار ہے۔ انسانی زندگی کی منزلت متعین کرنے میں موت کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ موت وحیات ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو معنی بخشتے ہیں بالخصوص انسانی زندگی کو جو فکر و عمل اور سزا و جزا کی زندگی ہے۔ موت کی اہمیت کا تصور اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض کر لیں کہ کوئی فرد موت کا شکار نہ ہوگا پھر اس کا اندازہ لگائیں کہ ہماری دنیا کا نقشہ کیا ہوگا۔ حق پر رہنے اور حق کے لیے مرنے ہی کی زندگی کو وہ سعادت حاصل ہے جس کی بنا پر انسان کے ہاتھ کو خدا کا ہاتھ کہا گیا ہے۔

دنیا کا ہر مذہب اپنے اپنے خدا پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے احکام کو نافذ کرتا ہے۔ یہاں ان مذاہب کے بتائے ہوئے عقائد و اعمال دنیا و عقبیٰ کے رشتے کو معرضِ بحث میں لانا مقصود نہیں۔ البتہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ انسان کو اپنے کیے کی سزا یا جزا ملے گی وہ سزا و جزا کیسی ہوگی اور کہاں ملے گی اس پر اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن اس کی نہ ایسی کوئی اہمیت ہے نہ یہاں اس پر بحث کرنے کی ضرورت کوئی کسی مذہب کی پیروی کرے یا سرے سے کسی مذہب کا قائل نہ ہو، یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ زندگی جبر ہو یا اختیار اس کے فرائض سے بہر حال عہدہ برآ ہونا پڑے گا۔ خواہ زندگی کی معمولی سہولتوں سے بھی بہرہ یاب ہونا نصیب نہ ہوتا ہو۔ زندگی کے مصاف میں عظیم افراد و اقوام کا یہی رول رہا ہے۔ فرائض کی حقیقت و عظمت ذہن نشین کرنے کے بعد سزا و جزا کا تصور کچھ زیادہ قابلِ توجہ نہیں رہ جاتا۔ ان ہی فرائض کے انجام دینے میں مضمر ہے اگر ہم مادّی نفع و ضرر کے قائل ہیں تو ہم کو ذہنی، اخلاقی اور روحانی سبھی طرح کے نفع و ضرر کا قائل ہونا پڑے گا۔

زندگی کے مسئلہ پر جس طرح سوچیے اچھی اور بامقصد زندگی بسر کرنے کے لیے دو باتیں ضروری ہیں اک عقیدہ دوسرا عمل، جسے مذہب کے صحیفہ میں خدا پر عقیدہ اور خلق کے ساتھ حسن سلوک اور ادب کی زبان میں حسنِ خیال اور حسنِ عمل بتایا گیا ہے۔ یعنی عبادت خدا کی اور خدمت خلق کی ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں رکھا جا سکتا۔ خدا اپنی عبادت صرف اپنی مخلوق کی خدمت کے فارن ایکس چینج میں قبول کرتا ہے۔ یہ ایکس چینج ہر چھوٹے بڑے کو ہر جگہ ہر وقت مل سکتا ہے، لیکن جن شرائط پر ملتا ہے وہ اتنے سخت اور ساتھ ہی اتنے آسان ہیں کہ ان کا پورا کرنا

ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ایسے اشخاص کثرت سے ملیں گے جو خدا کی عبادت خواہ کیسی اور کتنی ہی کیوں نہ ہو نہایت پابندی کے ساتھ گھڑی کی رفتار کے مطابق کرتے ہیں بلکہ اس میں اپنی طرف سے اضافہ بھی کر لیا کرتے ہیں، لیکن اُن کے حسنِ عمل کا خانہ دیکھیے تو اکثر مایوسی ہوگی اس لیے کہ جو حضرات خدا کی عبادت اس کی مخلوق کی خدمت سے بے نیاز ہو کر کرتے ہیں ان کی عبادت یک طرفہ ٹریفک کے اصول پر ہوتی ہے ان کا خیال ہے کہ مخلوق سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ سے براہِ راست معاملہ یا معاہدہ کر سکتے ہیں۔ حالاں کہ اس طرح کا معاہدہ یک فریقی ہو سکتا ہے نہ دو فریقی بلکہ ہمیشہ سہ فریقی ہوگا۔ یعنی فرد، خدا اور مخلوق، تینوں کے درمیان خدمتِ خلق سے بے پرواہ ہو کر نری عبادت اس کرنسی کی مانند ہے جو آخرت کے صرافے میں نہ صرف یہ کہ کوئی وقعت نہیں رکھتی بلکہ ناقص و نامعتبر ہونے کے سبب سے سزا کا بھی مستوجب بنا سکتی ہے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ خلق کا بہی خواہ خدا سے دور نہیں ہوگا چاہے وہ اپنے کو خدا کا منکر ہی کیوں نہ قرار دیتا ہو اور خدمتِ خلق سے بے گانہ کبھی خدا کے قریب نہیں ہو سکتا خواہ وہ عبادت کی بنا پر اپنے کو کتنا ہی خدا رسیدہ کیوں نہ سمجھتا ہو۔

جو لوگ خدا کو مانتے ہیں اُن کا ایمان ہے کہ زندگی کا سب سے بڑا مقصد اور سب سے بڑا انعام رضائے الٰہی ہے یعنی جب ہم نے خدا کی طرف سے اس کی نیابت اور زندگی کی امانت قبول کی ہے تو ان کی تقدیس و تکریم میں اپنی تمام اعلیٰ صلاحیتیں اور میسّر ذرائع و وسائل شکر و شادمانی سے صرف کریں خواہ اس میں کتنی ہی آزمائشوں سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔ جس کو کسی قدر زیادہ واقعیت پسندی کے انداز میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کا تقاضہ یہ ہو کہ ہم کسی حال میں ہوں زندہ رہنے کا حق ادا کرتے رہیں اور جب زندگی کو خیرباد کہنے کا وقت آئے تو ہمارے ساتھی نہ کہیں اور ہمارا ضمیر اس کی تصدیق کرے کہ اپنی بساط کے مطابق ہم نے اپنے حسنِ خدمت سے دنیا کو اُس سے بہتر حال میں چھوڑا جس میں پایا تھا!

(مطبوعہ: قومی آواز، لکھنؤ۔ 30/اپریل 1967ء، دعوت، دہلی۔ 30/اپریل 1967ء)

●●●

غالب کی خوش بیانی

یہ تقریر 15 فروری 1969 کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر ہوئی۔

نرسنگھا پھونکا گیا۔ قیامت آگئی۔ خدا کے حضور میں انسانی اعمال نامے پیش ہونے لگے اور فیصلہ دیا جانے لگا۔ جنت اور جہنم کے راستے پر نیکوکاروں اور گنہ گاروں کا ایسا ریلا ہوا کہ فرشتوں کی ٹریفک پولیس کے دم اور قدم اُکھڑنے لگے۔ سب سے زیادہ بھیڑ اور بدنظمی دوزخ کی شاہ راہ پر پائی گئی جہاں ایک قلندر کے پیچھے اور اُس کی آواز پر دوزخ ہی نہیں جنت کے راستے کے راہ رو بھی اپنی منزل اور اپنے انجام سے بے خبر و بے پروا جھومتے اور رقص کر رہے تھے۔ قلندر کو گرفتار کر کے مالک الیوم کے سامنے پیش کیا گیا الزام یہ لگایا گیا تھا کہ یہ شخص قیامت کے دن دوزخ اور جنت کے راستوں پر آوارہ پھرتا تھا اور اردو کے شعر پڑھتا تھا۔

خداوند نے پوچھا۔

''کہاں جا رہا تھا؟''

جواب دیا۔

''جا کہیں نہیں رہا تھا دنیا ڈھونڈ رہا تھا۔''

خداوند نے فرمایا۔

"دنیا تو ختم کر دی گئی۔"

قلندر نے جواب دیا۔

"مجھے تو دنیا میں رہ کر یقین ہو گیا تھا کہ کوئی خدا بغیر دنیا اور انسان کے رہ نہیں سکتا اور کوئی دنیا بغیر خدا اور انسان کے ممکن نہیں۔ یہ جو قیامت برپا ہے یہ دنیا کا خاتمہ نہیں ہے اُس کا خاصہ ہے۔ دنیا قیامت سے بڑی حقیقت ہے۔"

خداوند نے کہا۔

"تیری جگہ دنیا نہیں دوزخ ہے، وہیں چلا جا۔"

قلندر نے دست بستہ ہو کر عرض کیا۔

"اب تک کہاں رہا تھا جو آج دوزخ کی تخصیص کی جا رہی ہے۔"

میدانِ حشر سے ایک نعرہ بلند ہوا۔

"غالب زندہ باد!"

ازل میں ابلیس کے انکار اور آخرت میں غالب کے سینس آف ہیومر (Sense of humour) کو خداوند نے کیا اہمیت دی اس کا حال تو پھر کسی دنیا ہی میں معلوم ہوگا، لیکن خدا کے لب پر بالکل تبسم نہ آیا جس کے دیکھنے کا اتفاق اقبال کو ہوا تھا۔ البتہ یہ فرمان صادر ہوا کہ غالب کو نہ جنت میں جگہ دی جائے نہ دوزخ میں اس نے ان دونوں کے بارے میں وقتاً فوقتاً ایسے خیالات ظاہر کیے ہیں جن سے وہاں کے ڈسپلن میں فرق پڑ سکتا ہے۔ اسے عرشِ معلّٰی کے نواح میں ایک قصر دیا جائے اور اُس وقت کا انتظار کیا جائے، جب اس کو ایسی دنیا میں بھیجا جائے گا جس کے لیے ابھی کوئی مناسب جنت اور جہنم نہیں وضع کیے گئے ہیں اور جب تک آخرت کے کسی خاص علاقہ کی زبان اردو نہ تسلیم کی جائے اس کو اردو شعر پڑھنے کی اجازت ہے۔

یہ غالب کی شوخیِ بیان، سلیقۂ گفتار، ندرتِ ادا، شگفتہ شوخی یا شوخ شگفتگی اور کبھی کبھی معیاری طنز کے نوک ونشتر کا کرشمہ تھا جس میں اب تک ان کا ثانی اردو لکھنے والوں میں نہیں پیدا ہوا۔ غالب اپنے ذوق اور ذہن کی ساخت و پرداخت کے اعتبار سے عجمی تھے اور اس پر فخر کرتے تھے ان کے جو صفات اوپر بیان کیے گئے ہیں وہ جتنے عجم کے حسنِ طبیعت میں ملیں گے عرب کے

سوز دروں، ہند کے گیان اور دھیان اور مغرب کی سائنس اور ٹکنالوجی میں نہ ملیں گے اُن کے کلام میں وہ تمام خوبیاں جمع ہوگئی تھیں جو ہندوستان اور ایران کی تہذیبوں کی ممتاز خصوصیات تھیں۔ اُس کے ساتھ یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اردو کی پیدائش گلی کوچوں میں ہوئی تھی، لیکن اُس کی تہذیب و تزئین درباروں اور محل سراؤں اور مشاعروں میں ہوئی۔ ان وجوہ سے اس میں ہر بات سلیقہ سے کہنے کا حسن آ گیا ہے اور مشاعروں نے اردو کے اس انداز سے عوام کو آشنا کر دیا۔ جس زبان میں ہر طرح کی عاشقی اور ہر طرح کی شاعری زیادہ سے زیادہ اور مدتوں کی گئی ہو اُس کے اندازِ گفتار کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے خصوصاً جب کہ شعر و ادب میں شوخیِ بیان اور ندرتِ ادا کا ایسا فن کار گزرا ہو جیسے کہ غالب ہیں۔

انسان اس دنیا میں خدا کا بندہ بھی ہے اور اُس کا نائب بھی، اور شاعر انسان کا سب سے اچھا اور بڑا ترجمان۔ اس طور پر اندازہ کر سکتے ہیں کہ شاعر کی ذمہ داری کتنی بڑی ہے۔ میں شاعر کے ذوق اور فطرت کا اندازہ اس سے بھی کرتا ہوں کہ وہ خدا اور عورت کے بارے میں کس طرح معرضِ گفتار میں آتا ہے۔ غالب کے سب سے معتبر شاگرد اور اردو شعر و ادب کے بہت بڑے پارکھ حالی نے بتایا ہے کہ غالب ''حیوانِ ظریف'' تھے۔ یعنی بڑی شوخ اور شگفتہ طبیعت پائی تھی۔ غالب کی شوخیِ بیاں کے سب سے زیادہ نمونے اُن کے خطوط میں ملتے ہیں۔ سہل، سادے اور سب کو خوش کرنے والے۔ اس کے بعد اُس کے نمونے اُن کے اردو کلام میں ملیں گے جہاں موضوع، تخاطب اور اندازِ گفتگو بدلا ہوا ہے اور بلند بھی ہے۔ ہم میں زیادہ سے زیادہ لوگ غالب کے اردو کلام سے لطف اندوز ہو چکے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ آج چاہتا ہوں کہ شوخیِ بیاں کے ان نمونوں کو پیش کروں جو اُن کے فارسی کلام میں ملتے ہیں جس کی طرف ہماری توجہ کم مائل ہوئی ہے حالاں کہ غالب اپنے فارسی کلام کو اپنی شاعری کا بہت بڑا سرمایۂ افتخار و امتیاز سمجھتے ہیں۔

آیئے اب غالب کی شوخیِ بیاں سے تھوڑی دیر خوش ہو لیں اور فائدہ اُٹھائیں ایک جگہ کہتے ہیں:

نغزی و خود پسندی بنیم چہ ی کنی
یارب بہ دہر ہم چو توئے آفریدہ باد!

یعنی اے خدا تو یگانہ ہے، خود پسند ہے کاش اس دنیا میں تیرا ہی جیسا ایک اور پیدا ہو جائے۔ پھر میں دیکھتا تو کیا کرتا ہے۔

ایک اور موقع پہ کہتے ہیں:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے!

خدا سے شکایت کرتے ہیں:

یارب بہ زاہداں چہ دہی خلد رائیگاں

جورِ بتاں ندیدہ و دل خوں نہ کردہ کس

یعنی اے خدا بہشت زاہدوں کو کیوں دیتا ہے یا اس کو زاہدوں پر کیوں رائیگاں کرتا ہے جن کو کبھی بتوں کے جور نہیں اُٹھانے پڑے نہ اس میں کبھی اُن کا دل خون ہوا۔ ایک رباعی کہی ہے:

آن مرد کہ زن گرفت دانا نہ بود

از غصہ فراغتش ہمانا نہ بود !!

دارد بجہاں خانہ وزن نیست درد

نازم بہ خدا چرا توانا نہ بود !!!!

یعنی جو شخص گھر میں عورت لایا وہ عقل مند نہیں اور اُسے غم و غصہ سے چارہ نہیں، میں خدا پر ناز کرتا ہوں کہ اس نے دنیا میں اپنا گھر تو بنایا، لیکن اُس میں عورت نہ رکھنے پر قادر رہا۔

فرماتے ہیں:

مرا کہ بادہ نہ دارم ز روزگار چہ حظ

ترا کہ ہست و نیا شامی از بہار چہ حظ!

یعنی میں تو شراب سے محروم ہوں، مجھے دنیا کا کیا لطف۔ تم کو تو شراب میسّر ہے، لیکن پیتے نہیں، تم کو بہار کا کیا لطف آئے گا۔

بے محل نہ ہوگا، اگر اس وقت آپ عمر خیام کا بھی اس موضوع پر ایک شعر سن لیں اور ندرت بیان کا لطف اُٹھائیں۔ شراب بیچنے والے کی دُکان دیکھ کر کہتے ہیں:

من جرتم زے فروشاں کایشاں
بہ زآں کہ فروشند چہ خواہند خرید!

ان ےفروشوں کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی ہے جو چیز وہ فروخت کرر ہے ہیں اس سے بہتر کون سی چیز ہے جسے وہ خریدیں گے۔

ایک جگہ غالب کس شوخی وخوب صورتی سے نماز، روزہ، حج اورزکوۃ کی پابندی سے اپنے کو بچانا چاہتے ہیں۔ یہ تو ہم سب کو معلوم ہے غالب تمام عمر تنگ دست رہے اور حج اورزکوۃ اُن ہی لوگوں پر فرض ہے جن کے پاس کچھ دولت ہو۔ کہتے ہیں:

اے کاش زحق اشارتِ صوم وصلوٰۃ
بودے بوجودِ مال چوں حج وزکوٰۃ

یعنی جس طرح حج اورزکوۃ کے لیے دولت کی شرط ہے، کاش نماز اورروزے کے لیے بھی ہوتی تا کہ یہ فریضہ بھی بجالانے سے سبک دوش رہتا! یہ انداز بیاں دیکھئے:

مے خواہی ومنّت دنغز وانگہ بسیار
ایں بادہ فروش، ساقیِ کوثر نیست

قیامت کے دن جب سب کے اعمال کا حساب کتاب ہوجائے گا اُس وقت نیک بندوں کو ساقیِ کوثر، چشمۂ کوثر سے پاک شراب پلائیں گے۔ زاہد کو مخاطب کر کے غالب کہتے ہیں: "چاہتے ہو کہ شراب ملے وہ بھی مفت ہو، عمدہ ہو اور بہت سی ہو، یاد رکھو یہاں کا بادہ فروش ساقیِ کوثر کی مانند نہیں ہے! کہتے ہیں شداد نے آسمانی جنت کی مانند دنیا میں ایک جنت بنائی تھی۔ اس میں داخل ہونے سے پہلے اُس کی روح قبض کرلی گئی۔ وہ جنت آسمان پر اُٹھالی گئی اور اس کا نام اِرم رکھ دیا گیا۔ ہم آپ اس سے بھی واقف ہیں کہ متوفی کی ملکیت اُس کی اولاد کو منتقل ہوتی ہے اور کوئی زبردستی لے لے تو عدالت دلوادیتی ہے۔ غالب کہتے ہیں:

زاہد ز خدا اِرم بدعویٰ طلبد
شدّاد ہمانا پسرے داشتہ است

یعنی زاہد دعویٰ کے طور پر خدا سے اِرم طلب کرتا ہے۔ گویا شدّاد کا کوئی فرزند بھی تھا۔

اسی طرح کی بات ایک جگہ اور کہی ہے۔ اس میں شوخیِ بیان کا انداز اور ہے۔ شعر یہ ہے:

خواجہ فردوس میراث تمنا دارد
وائے گر در روشِ نسل بہ آدم نہ رسد

یعنی خواجہ چاہتا ہے کہ اولادِ آدم ہونے کی بنا پر بہشت اُسے میراث کے طور پر ملے۔ اے وائے اگر نسل کے اعتبار سے وہ آدم تک نہ پہنچ سکا! کہتے ہیں:

زنہار از تعب دوزخ جاوید مترس
خوش بہاریست کز دیم خزاں برخیزد

مطلب یہ کہ ہمیشہ رہنے والی دوزخ کے تکالیف سے مت ڈرو (دیکھو تو) کیسی بہار کی جگہ ہے جہاں خزاں کا اندیشہ نہیں۔ ایک شعر ہے:

بہ کم خیارہ جوئی پیش غالب
شکایت سنج چرخ و اختر ش بین

عام طور پر مشہور ہے کہ ہم پر ظلم و ستم آسمان اور ستارے ڈھاتے رہتے ہیں۔ ذرا یہ ستم ظریفی دیکھیے کہ آسمان و ستارے اپنی اپنی فریاد سنانے غالب کے پاس آتے ہیں! ایک شعر ہے:

بادہ بوام خوردہ و زر قمار باختہ!
وہ کہ ز ہر چہ ناسزاست ہم بسزا نہ کردہ ام

مطلب یہ کہ میں نے شراب اُدھار پی اور پیسے قمار بازی میں اُڑا دیے (اے وائے) نامناسب کو بھی مناسب طریقے سے انجام نہ دے سکا۔

ایک موقع پر کہا ہے:

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند
جز روزۂ درست بہ صہبا کشودۂ

(نشریہ: 15/فروری 1969، مشمولہ: غالب نکتہ داں، مرتبہ مہر الٰہی ندیم/لطف الرحمٰن خاں، مکتبہ دانیال، کراچی)

●●●

₹ 118/-

ISBN : 978-81-7587-775-7
राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language
Farogh-e-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110025